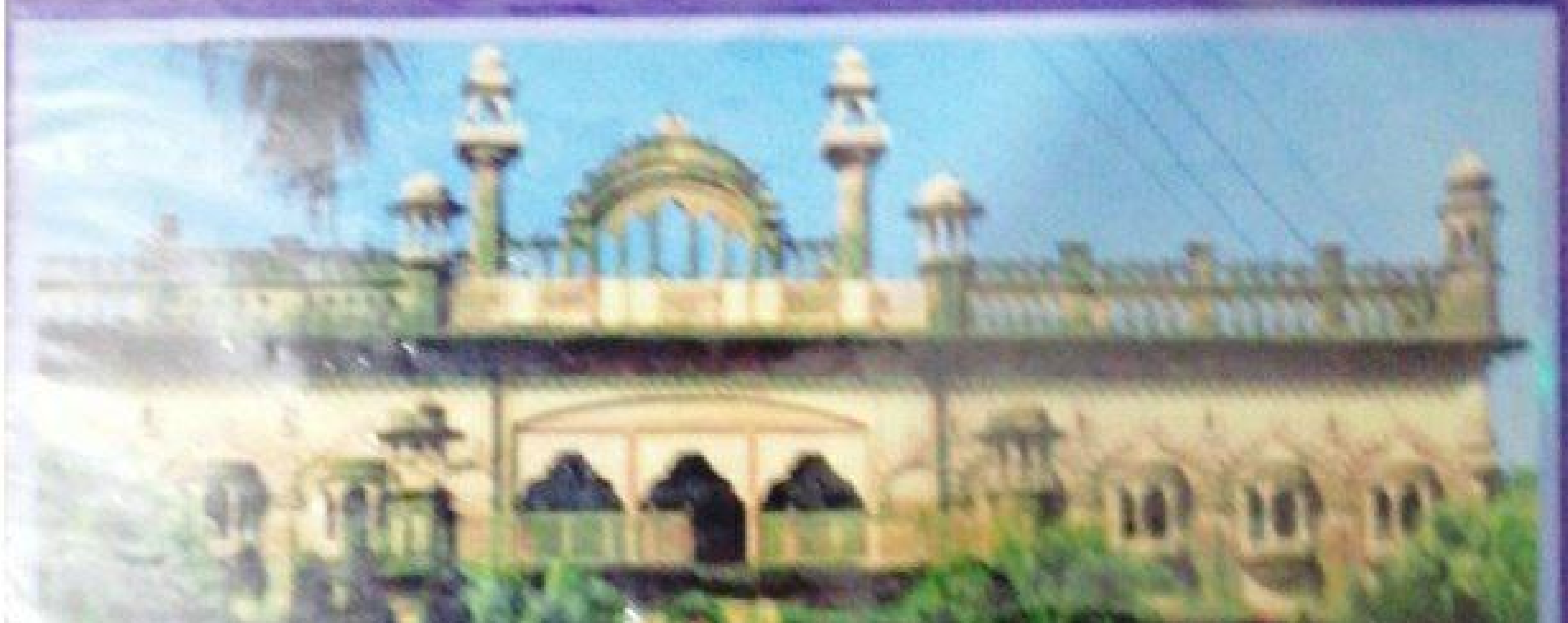
مشاہیرِ میرٹھ



نور احمد میرٹھی

مشاہیرِ میرٹھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشاہیر میرٹھ



نور احمد میرٹھی

ادارہ فکرِ نو

۳۵/بی، ۸/۱۱،۷، کورنگی، کراچی ۷۴۹۰۰

بھارت میں اشاعتی حقوق ڈاکٹر سید نثار احمد دہلی کو حاصل ہیں

نام کتاب	:	مشاہیرِ میرٹھ
صاحب کتاب	:	نور احمد میرٹھی
سرِورق	:	عبیدالرحمٰن عبید
کمپوزنگ	:	العائشہ کمپوزنگ سینٹر، نوشین سینٹر اردو بازار کراچی
پیسٹنگ	:	اقبال پیام
پریس	:	مقصود پرنٹنگ پریس، کراچی
سن اشاعت	:	۲۰۰۳ء
تعداد	:	۵۰۰
زیر اہتمام	:	ادارۂ فکرِ نو، کراچی
تعاون	:	تنظیم احباب میرٹھ، کراچی
قیمت	:	۳۰۰ روپے

رابطہ

ادارۂ فکرِ نو

۳۵ بی، ۸/۱۱،۷ کورنگی، کراچی ۷۴۹۰۰

اسلامی جمہوریہ پاکستان

فون: ۵۰۶۲۸۹۸

IDARA-E-FIKR-E-NOU

35-B, 11/78, KORANGI, KARACHI-74900

PAKISTAN PHONE : 5062898

انتساب

بابائے اردو
مولوی عبدالحق

زیڈ۔اے۔نظامی

نواب محمد اسمٰعیل خاں

ڈاکٹر جمیل جالبی

مولانا
شاہ احمد نورانی

مولانا بدر عالم

اور
مشاہیر میرٹھ کے نام

نور احمد میرٹھی

حسن ترتیب

تقریظ

ڈاکٹر جمیل جالبی
سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی
سابق صدر نشیں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

جن لوگوں نے علم و ادب کو مقصدِ حیات بنا کر، مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی نظم: "پن چکّی" کی طرح دُھن اور لگن سے کام کیا ہے، اُن میں نور احمد میرٹھی کا نام نمایاں و ممتاز ہے۔ اُن کی اب تک چھوٹی بڑی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں "بہر زماں، بہر زباں" نے زیادہ شہرت پائی۔ گزشتہ سترہ اٹھارہ برس سے وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں کہ میرٹھ کے لوگوں نے علم و ادب اور زندگی کے مختلف شعبوں میں قومی، علمی، ادبی و تخلیقی سطح پر، جو خدمات انجام دی ہیں، اُنھیں بصورت تذکرہ یکجا و مرتب کر کے دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ ویسے تو یہ ایک ضلع، ایک شہر کا تذکرہ ہے لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں اُن شخصیات و مشاہیر کے نام آتے ہیں جو قومی سطح پر اہمیت رکھتے ہیں اور جن کے بغیر ہماری قومی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان سب شخصیات کو سمیٹ کر تذکرے کی صورت میں مرتب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان کاموں کے لیے ادارے بنائے جاتے ہیں جہاں بہت سے لوگ مل کر کام کرتے ہیں اور پھر کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ نور احمد میرٹھی نے یہ کام تن تنہا کر کے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے، جس پر نہ صرف نور احمد میرٹھی بلکہ ہم سب بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس کام کا پھیلاؤ دیکھ کر ہی منہ سے واہ واہ کی صدا بلند ہونے لگتی ہے۔ پھر مختلف مآخذ سے مواد جمع کر کے جس طرح سمیٹا ہے وہ اپنی جگہ قابلِ تحسین ہے۔ نور احمد میرٹھی کے اس کارنامے کو دیکھ کر فرہاد یاد آتا ہے، جس نے جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر جُوئے شیر لانے کا کام کیا تھا۔ اس کام میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اُن کا اندازہ صرف اہلِ دل ہی لگا سکتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے

کہ ان کی اپنی بھاگ دوڑ اور کوششوں سے یہ کام اب تین ضخیم جلدوں میں ایک ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

پہلی جلد "شعرائے میرٹھ" پر مشتمل ہے جس میں ۶۰۲ شعرا اپنے مستند کوائف، حالات وتصانیف کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ ان میں متعدد شعرا ایسے ہیں جو ہمارے ادب کی تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں اور جن میں مصطفیٰ خاں شیفتہ، قلق میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، عشق وجتلا میرٹھی، مرزا رحیم بیگ، شوکت میرٹھی، بیاں میرٹھی، کے ساتھ بیسویں صدی کے شعرا احسان دانش، روش صدیقی، سلیم احمد، اقبال عظیم، مظفر وارثی، فہمیدہ ریاض، حفیظ میرٹھی، حزیں میرٹھی، ساغر نظامی، ندرت میرٹھی، اکبر وارثی (استاد حفیظ جالندھری)، مظفر احمد ضیاء، احمد ہمدانی، نخشب جارچوی، ناطق گلاؤٹھی، عالمتاب تشنہ وغیرہ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

دوسری جلد "مشاہیر میرٹھ" پر مشتمل ہے جس میں اُن ۵۹ مشاہیر کو شامل کیا گیا ہے جو شاعر تو نہیں ہیں لیکن جنھوں نے علم ادب کی دنیا اور مذہب وسماجیات کے شعبوں میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ وہ مشاہیر ہیں جن کے نام آج تک زندہ ہیں اور آنے والے زمانے میں بھی زندہ رہیں گے۔ ان مشاہیر میں مولوی چراغ علی، وقار الملک مولوی مشتاق حسین، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، شاہ عبدالعلیم صدیقی، سر سیتارام، نواب اسمٰعیل خان، نواب محمد اسحاق خاں، نواب سر محمد یامین خاں، مسرت حسین زبیری، مولانا بدر عالم مہاجر مدنی، مولوی بشیر الدین وغیرہ کے علاوہ اختر حمید خان، پروفیسر کرار حسین، محمد حسن عسکری، انتظار حسین، شوکت سبزواری، مولانا عاشق الٰہی، خلیل الرحمٰن داؤدی، شہید محمد صلاح الدین، خلیق احمد نظامی، آغا ناصر، زیڈ۔ اے۔ نظامی، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری، اصلاح الدین (ہاکی) اور شیخ العالم حضرت مولانا عبدالعلی وغیرہ کے نام نامی شامل ہیں، جن کے شاگردوں میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی نے بڑا نام پایا۔ یہ وہ مشاہیر ہیں جو قومی سطح کی شخصیتیں ہیں اور جنھوں نے اپنی خدمات سے ملک وقوم کو رنگ ونور دیا ہے۔

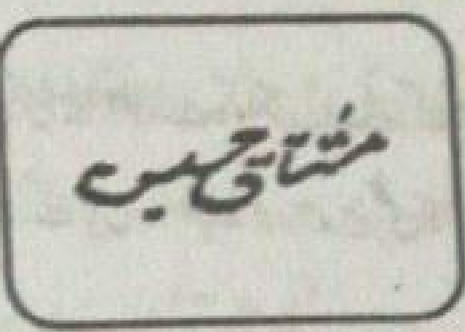
"تذکرہ شعرائے میرٹھ" کی طرح "مشاہیرِ میرٹھ" میں بھی جو معلومات وکوائف دیے گئے ہیں، وہ مستند ماخذوں سے حاصل کر کے سلیقے سے مرتب کیے گئے ہیں۔ احتیاط نور احمد میرٹھی کا مزاج ہے جو ان کی کتابوں کی ہر سطر سے نمایاں ہے۔

تیسری جلد "شخصیاتِ میرٹھ" ہے جس میں اُن ۱۳۰ شخصیات کا ذکر شامل ہے، جنھوں نے شعرو شاعری اور علم وادب کے علاوہ زندگی و سماج کے دوسرے شعبوں میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں بھی ایسی متعدد شخصیات ہیں جو قومی و ملی سطح پر برصغیر پاک ہند کی تاریخ کا حصہ ہیں اور جن میں مفتی کفایت اللہ، قاضی زین العابدین، نواب جمشید احمد خاں، بھیا احسان الحق، خواجہ غلام الثقلین، حکیم احمد شجاع، مولانا نذیر احمد خجندی (جنھوں نے قائداعظم کا نکاح پڑھایا تھا) کے نام شامل ہیں۔

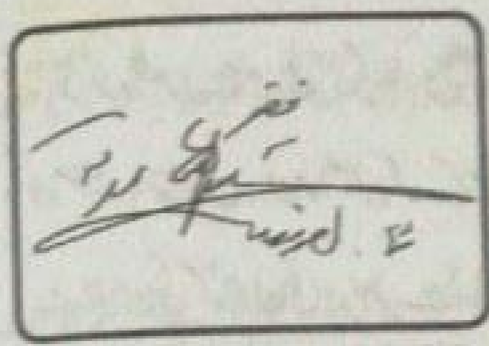
ان تذکروں میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں کسی ایک تذکرے میں مشکل سے ملیں گی۔ نور احمد میرٹھی نے مختلف ماخذوں سے ایک ایک ریزہ جمع کر کے، اپنے حسنِ بیان سے اسے روشن تر کیا ہے۔ ان تینوں کتابوں میں کسی پھوہڑپن یا عجلت پسندی کا اظہار نہیں ہوتا۔ سلیقہ ان کے کام کی پہچان ہے۔ انداز بیان سادہ اور صاف ہے۔

یہ تینوں کتابیں فنِ تذکرہ نویسی کے اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان تینوں تذکروں کی اشاعت کے بعد اب خود نور احمد میرٹھی مشاہیر کی صف میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔

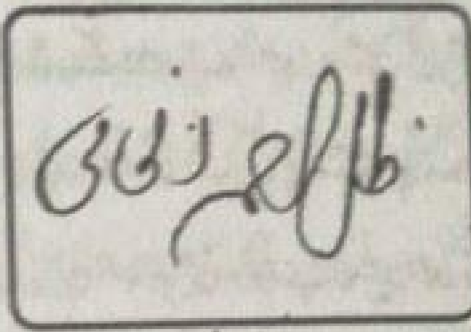
"بُہر زماں بُہر زباں" کو ملا کر ان کا یہ کام ــــــ تذکرہ شعرائے میرٹھ، مشاہیرِ میرٹھ اور شخصیاتِ میرٹھ ــــــ اتنا اہم ہو جاتا ہے کہ کسی بھی یونیورسٹی کو انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دینی چاہیے۔ بظاہر یہ کام میرٹھ سے متعلق ہے لیکن اس میں برصغیر پاک وہند کی تاریخ شامل ہے، جس سے میرٹھ کے نام کو کسی طرح بھی خارج نہیں کیا جا سکتا۔



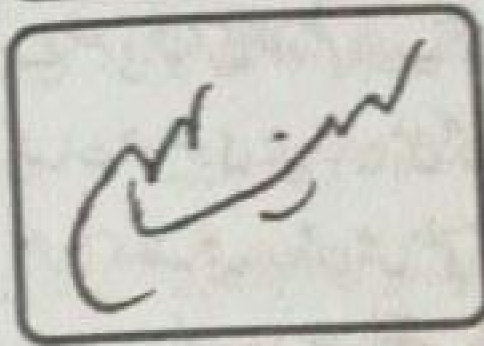
نواب وقار الملک



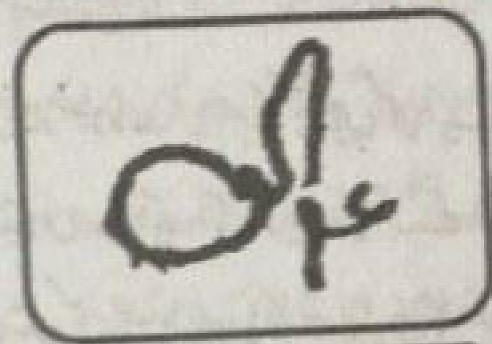
مولانا شاہ احمد نورانی



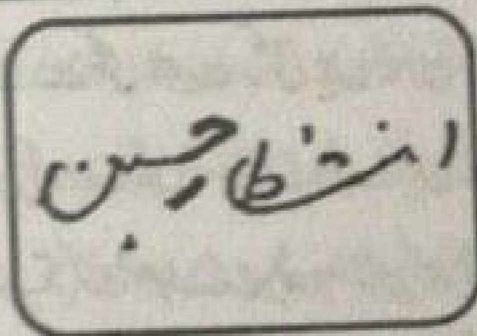
زیڈ۔ اے۔ نظامی



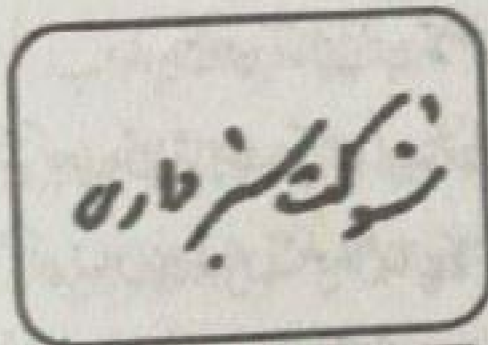
حکیم سیف الدین احمد



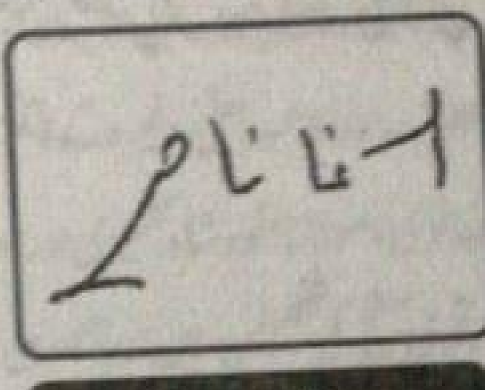
بابائے اردو مولوی عبدالحق



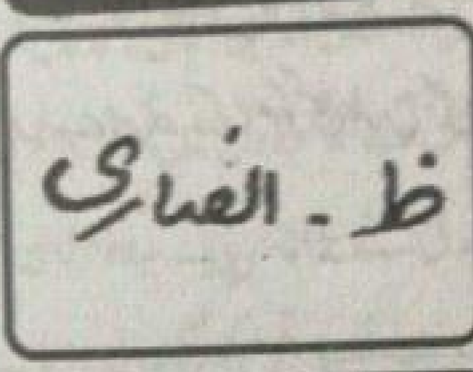
انتظار حسین



ڈاکٹر شوکت سبزواری



آغا ناصر



ظ۔ انصاری

احوالِ واقعی

نور احمد میرٹھی

میرٹھ جنوب مشرقی ایشیاء کے اہم قدیم شہروں میں سے ایک ہے۔ اپنی زرخیزی، آب و ہوا، جغرافیائی حیثیت خصوصاً دہلی کے قریب ترین علاقے کی وجہ سے یہ شہر ہر دور میں مرکزِ نگاہ رہا ہے۔ اس شہر کی مٹی سے علم و ادب اور فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات ہی نہیں ابھریں بلکہ یہاں فکر و دانش نے بھی فروغ پایا۔ کسی بھی شعبہ ہائے حیات پر نظر ڈالیں، یہاں کے ذی فہم افراد کی بڑی تعداد اپنی طرف متوجہ کرتی نظر آتی ہے۔ تاریخ کے اوراق ان کے علم و فضل اور فکر و دانش کے امین ہیں۔

تذکرہ شعرائے میرٹھ میں شامل مضمون "میرٹھ۔۔۔ تاریخ و خدمات" کے مطالعے سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ میرٹھ نے مختلف ادوار میں تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں باشندگانِ میرٹھ نمایاں نہ دکھائی دیتے ہوں عہدِ مغلیہ پر نظر ڈالیں یا انگریزی دورِ حکومت کا جائزہ لیں تحریکِ آزادی ہند کا مطالعہ کریں یا تحریکِ پاکستان کی زینہ بزینہ کامیابیوں کے سفر پر سوچیں ـــــ آپ کو میرٹھ کے شہری صفِ اوّل میں نظر آئیں گے۔ "شخصیاتِ میرٹھ" میں شامل "عظمتوں کا سفر" دیکھئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عصری تقاضوں کا ادراک میرٹھ کے شہریوں کا خاصہ رہا ہے۔ انہوں نے اپنے فکر و عمل سے متحدہ ہندوستان اور تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کے استحکام، ترقی اور خوشحالی کے منصوبوں میں حصّہ لے کر تابناکی میں اضافہ کر کے اپنے شہر کے نام کو اعتبار بخشا ہے۔

ادب میرٹھ کا ایک معتبر حوالہ رہا ہے۔ میرٹھ کے ادیبوں اور دانشوروں کی محتاط اندازے کے مطابق اُردو میں مختلف علمی و قومی موضوعات اور زبان و ادب پر دو ہزار سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں غزلیات اور منظومات کے مجموعے شامل نہیں ہیں، جن کی تعداد بھی ایک ہزار سے زیادہ ہی ہوگی۔ فارسی، انگریزی، سنسکرت اور ہندی میں شائع ہونے والی کثیر کتب ان کے علاوہ ہیں۔

سیاست میں بھی اس خطہ ارض کی خدمات سے صرفِ نظر ممکن نہیں ہے۔ ہر

اہم تحریک میں میرٹھ کے شہریوں نے پرجوش حصہ لیا ہے۔ نظریہ سازی، شہری نظم ونسق اور منصوبہ بندی میں میرٹھ کے صاحبانِ کمال کے کلیدی کردار سے آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں۔ فنونِ لطیفہ پر نظر ڈالیے تو کئی شخصیات میرٹھ کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ اسی طرح صحافت میں حق گوئی و بیباکی سے قلم حق ادا کرنے والوں میں کئی قابل احترام نام ہمارے سامنے آتے ہیں جو کبھی مصلحت، حرص وطمع یا خوف کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی قید وبند کی صعوبتیں ان کی راہ میں دیوار بن سکیں۔ مجموعی تفصیلی جائزے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرزندانِ میرٹھ نے نہ صرف اپنی اقدار اور تہذیب وتمدن کو عزیز رکھا ہے بلکہ زندگی کی گوناگوں ضرورتوں کو احسن طریقے سے پورا کیا ہے۔

میرٹھ کی قد آور شخصیات مشاہیر میرٹھ اور شخصیات میرٹھ کی زینت ہیں۔ متعدد بزرگوں کو شاعری کی حیثیت سے بھی شہرت ملی۔ وہ تذکرہ شعرائے میرٹھ میں موجود ہیں۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ اب بھی کئی شخصیات پر خاطر خواہ مواد حاصل نہ کر سکا، جسکی وجہ سے یہ کتب ان کے تذکرے سے محروم رہیں ان کتب میں بعض وہ صاحبانِ دانش بھی ہیں جن کا وطن تو میرٹھ نہیں ہے لیکن ان کی ولادت اور تعلیم وتربیت میرٹھ میں ہوئی یا جو ملازمت یا کاروبار کی وجہ سے میرٹھ میں ایک قابلِ ذکر عرصہ تک رہے۔ ان میں سے کئی حضرات نے میرٹھ کو وطن ثانی بنا لیا تھا ان صاحبانِ علم وہنر کا ذکر بھی آپ پڑھیں گے جن کا وطن میرٹھ ہے لیکن بوجوہ دوسرے علاقوں یا ممالک میں مقیم ہیں۔

میری ان کاوشوں میں بزرگوں نے خاطر خواہ مدد فرمائی ہے۔ ان کی رہنمائی اور معاونت میرا سرمایہ ہے۔ میں محترم مشفق خواجہ کا بیحد ممنون ہوں جن کی شفقت مجھے حاصل ہے، موصوف نے اپنی قیمتی لائبریری سے استفادے کا بھرپور موقع عنایت فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ علمی تادیر قائم رکھے۔ آمین۔ محترم ڈاکٹر جمیل جالبی، محترم زیڈ۔ اے۔ انعامی، محترم مظہر یوسف، محترم افضال منیف، محترم قاضی محمد اویس، محترم اشرف علی زبیری اور محترمہ صابرہ نابجانی کے تعاون کو میں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ ان محسنوں کے علاوہ جن بزرگوں اور دوستوں نے حق رفاقت ادا کر کے مجھے اپنی محبتوں کا اسیر بنایا ہے، ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو آفات ارضی وسماوی سے محفوظ رکھے اور ہم سب کا حافظ وناصر ہو۔

"گلِ رُخ سالِ طباعت"

۱۴۲۳ھ

"خصائصِ مشاہیرِ میرٹھ"

۲۰۰۲ء

"سوانح نگار سعادت مآب جناب نور احمد میرٹھی"

۲۰۰۲ء

یہ برسوں کی اک کاوشِ نور احمد
تدبر نشاں ہے مشاہیرِ میرٹھ
کہو اس کا سالِ طباعت یہ صابر
"سرِ داستاں ہے مشاہیرِ میرٹھ"

۲۰۰۲ء

کیا نور احمد نے انتھک سَعی سے
نمایاں وجودِ مشاہیرِ میرٹھ
اسی ایک تصنیف سے اب تو صابر
"ہے نام و نمودِ مشاہیرِ میرٹھ"

۱۴۲۳ھ

صابر براری

مشاہیر میرٹھ



ادارۂ فکرِ نو، کراچی کی علم دوست سرپرست
محترمہ صابرہ تانجیانی



آغا ناصر

آغا ناصر

معروف ڈرامہ نویس محترم آغا ناصر کی عصری آگہی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ آپ کے ڈراموں میں معاشرے، ماحول اور تہذیب و تمدن کی عکاسی اس طور سے ہوئی ہے کہ سامع یا ناظر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس فنی دسترس کے پس منظر میں آپ کا یہ نظریہ ہے کہ "ڈرامہ زندگی کا آئینہ بھی ہے اور نشتر بھی۔ اپنے اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے یہ وہ فن ہے جو زندگی کے منظرنامے میں کرداروں کے توسط سے مخاطبین پر اپنے جوہر آشکارا کرتا ہے۔۔ حقائق کا آئینہ دکھاتا ہے اور تنقید کے نشتر چلاتا ہے اور اس کا مقصد ہے حیاتِ انسانی کی بہتری اور رہنمائی" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آغا ناصر صاحب نے ڈرامے کی روح کو لفظوں کا پیکر عطا کیا ہے۔

جناب آغا ناصر کی ولادت میرٹھ میں ۹ فروری ۱۹۳۷ء کو ہوئی۔ میٹرک سے ایم۔ اے تک کی ساری ڈگریوں میں یہی نام درج ہے۔ یہ آپ کا خود پسند کیا ہوا نام ہے جو ڈرامہ سے لگاؤ کی بناء پر آغا حشر کے نام سے متاثر ہو کر رکھا تھا۔ آپ بتاتے ہیں کہ اس کا اصل محرک ایک ہندو ڈاکیہ تھا جو آپ کا دوست بن گیا تھا۔ آپ کے والد علی احمد خاں ضلع میرٹھ کے ایک قصبے فرید نگر میں واقع سینٹرل ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے سربراہ تھے۔ آپ پانچ بھائی اور ایک بہن ہیں۔ آزادی سے قبل تین بڑے بھائیوں اور بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ مشہور شعراء شمیم جاوید اور جوہر غوری آپ کے بھائی ہیں اور دونوں انتقال کر چکے ہیں۔

آغا صاحب کا خاندان تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آیا اس وقت آپ کی عمر دس سال تھی۔ یہ خاندان کراچی میں قیام پذیر ہوا۔ لاہور میں پہلے ہی سے بہت سے رشتہ دار رہتے تھے اس لئے لاہور آمدورفت رہی۔ آغا صاحب بتاتے ہیں کہ "وہیں اوائل عمر میں اپنے رشتہ کے ماموں کی صاحبزادی صفیہ سے قربت اور دوستی کا آغاز ہوا جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد ازدواجی زندگی میں شریک حیات بن گئیں"۔

محترم آغا ناصر نے میٹرک لاہور، بی۔ اے سندھ مسلم کالج کراچی اور ایم۔ اے کراچی یونیورسٹی سے کیا۔ تاریخ سے خصوصی دلچسپی کی وجہ سے تاریخ میں ہی ایم۔ اے کیا۔ آپ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ

ڈاکٹر محمود حسین کے شاگرد ہیں۔

۱۹۵۶ء میں آغا صاحب نے عملی زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان میں بحیثیت پروڈیوسر کیا۔ ۱۹۶۴ء میں لاہور میں ٹیلی ویژن کے قیام کے ساتھ ہی لندن میں ٹیلی ویژن کی تربیت حاصل کرنے کے بعد ریڈیو سے ٹیلی ویژن میں آگئے اور اس نئے نئے قائم شدہ ادارے میں بڑی تیز رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے پروڈیوسر سے پروگرام مینیجر اور پھر ڈائریکٹر پروگرامز کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں نیشنل فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں پاکستان ٹیلی ویژن کے مینجنگ ڈائریکٹر بنائے گئے اور دو سال بعد یعنی ۱۹۸۸ء میں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل اور ۱۹۹۳ء میں شالیمار ریکارڈنگ اینڈ براڈ کاسٹنگ کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۷ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر فری لانس میڈیا کنسلٹینٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

محترم آغا ناصر نے دورانِ ملازمت بیرونی ممالک کے سفر بھی بڑی تعداد میں کئے اور بہت سی نشریاتی انجمنوں اور یونینوں میں اہم عہدوں پر گرانقدر خدمات انجام دے کر سرخرو ہوئے۔ روس، چین، جاپان، ایران، ملائشیا، سوئزر لینڈ، انڈیا، آسٹریلیا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا وغیرہ میں منعقد ہونے والے ٹیلی ویژن پروگراموں کے بین الاقوامی مقابلوں میں بحیثیت منصف شرکت کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ ملکی سطح پر بھی بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری یا نیم سرکاری انجمنوں اور اداروں کے بورڈ آف ڈائریکٹرز اور بورڈ آف گورنرز کے رکن کے طور پر بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان اداروں میں پاکستان رائٹرز گلڈ، پاکستان فلم سنسر بورڈ، پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس، لوک ورثہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، روٹری کلب آف اسلام آباد، پاکستان ڈرامہ گلڈ، نیف ڈیک، پاکستان فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن اور الشفاء ٹرسٹ قابلِ ذکر ہیں۔

آغا صاحب نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حوالے سے لاتعداد انعامات اور اعزازات حاصل کئے ہیں۔ اس طویل فہرست میں قابل ذکر "صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی" ہے جو حکومت پاکستان نے ۱۹۹۴ء میں عطا کیا۔ آپ کو ادب، ثقافت، فن، کھیل اور سیاست یعنی زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والی قومی اور بین الاقوامی شخصیات سے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے اور اکثر خود بھی اسی صف میں شامل نظر آئے ہیں۔

محترم آغا ناصر کو شعر و ادب سے دلچسپی ابتدائی عمر سے ہوئی۔ ابتداء میں چھوٹے موٹے مضامین اور کہانیاں لکھیں۔ پھر ریڈیو پاکستان آنا جانا شروع ہوا تو فیچر اور ڈراموں کی تحریر کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت تیزی سے مقبولیت حاصل کی۔ آپ نے ریڈیو، ٹیلی ویژن، اسٹیج اور فلم کے لئے بہت سے ڈرامے لکھے اور بحیثیت ہدایت کار بھی شہرت پائی۔ آپ کے تحریر کردہ ڈراموں کے دو مجموعے "آغا ناصر کے سات ڈرامے : ۱۹۷۵ء اور "آغا ناصر کے ٹیلی ویژن ڈرامے : ۱۹۸۸ء شائع ہو چکے ہیں۔ روزنامہ "

جنگ " میں "کچھ یادیں کچھ باتیں" کے زیرِ عنوان بہت سے مرحوم بزرگ احباب اور قریبی دوستوں پر آپ کے مضامین کا سلسلہ شائع ہو رہا ہے جس میں اب تک فیض احمد فیض' زیڈ۔اے بخاری' خواجہ معین الدین' سلیم احمد اور ریاض فرشوری وغیرہ کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی یادداشتیں قلم بند ہو چکی ہیں۔ یہ سوانحی خاکے کتابی صورت میں بھی زیرِ اشاعت ہیں۔ آغا صاحب کے ڈراموں کے بارے میں دو آراء دیکھئے جس سے آپ کی تحریر کی خصوصیات کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔

فیض احمد فیض : آغا ناصر کے ڈراموں کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ ان میں ادبی اور تکنیکی دونوں محاسن موجود ہیں۔ مکالمے سجا کر لکھے ہیں۔ کرداروں کی صورت گری کفایت اور صفائی سے کی ہے۔ ڈرامائی بنت اور بنت سبک اور ضاعانہ ہے اور موضوعات کا انتخاب سلیقے اور سنجیدگی سے کیا گیا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے خلوص اور دلسوزی سے لکھا ہے۔

مرزا ادیب : ایک صاحبِ بصیرت مصنف کا کام زندگی کی حقیقی معنویت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ یہ معنویت کہیں تو مسکراہٹ کی ایک لہر ہے اور کہیں پلکوں پر لرزتا ہوا ایک قطرۂ اشک۔ زندگی کی یہ حقیقی معنویت آغا صاحب کے ہاں موجود ہے۔ ڈرامہ میں تخلیق سے لے کر تشکیل تک مختلف منزلیں حائل ہیں اور آغا ناصر ان مختلف منزلوں سے گزر چکے ہیں۔

آغا ناصر صاحب اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ آپ کے صاحبزادے آغا بلال اور دونوں بیٹیاں ہما خاور اور شائمہ مراد بھی اسلام آباد میں ہی رہتے ہیں۔ آپ کے مشاغل میں طویل چہل قدمی' کتب بینی اور باصلاحیت افراد کی محفلوں میں شرکت قابلِ ذکر ہیں۔ خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر آغا ناصر صاحب نے ملک و قوم کی بہترین خدمت کی ہے اور اپنے کام سے اپنے نام کو تابندگی بخشی ہے۔

نواب سید آل حسن

حضرت سید آل حسن خلف سید ابن حسن صاحب مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ آپ ۵ نومبر ۱۹۰۵ء بروز جمعہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید ابن حسن ہاپوڑ میں رئیس اعظم کہلاتے تھے۔ آپ کی ولادت بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد ہوئی تھی چنانچہ والد ماجد نے خیرات و سخاوت سے غریبوں اور مسکینوں کو نہال کر دیا۔ حقیقت یہ نہ صرف پورے شہر کو کھانا کھلایا گیا بلکہ ریل کے مسافروں کو اسٹیشن پر گاڑی روک کر کھانا پیش کیا گیا۔ رسم بسم اللہ بھی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اوائل عمری میں آپ کے والد ماجد جہانِ رنگ و بو سے رخصت ہوئے۔ والدہ ماجدہ محترمہ امراؤ بیگم نہایت پاکباز نیک اور حوصلہ مند سیدہ خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کے ساتھ ترکِ سکونت کر کے میرٹھ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔

حضرت سید آل حسن کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز میرٹھ کے گورنمنٹ اسکول سے ہوا۔ بچپن سے ہی سنجیدہ مزاج اور غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے دوسرے بچوں سے مختلف نظر آتے تھے۔ چودہ برس کی عمر میں علی گڑھ اسکول میں داخل کرائے گئے۔ اس وقت آٹھویں کلاس میں زیرِ تعلیم تھے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی دین سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت بھی نہ صرف نماز کے پابند تھے بلکہ تہجد کی نماز بھی باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ غور و فکر ہماری عادت تھی۔ ہماری پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ محل نما حویلی میں رہتے تھے جہاں نوکروں کی ایک فوج خدمت پر ہر وقت کمربستہ رہتی تھی۔ تاہم دل ان چیزوں میں نہیں لگتا تھا اور ایک عجیب قسم کی بے چینی اور خلش دل میں رہتی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں سراپا شفقت والدہ محترمہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں جس کا آپ پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں حضرت سید ابو احمد محمد علی حسین اشرفی جیلانی سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ ایک سال بعد ہی حضرت نے خلافت عطا فرماتے ہوئے کہا کہ ہم نے تمہیں خلافت اللہ کے حکم سے دی ہے محض اپنی مرضی سے نہیں اور اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرمایا کہ جس کو جسے چاہیں تعلیم دے سکتے ہیں۔

آپ خلافت ملنے سے پہلے کلین شیو تو تھے مگر مونچھیں تھیں اور وہ بھی بڑی رعب دار قسم کی، جیسی کہ عام طور پر جاگیرداروں کی ہوتی ہیں۔ خلافت ملنے کے بعد وہ بھی آپ نے صاف کرا دیں۔ چند حضرات نے آپ کے مرشد کو متوجہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہم نے اس فرزند کو اس راستے پر ڈالا ہے جس کے تصور سے ہی فرشتوں کے پر جلتے ہیں' لہٰذا آئندہ ان کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کرے۔

سید آل حسن صاحب نے مسلمانوں کی عملی خدمت کی۔ تحریکِ پاکستان میں بھی آپ نے سرگرم حصہ لیا۔ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور یو پی مسلم لیگ کے ممبر اور ہاپوڑ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ۱۹۴۰ء

میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس منعقدہ لاہور میں اپنے کثیر کارکنوں کے ساتھ شریک ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں قائداعظم شملہ کانفرنس کے سلسلے میں دہلی میں مصروف تھے۔ نواب صاحب ایک دن کناٹ پلیس میں' جہاں ان کی اپنی دکان بھی تھی' حجام کی دکان پر بال کٹوانے گئے۔ دیکھا کہ قائداعظم بھی بال کٹوانے آئے ہوئے ہیں۔ وہاں نواب صاحب نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ قائداعظم خوش ہوئے اور انھوں نے نواب صاحب کی دکان پر آنے کا عندیہ دیا۔ شام کو وہ محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ تشریف لائے۔ وہاں انھوں نے خریداری بھی کی۔ اس موقع پر نواب سید آل حسن صاحب نے ایک خوبصورت امپورٹڈ ہیرا دو نما سگریٹ کیس تحفتہً پیش کیا' جس کے لئے قائداعظم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

حضرت سید آل حسن صاحب کا قلم سے بھی تعلق تھا۔ لکھنے پر قادر تھے۔ ۱۹۳۹ء میں قائداعظم انگریزی روزنامہ "ڈان" کے لئے چندہ مہم پر کاٹھیاواڑ آئے۔ جلسہ کے منتظمین میں سید صاحب بھی پیش پیش تھے۔ عین وقت پر حاجی ولی محمد صاحب نے بتایا کہ سپاسنامہ تو لکھا ہی نہیں گیا ہے جبکہ قائد کی آمد کا وقت ہونے والا ہے' چنانچہ حاجی صاحب کی دعوت و درخواست پر صرف دس منٹ میں بزبان انگریزی سپاسنامہ خود ہی ٹائپ کر کے ان کو پیش کر دیا۔ جب قائداعظم تشریف لائے اور وہ انھیں پیش کیا گیا تو وہ اسے سن کر بہت خوش ہوئے اور تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ابھی تک کہیں ایسا سپاسنامہ پیش نہیں کیا گیا۔ میں اسے اپنے ریکارڈ میں رکھوں گا۔

اوائل ۱۹۴۷ء میں دہلی میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے آپ دہلی کے پرانے قلعہ میں منتقل ہو گئے۔ جہاں سے ۲۰ ستمبر کو بذریعہ اسپیشل ٹرین لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ اس ٹرین کو بلوائیوں نے دریائے بیاس پر روک کر نشانہ بنایا۔ پوری گاڑی لاشوں سے بھری لاہور پہنچی۔ صرف دو بوگیاں محفوظ رہی تھیں' انہی میں نواب صاحب بھی تھے۔ لاہور میں مختصر قیام کے بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں کراچی منتقل ہوئے اور دھرم داس بلڈنگ کچہری روڈ کے ایک فلیٹ میں قیام پذیر ہوئے اور پھر وصال تک وہیں رہے۔

ظاہری شان و شوکت سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ کراچی میں ایک مرتبہ نوابزادہ لیاقت علی خان نے' جب وہ وزیراعظم تھے' ملاقات کے لئے پیغام بھجوایا کہ وہ آپ کو کوئی اہم ملکی منصب اور ذمہ داری سونپنا چاہتے ہیں۔ آپ نے اپنے چھوٹے بھائی سید حامد حسن صاحب سے کہا کہ آپ ان سے مل آئیں اور ہماری طرف سے معذرت کر لیں۔ اب ہمارا مقصدِ زندگی بدل چکا ہے اور ہمیں دنیاوی اعزازت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

آپ تبلیغِ دین میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ علماء و مشائخ بھی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ خاص حلقۂ احباب میں اہلِ دل اور صاحبِ ذوق حضرات کے علاوہ صوفیاء کرام اور علماء کرام بھی شامل تھے جن میں مولانا عبدالسلام نیازی' صوفی عبدالکریم شاہ تاجی معروف بہ یوسف تاجی' بابا ذہین شاہ تاجی' حضرت حیرت شاہ وارثی' حضرت عنبر شاہ وارثی' حضرت سائیں ولایت شاہ (لیہ)' آغا شریف حسن سجادہ نشین حضرت شاہ

محمد غوث (لاہور) شامل ہیں۔ آپ کے خلفاء میں محمد یوسف راٹھور اشرفی، علامہ محمد یوسف بٹ اشرفی اور الحاج شیخ اختر نصیر اشرفی ہیں۔ وابستگان میں شیخ محمد نیر اقبال، مولانا سید اظہر علی اشرفی، سفیر احمد اشرفی، سید معین الدین کاظمی اشرفی، عبدالمجید غوری اشرفی اور محمد نواز بٹ اشرفی قابل ذکر ہیں۔ "طرزِ دلبر" محمد نواز کی تصنیف ہے، جس میں حضرت سید آلِ حسن صاحب کے حالات اور تصوف کے حوالے سے گرانقدر مضامین شامل ہیں۔

نواب صاحب کی اولاد میں پانچ صاحبزادیوں کے علاوہ اکلوتے صاحبزادے سید محمود حسن اشرف اشرفی جیلانی المعروف بہ اشرف میاں صاحب ہیں۔ اشرف میاں صاحب آپ کے وصال کے بعد آپ کے سجادہ نشین ہیں۔ انہیں حضرت سید مختار اشرف صاحب سابق سجادہ نشین آستانہ عالیہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف سے خلافت بھی عطا ہوئی ہے۔ موصوف جدید علوم کے ساتھ علمِ دین سے بھی آراستہ ہیں۔

فیض جاری تھا۔ یکم مارچ ۱۹۵۹ء کو بوجہ علامت سیونتھ ڈے ہسپتال کراچی میں سید صاحب کو داخل کرایا گیا جہاں پندرھویں روز یعنی ۱۵ مارچ ۱۹۵۹ء مطابق ۵ رمضان المبارک ۷۸ ۱۳ھ بروز اتوار دوپہر کے وقت وصال فرما گئے۔ آپ کا مزارِ مبارک احاطہ بابا عبداللہ شاہ غازی کلفٹن (کراچی) میں ہے اور مرجعِ خاص و عام ہے۔ قطعۂ تاریخِ وصال ہے:

وصالِ حضرتِ آلِ حسن سے — ہر اہلِ دل ہے بحرِ رنج و غم میں
ہوئی تاریخ کی جب فکر مجھ کو — تو ہاتف نے لکھا بابِ کرم میں
بہ فیضِ شیخ تن پہنچا ہے باقر — گہر عرفان کا "قصرِ ارم" میں

طرزِ دلبری، بہ شکریہ سید محمود حسن اشرف



مزار مبارک سید آل حسن الاشرفی الجیلانی

نواب ابو محمد خاں

شیخ عماد کا شمار امراء میں ہوتا تھا۔ ان کے دونوں بیٹے نواب ابو محمد خاں اور نواب بہادر خاں کھنوہ میر تھی اقبال مند ہوئے اور شہرت حاصل کی۔ شیخ عماد کے والد شیخ صدر الدین عرف صدر جہاں' حضرت شیخ لالی کے ساتھ آکر میرٹھ میں اقامت گزیں ہوئے تھے۔ شیخ صدر الدین کی نرینہ اولاد میں شیخ عماد اور شیخ حبیب تھے۔ شیخ حبیب بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا شمار مشائخ میں ہوتا تھا۔ شیخ عماد صاحب جاہ تھے۔

نواب ابو محمد خاں اور نواب بہادر خاں بہ عہد نور الدین جہانگیر بادشاہ و شہاب الدین شاہجہاں صاحب قراں امرائے شاہی سے تھے۔ بادشاہ نامہ میں عبدالحمید لاہوری نے لکھا ہے کہ شاہجہاں صاحب قراں کے عہد میں ابو محمد خاں کا منصب ہزاری ذات و ہشت صد سوار کا تھا۔ اور ان کے بھائی نواب بہادر خاں شاہ موصوف کے زمانہ سلطنت میں بہ منصب پانصدی ذات و چار صد سوار ممتاز تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دئے۔

نواب ابو محمد خاں نے ہگلی بندر کے راجہ کو شکست دے کر اس کے علاقے کو فتح کیا تھا۔ انہوں نے دوسرے امور کے ساتھ ساتھ سماجی و فلاحی شعبہ پر بھی اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ نواب ابو محمد خاں کالی ندی سے ایک چشمہ کاٹ کر میرٹھ میں لائے جو دیکھ بھال اور مرمت نہ ہونے کے سبب خراب ہو گیا۔ اب عوام الناس اس کو ابو کا نالہ کہتے ہیں۔ میرٹھ کی عید گاہ ان کی نشانیوں میں سے ہے۔ ان کا تعمیر کردہ ایک قلعہ بھی میرٹھ میں تھا' جس کی دیواریں اور برج سب بہت پہلے مسمار ہو چکے ہیں۔ اب اس جگہ ایک محلہ آباد ہے جو کوٹلہ ابو محمد خاں کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ عماد کا عالیشان مقبرہ سنگِ سرخ سے بنایا ہوا' ان کا یادگارِ زمانہ ہے۔ مقبرے کی شمالی محراب پر متعدد اشعارِ تاریخ کندہ ہیں۔ ان میں سے ایک کا مصرعہ تاریخ یہ ہے "از شیخ عماد آہ گفتا"۔ اس سے ۱۰۳۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ مقبرے کے اندر چند قبروں کے تعویذ حوضہ سنگِ مرمر کے ہیں۔ ان پر خط نسخ میں کلمہ توحید ابھرے ہوئے حرفوں میں کندہ ہے۔ یہ "مقبرہ ابو محمد خاں" کے نام سے مشہور ہے۔ حکیم فیض احمد مارہروی کے مطابق اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ابو محمد خاں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد یہ مقبرہ تعمیر کرایا ہو گا اور وہ خود بھی وہیں مدفون ہوئے' لہٰذا انہیں کے نام سے شہرت ملی۔ اس مقبرے کے لئے صدہا بیگہ زمین تھی' جس کا زیادہ حصہ اس سے سو سال پہلے ہی آباد ہو چکا تھا۔ پہلے وہاں کاشت ہوتی تھی۔ قصبہ بڈھانہ میں مساجد و مہمان سرائے و چاہ و باولی اور قصبہ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر میں مساجد اور مسافر خانے اور تالاب و باغ ان کی بہترین یادگاریں ہیں۔ موضع ابو محمد پور متصل قصبہ مراد نگر ضلع میرٹھ بھی نواب ابو محمد خاں کا آباد کیا ہوا ہے۔ ان کے بھائی نواب بہادر خاں کی بنائی ہوئی بہت سی چھوٹی مسجدیں بھی موجود ہیں۔ ان کی نسل کے افراد اب بھی میرٹھ میں آباد ہیں۔ "الشاہیر" میں ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قراں ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی کا ایک فرمان بنام نواب ابو محمد خاں نقل کیا گیا ہے۔

مصنفہ حکیم فیض احمد مارہروی' بہ شکریہ پروفیسر ظفر عمر زبیری — الشاہیر' ص ۱۳۶ تا ۱۴۹' مطبوعہ ۱۸۹۸ء

خان بہادر نواب احمد اللہ خاں

نواب احمد اللہ خاں خلف نواب مبارک علی خاں نے اپنی دیرینہ خاندانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے مختلف اہم سرکاری عہدوں پر دردمندی اور دل جمعی کے ساتھ شاندار خدمات انجام دیں اور شہرت حاصل کی۔ آپ حلم و متانت اور تہذیب کا نمونہ تھے۔ شیریں رقم ہونے کے باوصف نہایت زود نگار تھے۔ صلح پسندی' معاملہ فہمی اور اصولوں کی پاسداری مزاج کا حصہ تھی۔ ان خصوصیات کی وجہ سے حکام بھی ادب کرتے تھے اور عوام میں بھی مقبول تھے۔

نواب احمد اللہ خاں نے یکم اکتوبر ۱۸۳۹ء کو عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۸۶۳ء میں عہدہ پٹرولی پر ترقی کی اور اپنی خدمات کے صلے میں یکم ستمبر ۱۸۶۸ء سے اس عہدے کی اول درجہ کی تنخواہ اور دیگر اعزازات حاصل کئے۔ ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں حکومت کے امور میں تعاون کیا۔ ۱۸۷۷ء میں عہدہ مذکور سے پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے۔ دو سال بعد اسپیشل مجسٹریٹ و وائس پریذیڈنٹ میونسپل بورڈ میرٹھ مقرر ہوئے اور اپنی دیانت داری' فرض شناسی اور حکمت عملی کی وجہ سے سرخرو ہوئے۔ ۱۸۸۵ء میں نوابی کا خطاب عطا ہوا مگر اس کے کچھ عرصہ بعد اپنی ذمہ داریاں اپنے خلف اکبر خاں بہادر نواب اسد اللہ خاں کو منتقل کر کے گوشہ نشیں ہو گئے۔ ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ کو آپ کے انتقال سے شہر کی فضا سوگوار ہو گئی۔ کثیر تعداد میں عوام نے آخری رسومات میں شرکت کی۔ جس کی وجہ سے دو مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔

نواب احمد اللہ خاں صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف سے خاص دلچسپی تھی اور تاریخ میں وسیع نظر رکھتے تھے۔ آپ کی تین تصانیف یادگار ہیں۔ حکایات شاہان (اس میں جملہ بادشاہانِ دہلی کی نقل و حکایات مع تصاویر درج ہیں)' حکایات امراء (اس میں نقل و حکایت امرائے عہد سلاطین خاندان بابریہ لکھی ہیں) اور اخلاق احمدی (یہ کتاب اخلاق سے متعلق ہے)۔

آپ ہی نے کوٹھی "جنت نشان" تعمیر کر کے اپنی عمر عزیز وہیں بسر کی۔ آپ کے بعد آپ کے اولاد نے اسے آباد رکھا۔ نواب اسد اللہ خاں کے صاحبزادوں میں نواب احمد اللہ خاں' نواب سیف اللہ خاں' احسن اللہ خاں اور امیر اللہ خاں کے علاوہ ایک اور بھی تھے جن کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔ ان میں اول الذکر نے خاص شہرت حاصل کی۔

ماخذ : المشاہیر' خاندان زبیری کنبوی



مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی

مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی

مشہور عالمِ دین، ممتاز خطیب، معروف مبلغ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی قادری نے علمِ دین کے فروغ اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے اپنی دیرینہ خاندانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے یادگار خدمات انجام دی ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی کی ولادت ۱۹۲۶ء میں میرٹھ میں ہوئی۔ آپ مولانا محمد عبدالحکیم جوشؔ میرٹھی کے پوتے، شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ کے صاحبزادے، مولانا احمد مختار صدیقیؒ اور مولانا نذیر احمد خجندی کے بھتیجے ہیں۔ ممتاز شاعر مولوی محمد اسٰعیل میرٹھی آپ کے دادا کے بھائی ہیں۔

مولانا موصوف نے صرف آٹھ سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ آپ جس وقت کلام ربانی کی تلاوت فرماتے ہیں تو ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ حاضرین اللہ رب العزت کے کلام کو سنتے ہوئے اس کے دربار میں حضوری کے تصور سے نمناک ہو جاتے ہیں اور وہ عالمِ محویت میں آپ کی آواز سے عالمِ سرور میں پہنچ جاتے ہیں۔ مولانا نے نیشنل عربک کالج میرٹھ میں گریجویشن کیا اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے فاضل عربی کی سند حاصل کی۔ دارالعلوم عربیہ میرٹھ سے درس نظامی (فاضل) کرتے ہوئے علومِ اسلامیہ میں اپنی تعلیم مکمل کی۔

تحریکِ پاکستان کے دوران مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے سرگرم حصہ لیا۔ نوجوانوں کی تنظیم نیشنل گارڈ فورسز کو منظم کیا اور سینکڑوں عوامی اجتماعات سے خطاب کیا اور عوام کو باور کرایا کہ پاکستان مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ نے دنیا بھر کے دورے کئے اور اسلام کی حقانیت اور اس کے نفاذ کی ضرورت کو باور کراتے رہے اور اہم ممالک کے سفر میں اس مقصد کو حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کیں۔ عالمی سطح کی ان تبلیغی کوششوں سے لاتعداد تعلیم یافتہ افراد متاثر ہوئے اور ہزاروں افراد آپ کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے اسلامی فکر و فلسفہ اور تعلیم کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ علمائے اسلام کو متحرک و فعال بنانے اور اسلامی بھائی چارے کو مستحکم کرنے کے لئے بھی ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا۔ "ورلڈ

مسلم علماء آرگنائیزیشن" کے پلیٹ فارم سے آپ نے اس مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کی۔ اس تنظیم کے صدر مفتی اعظم فلسطین اور سیکریٹری جنرل مولانا شاہ احمد نورانی صاحب تھے۔ مولانا گیارہ سال تک یہ ذمہ داریاں سنبھالے رہے۔ اس دوران میں تبادلہ خیال اور مذاکروں کے ذریعہ مولانا نے عیسائیوں اور قادیانیوں کو دلائل کے ذریعہ قائل کیا۔ اس کے نتیجہ میں ایک طرف عیسائی اسلام کی طرف راغب ہوئے اور دوسری طرف تقریباً "چھ سو قادیانی تائب ہو کر اسلام میں داخل ہوئے۔

اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ آپ نے اسلامی نظام کے لئے سیاسی میدان میں بھی کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان میں منعقد ہونے والے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسمبلی میں جمعیت علمائے پاکستان کی پارلیمانی پارٹی کی قیادت کا فریضہ ادا کیا۔ بعد میں متحدہ حزب اختلاف کی پارلیمانی پارٹی کے سیکریٹری جنرل منتخب کئے گئے۔ آئینی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے آپ نے آئین کو اسلامی اور جمہوری بنانے کے لئے دن رات کام کیا اور آئینی کمیٹی میں دو سو تجاویز اور اضافے کئے۔ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام قرار دینے کے لئے آپ نے انتھک محنت کی اور آپ کی کوششوں سے مسلمان کی تعریف کو آئین کا حصہ بنایا گیا۔ بعد میں آپ نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی قرارداد میں اہم کردار ادا کیا۔ متحدہ حزب اختلاف نے مولانا کو وزیر اعظم کے لئے نامزد بھی کیا تھا۔

مولانا شاہ احمد نورانی صاحب جمعیت علمائے پاکستان کے صدر ہیں۔ یہ علمائے اہلسنت کی ملک گیر تنظیم ہے۔ آپ نے مارچ ۱۹۷۳ء میں بریڈ فورڈ' برطانیہ میں منعقدہ انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس کی صدارت فرمائی۔ اس کانفرنس میں مولانا موصوف کو مشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ تا حال آپ ہی کی رہنمائی میں ورلڈ اسلامک مشن کا کام جاری ہے۔ ان مصروفیات کے ساتھ ساتھ آپ ہر ماہ رمضان میں نمازِ تراویح کی امامت فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کی شریکِ زندگی مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی صاحبزادی اور حضرت مولانا ضیاء الدین مدنی کی پوتی ہیں۔ آپ کا عقد مدینہ منورہ میں ہوا۔ مولانا نورانی صاحب کے ایک صاحبزادے محمد انس صدیقی لیبیا اور دوسرے صاحبزادے محمد اویس صدیقی امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بیٹیوں میں ایناس کوثر اور ایمان کوثر ہیں۔ جن کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ محترمہ امت السبوح' ڈاکٹر فریدہ احمد اور ڈاکٹر عزیزہ آپ کی بہنوں میں مشہور ہیں۔ ممتاز اسکالر ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری اور محمد احمد صدیقی آپ کے بہنوئی ہیں۔ مولانا کی والدہ بفضل تعالیٰ حیات ہیں اور مولانا ہی کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔



اختر حمید خاں

اختر حمید خاں

محترم اختر حمید خاں کو دنیا بھر میں ہمارے زمانے کے نمایاں ترین سماجی سائنس دانوں میں سے ایک کے طور پر جانا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر آپ ان دو کمیونٹی ڈویلپمنٹ کے منصوبوں کے خالق کی حیثیت سے معروف ہیں جنہیں بین الاقوامی پذیرائی حاصل ہوئی۔ یعنی اختر حمید خاں صاحب سابق مشرقی پاکستان کے کومیلا منصوبے کے ڈائریکٹر تھے اور پھر کراچی کے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے آخری دم تک ڈائریکٹر رہے۔ آپ کو عالمی سطح پر پہچانا گیا اور وہ شہرت و عظمت حاصل ہوئی جس کی تمنا کی جا سکتی ہے۔

محترم اختر حمید خاں ۱۵ جولائی ۱۹۱۴ء کو آگرہ کے ایک صاحب علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ تین بہنیں ہیں۔ آپ کے والد امیر احمد خاں کورٹ انسپکٹر تھے۔ شعری ذوق بھی رکھتے تھے اور قدسی تخلص فرماتے تھے۔ سرسید کے سچے شاگرد تھے۔ والدہ قریشی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ نرم مزاج، ملنسار اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ والدین کی تربیت نے محترم اختر حمید خاں کی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے۔ خود آپ نے لکھا ہے "میرا لڑکپن کا گھر بہت سے دوسرے شرفا کے گھروں کی طرح سرسید کی اصلاح کا ثمر تھا۔"

محترم اختر حمید خاں ہمیشہ ایک ذہین طالب علم رہے اور امتحانات میں امتیازی کامیابیاں حاصل کرتے رہے آپ نے میرٹھ کالج سے بی۔اے اور انگریزی میں ایم۔اے کیا اس وقت آپ کی عمر بیس سال تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پروفیسر کرار حسین، حسن عسکری، ڈاکٹر جمیل جالبی، سلیم احمد اور انتظار حسین جیسے اکابر میرٹھ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ان میں کئی حضرات نے میرٹھ کالج میں پڑھایا بھی۔ انہیں میں اختر حمید خاں شامل تھے۔

محترم اختر حمید خاں خود لکھتے ہیں کہ قدرت نے انہیں غور و فکر کرنے والا مزاج دیا تھا اور ان کا دماغ مابعد الطبیعاتی قیاسات کو قبول کرتا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں آپ انڈین سول سروس (ICS) میں شامل ہوئے جس کو برطانوی ہند کی سب سے معزز اور پسندیدہ ملازمت سمجھا جاتا تھا مگر نو برس بعد ۱۹۴۵ء میں آپ نے

اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ تمام اقتدار اور مادی فائدوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ میں ایک مرتے ہوئے نظام کا حصہ بنے رہنے کو تیار نہ تھا جو اپنی قوت حیات اور عملیت سے محروم ہو چکا تھا۔ عارف محسن نے ایک اور وجہ بتائی کہ آئی سی ایس افسر کی حیثیت سے وہ عوام کے وسیع مسائل کو حل نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ یہ مسائل معاشرتی اور اقتصادی نوعیت کے تھے اور انتظامی اقدامات سے حل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان مسائل کے اسباب جاننے اور ان لوگوں کی زندگیوں کو سمجھنے کی خواہش بڑھتی گئی جو آئی سی ایس افسر کی حیثیت میں ان کے سامنے مختلف معاملات کی بابت عرضیاں پیش کرتے تھے۔

آئی سی ایس کی ملازمت کے دوران اختر حمید خاں صاحب علامہ مشرقی کے پیروکار بن گئے تھے۔ اس دوران آپ اپنے دو نطشائی استادوں کے فلسفے سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ آپ نے تحریر کیا ہے "میں نے قوت اور حکومت کا مزہ چکھا' لیکن یہ بھی دریافت کیا کہ خدا نے مجھے نطشے کے سانچے میں نہیں ڈھالا تھا' یعنی ایک مرد کامل' ہمدردی سے عاری' فنکار حکمراں کے سانچے میں۔ مجھے خوشی نہیں ہوتی تھی جب غریب میرے پاؤں پڑتے تھے بلکہ شرمندگی ہوتی تھی اور جب میں ان کی مفلسی دیکھتا' جیسے قحط کے زمانے میں' تو میں اپنی نوابانہ بے اعتنائی قائم نہ رکھ پاتا بلکہ بے حد افسردہ ہو جاتا۔ میں اس بے رحمانہ نظام سے بھی آنکھیں بند نہ رکھ پاتا جس کے استحکام کی خاطر مجھ کو بطور انعام دولت اور قوت ملتی تھی۔ جب جنگ کے دوران میں حکومت کی ممانعت کی پالیسی کے تحت غریبوں کی کشتیاں اور گاڑیاں چھینتا' اور اس طرح انہیں قحط سے دوچار کر دیتا اور جب میں قوم پرست باغیوں کو گرفتار کرتا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا' میں نے محسوس کیا کہ میرا مرد کامل ہونے کا وہم فریب ہے اور میں نے اس سے پیچھا چھڑا لیا۔"

طاقت اور فتوحات کی تحسین' صوفیانہ اقدار کا تضاد اور دوسرے اخلاقی تضادات آپ کی تعلیم و تربیت کا جزو ہے۔ آئی سی ایس چھوڑنے کے بعد اختر حمید خاں صاحب نے علی گڑھ میں تالے بنانے والے ایک مزدور کی حیثیت سے کام کیا' تاکہ مزدور طبقے کے طرز زندگی اور مزاج سے براہ راست واقفیت حاصل ہو سکے۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں پڑھایا۔ وکٹوریہ کالج کومیلا کے پرنسپل رہے اور پھر کومیلا پروجیکٹ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس ادارے میں آپ نے ٹھوس ترقیاتی کاموں کا آغاز کیا۔ یہ کام مزاج سے مطابقت بھی رکھتا تھا کیوں کہ مسائل کے ساتھ محض نظری سطح پر نبرد آزما ہونے سے آپ کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔ پروجیکٹ کا دفتر اور پروگراموں کا انتظام نہایت کفایت شعاری اور جزرسی کے ساتھ چلایا۔ یہ خصوصیات اختر حمید خاں صاحب کے طرز زندگی میں بھی نمایاں رہیں۔

مشرقی پاکستان کے بحران کے بعد آپ کراچی آ گئے۔ ۱۹۸۰ء میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے ڈائریکٹر کا عہدہ قبول کرنے تک کی اپنی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ہاں! تقدیر' ایوب خاں' بارورڈ کے مشیروں اور مشرقی پاکستان کو بہا لے گئی اور مجھے' بلاشبہ میرے گناہوں کی پاداش میں' دوبارہ اجڑنے والا مہاجر' پناہ گیر بنا کر یہاں لے آئی۔ ابتدا میں' میں نے اس فریب کو دل میں جگہ دی کہ میں کومیلا اکادمی

کے دیہات سدھار پروگرام کو پشاور اکادمی میں جاری رکھ سکوں گا' جہاں میرے دوست شعیب سلطان ڈائریکٹر تھے۔ لیکن تین سال کے اندر ہم دونوں کو اکادمی سے الگ کر دیا گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ کومیلا کے پروگرام' دیہی ترقی کے کام' تھانے مراکز اور کسانوں کے کوآپریٹو جیسے تصورات کو "نئے پاکستان" میں فرسودہ خیال کیا جاتا ہے۔ اب میں ساٹھ سال کا ہو گیا تھا' لہٰذا اس بات کا حقدار تھا کہ گھوڑے پر پھینک دیا جاؤں' جہاں سے اٹھا کر میری تیسری مادر درس گاہ' مشیگن یونیورسٹی نے مجھے دوبارہ دیہی ترقی کے معلم کی حیثیت سے کار آمد بنایا۔ غیر ممالک میں پانچ سال پر سکون زندگی گذارنے کے بعد اور بیرون طلبہ کو پڑھا کر میں واپس کراچی آ گیا' مہاجروں کی پناہ گاہ میں' ایسی ماں کی گود میں جو تمام اطراف سے آنے والے پناہ گزینوں کی ماں ہے۔ یہاں میں اپنے ساتھ اپنے صوفی مرشدوں کی' عارفوں کی اور روشن ضمیر استادوں کی دانش مندی' فلسفیوں' پسندیدہ شاعروں اور ناول نویسوں کی کتابیں لایا میں ان کی پر کون صحبت میں اپنے آخری ایام آرام سے مخدول کر میں گزارنے کی امید رکھتا تھا تاکہ ان کے مشورے سے اس پریشان کن دنیا سے رخصت کی تیاری کر سکوں' لیکن ۱۹۸۰ء میں بی۔ سی۔ سی۔ آئی کے آغا حسن عابدی اور ابنِ حسن برنی نے مجھے اس بات پر راضی کیا کہ میں اپنا آدھا وقت موت کی تیاری کو اور آدھا وقت اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے آزمائشی منصوبے کو دوں۔"

اورنگی ٹاؤن شپ ۱۹۸۰ء سے آخری دم تک اختر حمید خاں صاحب کی سرگرمیوں کا مرکز رہی۔ یہ زیادہ تر کچی آبادیوں پر مشتمل ہے۔ یہ ملی جلی آبادی ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجروں' بنگلہ دیش سے آئے ہوئے بہاریوں' پاکستان کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے پنجابیوں' پٹھانوں اور مقامی سندھی اور بلوچی باشندوں پر مشتمل ہے۔ اس آبادی کا بیشتر حصہ مزدور طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور یہ سب روزانہ کی اجرت پر کام کرنے والے مزدور' ہنر مند' کاریگر' چھوٹے دوکاندار' خوانچہ فروش اور کم آمدنی والے دفتری کارکن ہیں۔ یہ آبادی ۱۹۶۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ نے خود کو ایک تحقیقی ادارہ خیال کیا جس کا مقصد علاقے کے بڑے مسائل کا تجزیہ کرنے اور پھر طویل عملی تحقیق اور توسیع کی ترتیب کے ذریعے ان مسائل کے قابلِ عمل حل تلاش کرنا تھا۔ یہ ادارہ ترقیاتی کام اپنے ذمہ نہیں لیتا بلکہ کمیونٹی کی تنظیموں اور اجتماعی ترقیاتی عمل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ایسے عمل کو فنی مہارت فراہم کرتا ہے۔ آپ نے کوشش کی کہ تعلیم یافتہ پیشہ وروں اور تحقیقی اداروں کا غیر رسمی سیکٹر اور غریب آبادیوں سے موثر ربط قائم ہو۔ اختر حمید صاحب کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک کے عرصہ میں اورنگی جیسی بڑی آبادی والے علاقے کی نصف سے زیادہ آبادی کو اپنے خرچ پر نکاسی آب کا جدید نظام بنانے پر آمادہ کر لیا۔

۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۸ء کے درمیان اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے پروگرام بہت تیز رفتاری سے پھیلے۔ اس کام کے اثرات اندرون و بیرون ملک محسوس کئے گئے۔ کراچی اور ملک کے دوسرے شہروں کی کچی

آبادیوں اور غیر رسمی بستیوں میں قائم کیمونٹی کی انجمنوں، کارکنوں اور غیر سرکاری تنظیموں نے پروجیکٹ کے منتظمین سے رابطے شروع کر دیئے تاکہ وہ رہنمائی حاصل کر سکیں۔ بڑھتے ہوئے کام کے پیش نظر ۱۹۸۸ء میں اس پروجیکٹ کا درجہ بڑھا کر اسے چار خود مختار اداروں کی شکل دے دی گئی۔ بین الاقوامی اداروں نے بھی تعلقات قائم کر لئے۔ ملک کے دیگر حصوں میں قائم ادارے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔

اختر حمید خاں ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ عارف محسن لکھتے ہیں "کیمونٹی ڈویلپمنٹ کے ماہر کے طور پر اختر حمید خاں کی شہرت نے اس حقیقت کو مکمل طور پر نظروں سے اوجھل کر دیا تھا کہ وہ تاریخ کے ایک مشتاق طالب علم ہیں اور حالیہ سماجی، اقتصادی اور سیاسی معاملات کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے اور ان پر تبصرہ کرتے تھے۔ اس مشاہدے اور تجزیے میں آپ کو اس امر سے بہت مدد ملی کہ وہ انگریزی، فارسی، عربی، بنگالی اور پالی زبانوں سے واقف تھے اور اسلامی اور بودھ کلاسیکی تحریروں کا اصل زبان میں عمیق مطالعہ کر چکے تھے۔ چناں چہ آپ کو مسلم کلچر اور تاریخ کے ماخذوں تک، کسی درمیانی واسطے کے بغیر، براہ راست رسائی حاصل تھی۔ اس قدرت کا اظہار آپ کے اندازِ تحریر سے ہوتا ہے، خواہ یہ تحریریں انگریزی ہی میں کیوں نہ ہوں، اور یہ آپ کی حسِ مزاح میں بھی ظاہر ہوتی تھی۔ آپ کو معاصر دنیا کا گہرا فہم بھی حاصل تھا اور اس فہم کی بنیاد آپ کی یورپی تاریخ، ادب اور فلسفے سے واقفیت اور ان قومی اور بین الاقوامی اخبارات کے مطالعے پر تھی جن کا حوالہ آپ کی تحریروں میں اکثر ملتا ہے۔ اختر حمید خاں کو مغرب کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے مواقع بھی ملے۔"

محترم اختر حمید خاں ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ دیہات سدھار اور امداد باہمی کے موضوعات پر آپ نے پاکستان اور امریکہ میں زیادہ تر بنگالی اور انگریزی میں تقریریں کیں۔ ڈائری بھی لکھتے تھے۔ اس میں مختلف موضوعات سے بحث، ادب، تاریخ، معاشیات، حالات حاضرہ، مذہب اور نئی نسل کے مسائل پر لکھتے تھے۔ آپ کی "سفر امریکہ کی ڈائری" پہلی بار ۱۹۷۲ء اور دوسری بار ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ دو سو اٹھائیس صفحات پر ہے۔

آپ شعری ادب سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اپنے دل و دماغ کی کیفیت کی عکاسی کے لئے شاعری کو ذریعہ اظہار بناتے تھے۔ اختر حامد خاں کے مطابق آپ کے شعروں میں آپ کے سوچنے، سمجھنے اور روحانی کش مکش کا عکس بالکل عیاں ہوتا ہے۔ پروفیسر کرار حسین نے اختر حمید خاں "شخصیت اور فن" کے عنوان سے اپنے طویل اظہاریئے میں لکھا ہے "اختر حمید خاں کی زندگی اور فن کی تعمیر میں مشرق اور مغرب کے اہم اثرات شامل ہیں... نظموں میں ذاتی تجربے پر مبنی ایک معروضی صورت حال پیدا کرنا (عشقیہ نظمیں) یا فطرت کے کسی منظر کی تصویر کشی اس طرح کہ وہ کسی MOOD یا کیفیت کی ایک علامت بن جائے (بادل، حسن بنگال، کابوس، زندہ درخت وغیرہ) یا ایک داخلی کش مکش کی ڈرامائی تشکیل (زاہد و

ابلیس) یا محاکات میں صرف جزئیات ہی نہیں (پشت پا' کف پا' ٹائپ کرتی ہوئی انگلیاں) بلکہ جسم کی رنگ و روشنی و تو کی حس (چمپئی بدن سے لگا کر حریم ناز کی قندیل تک) گویا روح جو پیغام جسم کے ذریعے دیتی ہے اس کی ترجمانی' یا کسی شے کی تصویر کشی میں صرف تشبیہات نہیں بلکہ اس سے جو کیفیت یا اثر پیدا ہوتا ہے اس کے لئے کوئی اسم صفت بطور علامت استعمال کرنا (محبوب کا تبسم' گل و گلزار سے لگا کر ہوائے نرم کی طرح لطیف و بکر' اعجاز و نوائے راز) دوسرا موثر عامل' فکر و فن پر قرآن حکیم اور دوسرے مذہبی صحیفوں کی عرفان و تصوف کے حوالے سے معرفت' اور خاص طور پر فارسی تصوفانہ مثنویوں اور رباعیوں کا گہرا نفوذ' جو ان کے خوابوں' تمناؤں' بشارتوں' جستجوؤں' فقر و درویشی کی طرف میلان' انسانیت کی تصویروں اپنے دل سے مکالموں میں نمایاں ہے۔'' اختر حمید خاں کا مجموعہ کلام "چراغ اور کنول" پہلی بار ۱۹۶۷ء میں کتابیات لاہور اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں سٹی پریس کراچی کے زیر اہتمام منظرِ عام پر آیا۔

محترم اختر حمید خاں کی شادی علامہ مشرقی کی صاحبزادی حمیدہ بیگم سے ۱۹۳۹ء میں ہوئی ان کے بطن سے ایک بیٹی عائشہ ہوئیں۔ آپ نے ایک نظم ان کے لئے کہی۔

پھر نہ بیٹھو گی کبھی آکر ہمارے پاس تم
پھر نہ پائیں گے کبھی وہ صحبت محبوب ہم
پھر نہ دیکھیں گے تمہیں بیٹھا ہوا محوِ خیال
پھر نہ پوچھو گی ہمارا خستگی میں حال تم
پھر نہ لرزائے گی ہم کو آپ کی شانِ جلال
پھر نہ ہونگے سرزنش سے آپ کی محکوب ہم
آسرا ہم کو نہ دے گا آپ کا عزمِ بلند
حوصلہ آکر بڑھاؤ گی نہ وقتِ یاس تم

پھر نہ آنکھوں کو نظر آئے گا وہ پیارا جمال
پھر نہ کانوں سے سنیں گے لہجہ مرغوب ہم

آپ نے دوسری شادی ۱۹۶۷ء میں شفیق فاطمہ سے کی' جن سے ایک صاحبزادے محمد اکبر خاں اور تین بیٹیاں راشدہ' آمنہ اور مریم ہوئیں۔ دوسری اہلیہ حیات ہیں۔

محترم اختر حمید خاں کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۳ء میں فلپائن کا "مگسائی سائی ایوارڈ" صدر ایوب خاں کے دور میں "ستارۂ پاکستان" صدر فاروق لغاری کے زمانے میں "ہلالِ امتیاز" اور جنرل مشرف کے عہدِ حکومت میں "نشانِ امتیاز" دیا گیا۔ آخر الذکر کا اعلان انتقال کے بعد ہوا۔ مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری پیش کی۔

آپ کی مشاہداتی و تاثراتی تحریروں کا مجموعہ انگریزی میں شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ اختر حامد خاں نے "کومیلا سے اورنگی تک" کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی جو ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

خود نوشت کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ ارادہ بھی کر لیا تھا کہ مالکِ حقیقی کے پاس سے بلاوا آگیا اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو امریکہ میں لبیک کہا۔ ۱۵ اکتوبر بروز جمعہ آپ کا جسدِ خاکی چار بجے شام اورنگی آزمائشی منصوبے کے احاطے میں دفن ہوا۔ آپ کے انتقال سے لوگ افسردہ ہو گئے۔ تعزیتی جلسے ہوئے جن میں آپ کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی اور خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

تھی ہر ایک بات نشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

نمونہ کلام :

دیباچہ

نہ ہوس ہے میرے دل میں، نہ غرض رکھتا ہوں
نہ مبلغ ہوں، نہ ہادی ہوں، نہ رہبر ہوں میں
خاک پہ بہرِ تماشا سرِ رہ بیٹھا ہوں
ایک آوارہ و آزاد قلندر ہوں میں

دوڑ کر منزلِ مقصود کو جانے والے
مجھ سے کہتے ہیں کہ "تو کون ہے اے خانہ خراب؟
تیری منزل ہے کدھر اور تیرا مقصد کیا ہے؟"
ایک شعر، ایک تبسم ہے فقط میرا جواب

مدت العمر سے ہے جس کی تلاش اور طلب
کہیں ملتا نہیں وہ گوہرِ نایاب مجھے
کبھی افرنگ کو نکلتا ہوں، کبھی سوئے عرب
چین لینے نہیں دیتا دلِ بیتاب مجھے

طبع جب صحبتِ یاراں سے گراں بار ہوئی
لے گئی سوئے بیاباں مجھے آشفتہ سری
میرا دم ساز بنا اور مری غم خوار ہوئی
نالۂ نیم شبی، شورشِ آہِ سحری

سازِ دل بادِ شمالی نے بجایا ہے کبھی
گاہ بیدار کیا صبح کے تاروں نے مجھے
اور آغوشِ محبت میں سلایا ہے کبھی
لکۂ ابر نے، مہتاب کے غاروں نے مجھے

لے کے سرمایۂ نسرین و بنفشہ و سمن
میں غنی ہو گیا، رہتی ہے مری جیب بھری
کی ہے آراستہ ایک انجمنِ فکر و سخن
میں نے الفاظ کے شیشے میں اتاری ہے پری

لطفِ صد گونہ ہے ایک شعرِ دل آرام بنا
جس طرح شہد بنی جانِ جوانانِ چمن
زعفراں خطۂ کشمیر کا پیغام بنا
نافۂ مشک بنی روحِ بیابانِ ختن

سینے میں آگ لگی ہے تو جلایا ہے چراغ　　　دل میں جب داغ پڑا ہے تو بنایا ہے کنول
میں نے انبوہِ مشاغل میں بھی پایا ہے فراغ　　　جیسے پانی کی سطح سے ابھر آیا ہے کنول

دولتِ فقر ہیں، آرائشِ درویشی ہیں　　　جنسِ بازار نہیں ہیں مرے اشعار مجھے
گردشیں میں نے زمانے کی بہت دیکھی ہیں　　　اب تقاضا ہے کہ دیکھے نگہِ یار مجھے

۱۹۳۵ء، اوسیا

مرثیہ

مری نگاہوں کے پھر مقابل　　　کبھی نہ ہوگا وہ ماہِ کامل
ہمیشہ تڑپے گا طائرِ دل　　　اسی ہوس میں برنگِ بسمل

بہارِ الفت کی وارداتیں　　　وہ اس کی صحبت، وہ دن وہ راتیں
جو یاد آئیں گی اس کی باتیں　　　نظر میں ہوگا جہانِ باطل

ہما کا سایہ تھا اس کا آنا　　　بلند تھا اس کا آشیانہ
اسے یہ دنیا تھی دام و دانا　　　نہیں تھا یہ خانہ اس کے قابل

بلند و پاکیزہ چند جذبے　　　عمل کی دوچار منزلیں طے
مرے رفیقو سوائے اس کے　　　نہیں ہے کچھ زندگی کا حاصل

سیاہ چیزوں کو نور دے کر　　　فسردگی کو سرور دے کر
دلوں کو ذوقِ حضور دے کر　　　غروب ہوتا ہے ماہِ کامل

مری محبت فنا نہ ہو گی　　　سدا رہے گی یہ شمع جلتی
یقیں ہے اوجِ فلک پہ وہ بھی　　　نہ ہو گا یاروں سے اپنے غافل

۱۹۳۶ء، میرٹھ

میں نے کیا

شمع کے چاروں طرف جیسے ہو پروانے کا رقص
ایسا اک رقصِ ہلاکت آفریں میں نے کیا

کیا بتائیں کیوں ہماری خانہ بربادی ہوئی
صدق نیت سے عمل ، اے ہم نشیں ، میں نے کیا
مالِ دنیا کی ہوس مطلق مرے دل میں نہیں
میں سمجھتا ہوں جہاں زیرِ نگیں میں نے کیا
سوزِ دل سے زندگی میں روشنی پیدا ہوئی
خاک کو گویا شرارِ آتشیں میں نے کیا
ناز برداری نے میری خوب سکھلایا ہے ناز
مرحبا مجھ کو کہ اس کو نازنیں میں نے کیا
یوں بھی تھی اس کی نگاہوں میں دل آویزی بہت
پر قیامت ہوگئیں جب شرگیں میں نے کہا
اک عنایت اور فرمائی ہے ، اب میں کیا کروں
جب کہ سب کچھ نذر لطفِ اولیں میں نے کیا

۱۹۳۹ء اوکھلا

عظمت فروش

لئے پھرتا ہوں کندھوں پر ہمیشہ سکڑ دادا کی ، پردادا کی لاشیں
بزرگوں کی بزرگی بیچتا ہوں کوئی چکھے میری عظمت کی قاشیں

بزرگی دشمنوں کی سب ہے جھوٹی بزرگی میری سب کی سب ہے سچی
مرے دشمن کی لاشیں سڑ چکی ہیں مری لاشیں ہیں سب لاشوں میں اچھی

۱۹۸۲ء کراچی

سفر امریکہ کی ڈائری' چراغ اور کنول' نئے خاکے' کومیلا سے اورنگی تک

خان بہادر نواب اسعد اللہ خاں

خان بہادر نواب احمد اللہ خاں کے بڑے صاحبزادے نواب اسعد اللہ خاں ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد عربی، فارسی اور طب میں دسترس حاصل کی۔ فطرتاً طبیعت نیک پائی تھی۔ شروع ہی سے جملہ انسانی صفات کا پیکر تھے۔

آپ نے اپریل ۱۸۶۵ء میں انگریز حکومت کی ملازمت اختیار کرکے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ محکمہ نمک شمالی ہند میں ایک معزز عہدہ ایسسٹنٹ پٹرول پر تقرر ہوا۔ ایک سال بعد اس عہدہ پر مستقل ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے اسی محکمہ میں سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ حکومت وقت نے ۲ جنوری ۱۸۸۸ء کو بہ صلہ حسنِ خدمت خان بہادر کا خطاب عطا فرمایا۔ اس موقع پر ایک یادگار جلسہ تہنیت ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا جس میں مختلف اداروں کی طرف سے تہنیت نامے پیش کئے گئے۔ آپ کی ذاتی قابلیت اور خیرسگالی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جنوری ۱۸۹۵ء میں موروثی خطاب (نوابی) پیش کرکے عزت افزائی کی گئی۔ جون ۱۸۹۷ء میں ملکہ ہند کوئین وکٹوریہ نے خدمات کے اعتراف میں سارٹی فکٹ عطا کیا۔

نواب اسعد اللہ خاں اپنے والد کے حقیقی جانشیں ثابت ہوئے۔ میونسپل بورڈ و ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر رہے۔ اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کئے گئے اور صوبہ کے میونسپل بورڈوں کی جانب سے لیجس لیٹیو اسمبلی میں نمائندگی کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ حکام اور شہری دونوں بڑی عزت کرتے تھے۔

نواب صاحب گھوڑے کی سواری کے اس حد تک ماہر تھے کہ سو سو میل کا سفر طے کرلیتے تھے۔ شکار کے بیحد شوقین تھے۔ شیر کے شکار کے لئے مشہور تھے۔ آپ کی کوٹھی کے بعض کمرے ہرن، چیتہ، نیل گائے، بارہ سنگھا، ریچھ، بھیڑیا، بگھیرہ، چرخ، ناکہ اور شیر وغیرہ کی کھالوں، سینگوں، سروں اور چہروں سے آراستہ رہتے تھے۔ حکمت کا فیض بھی آپ سے جاری تھا۔ دین و دنیا کی نعمتوں سے بہرہ ور تھے۔ اگرچہ مغربی لباس میں ملبوس نظر آتے تھے لیکن ایک بڑے باخدا اور صاحبِ نسبت مخص تھے۔

خان بہادر اسعد اللہ خاں کے دو صاحبزادے سعید اللہ خاں اور سعد اللہ خاں تھے۔ اول الذکر عین نوجوانی میں وفات پاگئے۔ آپ کی اکلوتی صاحبزادی رشیدہ بانو، خان بہادر اقبال احمد خاں کلکٹر و مجسٹریٹ صوبہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی زوجہ تھیں۔ سعد اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور اسی عہدے پر خدمات انجام دیتے ہوئے جھانسی میں ۱۹۲۱ء میں مالکِ حقیقی سے جاملے۔

خان بہادر اسلام نبی خان



خان بہادر اسلام نبی خاں

نواب اسلام اللہ خان صاحب کے چوتھے صاحبزادے اسلام نبی خان کی ولادت ۱۸۸۵ء میں میرٹھ میں ہوئی۔ وہ نواب خیر اندیش خاں میرٹھی کی اولاد میں سے تھے جن کو اورنگ زیب بادشاہ نے میرٹھ میں جاگیر عطا کی تھی اور اناوہ کے قلعہ کا نگراں مقرر کیا تھا۔ نواب اسلام اللہ خاں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ انگریزوں کے دور حکومت میں پہلے ہندوستانی تھے جنہیں سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر کیا گیا تھا۔

اسلام نبی خاں نے ۱۹۰۶ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے گریجویشن کیا اور اگلے سال ہی اپنے خاندانی وقار کی وجہ سے یوپی کی صوبائی حکومت میں شامل کر لئے گئے۔ وہ اعلیٰ مناصب پر کامیابی کے ساتھ فرائض ادا کرتے ہوئے ۱۹۳۲ء میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد حکومتِ ہند نے آپ سے درخواست کی کہ وہ کچھ عرصے سینئر جوڈیکل آفیسر کی حیثیت سے حکومت کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔ اس وقت دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے ہزاروں سول اور کریمنل مقدمات التواء میں پڑے ہوئے تھے۔ اسلام نبی خاں صاحب نے مختصر وقت میں ان کے فیصلے کئے۔ آپ کی ان خدمات کو نہایت قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا۔ ہندوستان کے وائسرائے کی طرف سے ۱۹۴۵ء میں "خان بہادر" کا خطاب آپ کی خدمات کا سرکاری سطح پر اعتراف تھا۔

اسلام نبی خان صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی کے استحکام کے لئے بھی کام کیا۔ آپ نے یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے لئے سرگرمی سے حصہ لیا اور اعزازی خان کی حیثیت سے ڈاکٹر سرضیاء الدین کی شروع کی ہوئی عطیاتی مہم میں پورے اخلاص کے ساتھ جدوجہد کی۔

موصوف نے ۱۹۵۶ء میں ہندوستان سے ہجرت کی اور پاکستان آگئے۔ یہاں آپ نے ایک اجتماع میں زبیری ویلفیئر ٹرسٹ کی تجویز پیش کی۔ اس سلسلے میں اپنی قیام گاہ پر زبیری برادری کے نمائندہ افراد کی ایک میٹنگ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں طلب کی اور ٹرسٹ کے لئے بیس ہزار روپے کے عطیہ کا اعلان کیا۔ زبیری ایسوسی ایشن نے آپ کی تجویز کو روبہ عمل لانے کے لئے لائحہ عمل تیار کیا اور ٹرسٹ قائم ہوگیا۔ نومبر

۱۹۸۵ء میں وزیرِ رسد مقرر ہوا۔

خان بہادر اسلام نبی خان نے چھیانوے سال کی عمر میں ۱۹۸۰ء میں انتقال کیا۔ آپ نے اپنی زندگی ایک بااصول شخص کے طور پر گزاری اور تحریکِ آزادی کے لئے گرانقدر خدمات انجام دیں جو آزادی کے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔

تحریکِ آزادی [illegible]

اشرف زمانی و حمید النساء ، رسا

نواب محمد اسحق خاں نے اپنے بڑے بیٹے محمد اسمٰعیل خاں کو کم عمری ہی میں تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا تھا، جب وہ بیرسٹری کی ڈگری لے کر واپس آئے تو ان کے والد کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ان کی شادی کے لئے کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کریں جو مشرقی اقدار کا پیکر ہو تاکہ بیٹے کی زندگی سے طویل عرصے تک بیرونِ ملک قیام کے اثرات کا ازالہ ہو سکے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی سے مشورہ کیا۔ مولانا نے کئی سال نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ گزارے تھے، جب وہ اپنی زندگی سکون سے گزارنے کے لئے دلی کو چھوڑ کر جہانگیر آباد چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں مولانا حالی، نواب صاحب کے چھوٹے بیٹے محمد اسحق خاں کے اتالیق بھی تھے۔ مولانا حالی نے کہا کہ اسمٰعیل کے رشتے کے لئے ان کی نظر میں ایک مثالی لڑکی موجود ہے۔

مولانا حالی قومی اصلاح کی جدوجہد میں سید احمد خاں کی تحریک کے بہت سرگرم کارکن تھے۔ قومی مقاصد کے حصول کے لئے سارے ملک میں دورے کرتے تھے۔ حیدر آباد دکن میں ان کی ملاقات ریاست کے ایک بہت کامیاب وکیل محمود جان صاحب سے ہوئی۔ وکالت کے پیشے سے منسلک ہونے کی وجہ سے وہ ریاست حیدر آباد کے امراء اور عمال کی نسبت بہت زیادہ روشن خیال تھے۔ ان کی بیٹی حمید النساء صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتی تھیں اور مولانا حالی کا کافی کلام انہیں ازبر تھا۔ مولانا نے محمود جان صاحب کی اسی بیٹی کا نام تجویز کیا۔ نواب صاحب نے بیٹے کی رضامندی حاصل کر کے مولانا سے ہی درخواست کی، وہ پیغام لے کر حیدر آباد جائیں۔ مولانا حالی کی وکالت سے رشتہ فوراً طے ہو گیا۔ اس طرح ملک کی سیاست میں ایک بے لوث کردار ادا کرنے والے نوجوان کو ایک مثالی رفیقۂ حیات کا ساتھ میسر آ گیا۔

حمید النساء جب بیاہ کے میرٹھ آئیں تو سسرال میں بڑے چھوٹے سب ہی ان کے گرویدہ ہو گئے۔ خود نواب اسحق خاں ان کے سب سے بڑے قدردان تھے۔ نواب صاحب نے انہیں فارسی پڑھانا شروع کی اور انگریزی کی ذمہ داری ان کے شوہر کے سپرد کی۔ آہستہ آہستہ ان سے مضامین لکھوانا شروع کئے جن کو نواب صاحب دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔ اس طرح حمید النساء صاحبہ کی زندگی میں آنے والی ذمہ داریوں کے لئے مناسب تربیت کا انتظام ہو گیا۔ نواب محمد اسحق خاں نے اپنے بیٹے اور بہو کی ازدواجی زندگی کے تقریباً دس سال بعد وفات پائی۔ ان کے بعد ریاست کے انتظام کی تمام ذمہ داری ان کے بیٹے محمد اسماعیل خاں کو اٹھانی پڑی۔ چند سال بعد جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی اور اسمٰعیل خاں صاحب نے وکالت کو خیر آباد کہا اور سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو ان کی بیگم کے پرجوش تعاون نے اس راستے کی ہر مشکل کو آسان کر دیا۔ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے سبب وہ انگریزی میں اظہار

خیال پر زیادہ قدرت رکھتے تھے۔ اس لئے اردو میں اپنی سیاسی خط و کتابت کے لئے انہوں نے اپنی بیگم پر انحصار کیا۔ اس طرح دونوں کو ایک دوسرے کے سیاسی نظریات سمجھنے اور ذہنی قرب حاصل کرنے میں کافی سہولت ہو گئی۔ وہ ہر قدم پر نواب اسمٰعیل خاں کے ساتھ رہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کی ایک نہایت منفرد ازدواجی، ذہنی اور سیاسی رفاقت تھی۔

بیگم حمید النساء نے مسلم خواتین میں وقت کے تقاضوں کا شعور پیدا کرنے کے لئے انتھک محنت کی۔ انہوں نے انجمن اصلاح الخواتین کی داغ بیل ڈالی تاکہ خواتین کی معاشرتی محرومیوں کا جائزہ لے کر اصلاح کے قابل عمل منصوبے بنائے جا سکیں۔ خواتین کی خاصی بڑی تعداد نے اس میں شمولیت اختیار کی۔ انہوں نے خواتین میں نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے "خادمانِ ملت" کے نام سے نوجوان لڑکیوں کی ایک تنظیم بنائی۔ ان لڑکیوں کی تربیت کا مناسب اہتمام بھی کیا گیا۔ انجمن اصلاح الخواتین نے اتنی ترقی کی، کہ اس کے سالانہ اجلاسوں میں ملک کی نامور خواتین مدعو کی جاتی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور و معروف بہن آبرو بیگم اور بیگم عبداللہ ہارون بھی سالانہ اجلاسوں کی صدارت کے لئے میرٹھ آئیں۔ اس زمانے میں مسلم خواتین میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی، اس لئے بیگم صاحبہ نے اپنی قیام گاہ "مصطفیٰ کاسل" کے وسیع دالانوں میں لڑکیوں کے لئے مدرسہ قائم کیا۔ طالبات کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے یہ مدرسہ "مصطفیٰ کاسل" کے عقب میں نواب صاحب کی ایک اور کوٹھی میں منتقل کر دیا گیا۔ بیگم صاحبہ کے انتقال کے چند سال بعد مدرسے کو شہر کے وسط میں منتقل کیا گیا جہاں وہ اب حمیدیہ گرلز ہائی اسکول کے نام سے مشہور ہے۔

بیگم نواب محمد اسمٰعیل خاں کی ان تمام خوبیوں پر مستزاد ان کا ادبی ذوق تھا۔ شعر بھی اہتمام سے کہتی تھیں اور پھر پڑھنے کا انداز بھی بہت دلنشیں تھا۔ میرٹھ میں شعر کہنے والی خواتین کا ان کے گرد ہالہ سا بن گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے مسلم لیڈیز کانفرس کے موقع پر ایک مشاعرہ کرایا جس میں میرٹھ کے علاوہ دہلی اور بریلی کی شاعرات نے بھی شرکت کی جن میں بیگم تیمور جہاں حجاب دہلوی، بلقیس جمال بریلوی اور رابعہ نہاں وغیرہ قابل ذکر تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں بلند شہر میں خواتین کا ایک مشاعرہ ہوا جس کی صدارت کے لئے بیگم اسمٰعیل خاں کو مدعو کیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۳۹ء میں مراد آباد میں خواتین نے صنعتی نمائش کے ساتھ ایک نعتیہ مشاعرے کا اہتمام کیا اس کی صدارت بھی بیگم صاحبہ نے فرمائی۔ آپ رسا تخلص کرتی تھیں۔ بعض قومی نظموں کے لئے انہوں نے "مسلمہ" کا تخلص بھی اختیار کیا تھا۔ بدیہہ گوئی پر بھی بیگم صاحبہ کو خاصی قدرت تھی۔ ایک دفعہ وہ مسلم خواتین کے ایک جلسے میں شرکت کے لئے لکھنؤ گئیں۔ جلسے کے آغاز سے ذرا پہلے ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ بیگم انعام حبیب اللہ جو منتظمین میں تھیں اور اپنی خوش لباسی کے لئے مشہور تھیں، خاصے رنگین کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ انہوں نے اپنی پچ رنگی چھتری کھول لی۔ بیگم صاحبہ نے فوراً ان پر یہ شعر کہا :

یہ باران رحمت، یہ انعام رنگیں
گھٹا کی پری بن کے چھائے کھڑی ہیں

۱۹۳۱ء میں میرٹھ میں مسلم لیگ کا ایک نہایت شاندار جلسہ ہوا۔ جس کی انفرادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مردوں کے ساتھ خواتین نے بھرپور طریقے پر حصہ لیا تھا۔ خواتین اور مردوں کے حصوں کو قناتوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔ پردے کا پورا انتظام تھا۔ جلسہ کی صدارت نواب محمد اسمٰعیل خاں کر رہے تھے۔ مہمانِ خصوصی قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ مسلم لیگ کے ممتاز زعماء بھی اس جلسے میں شریک تھے۔ اس اجلاس میں خواتین کی طرف سے خطبہ استقبالیہ بیگم صاحبہ نے پیش کیا۔ مولانا ظفر علی خاں جیسی شخصیت نے بھرپور انداز میں ان کے خطاب کو سراہا۔ خود قائداعظم اس خطبے سے بہت متاثر ہوئے جس کا ایک ایک لفظ بیگم صاحبہ کی ذہانت، فہم و فراست اور سیاسی سوجھ بوجھ کا آئینہ دار تھا۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں کہا "بیگم اسمٰعیل خاں کی تقریر سننے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری خواتین سیاسی شعور میں مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

اس تاثر کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور کرنے کے لئے لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو قائداعظم نے دیگر خواتین کو جو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں شمولیت کے اعزاز کی خواہاں تھیں، نظرانداز کر کے صرف بیگم اسمٰعیل خاں کو رکنیت کے لئے نامزد کیا۔ ان سے پہلے بیگم محمد علی وہ واحد خاتون تھیں جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا چنانچہ انہوں نے بیگم محمد علی کے ساتھ لاہور میں ورکنگ کمیٹی کے ایک جلسے میں شرکت کی۔ اسی سال چند مہینے بعد وہ اپنی پینتالیس سالہ زندگی گزارنے کے بعد جو ہر شعبے میں نمایاں کارکردگی سے مزین تھی، حق تعالیٰ کی طرف رجوع کر گئیں۔

بیگم صاحبہ کی دل آویز شخصیت کا اندازہ کرنے کے لئے بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کے اس خط سے جو انہوں نے نواب اسمٰعیل خاں صاحب کو ان کی وفات پر لکھا، ایک اقتباس کافی ہے۔ انہوں نے لکھا تھا۔ میں بہ مشکل کسی ایسی خاتون کا تصور کر سکتی ہوں جو اس قدر اعلیٰ صفات کی حامل ہو اور جس کو اپنے ہم جنسوں سے اس قدر ہمہ گیر محبت حاصل ہوئی ہو۔ ایسی نکتہ چیں دنیا میں جہاں انسان اپنے عزیز ترین دوستوں کی عیب جوئی کا تختہ مشق بنا رہتا ہے، میں نے تمہاری رفیقِ حیات کے لئے تحسین و آفرین کے علاوہ کوئی بات نہیں سنی۔ ان کی خوش خلقی، حسنِ سیرت اور دل کش اطوار، نکتہ چینی کو ناممکن بنا دیتے تھے۔ وہ حسنِ کردار کا ایک ایسا شگفتہ پھول تھیں جس کی خوشبو سے ہر دل میں ان کے لئے محبت کے جذبات موجزن ہو جاتے تھے۔

تذکرہ شاعراتِ اردو کے مولف محمد جمیل احمد نے تحریر کیا ہے کہ "آپ کے دل میں بڑا قومی و اسلامی درد تھا۔ ادب سے آپ کو خاص شغف تھا۔ آپ کے ادبی کارنامے اور قومی جذبات قابلِ یادگار ہیں۔ آپ کے تین بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ تینوں بیٹوں نے بھی یادگار خدمات انجام دی ہیں۔ نمونہ کلام:

نعت

سرِ عرش پہنچا پیامِ محبت زہے عزت و احترامِ محبت
محمدؐ گلِ گلشنِ حسن و خوبی بسا جن کے دم سے مشامِ محبت
وہی ہیں فقط محرمِ رازِ الفت "محمدؐ سے پوچھو مقامِ محبت"
سنو نامِ احمدؐ تو سر کو جھکا کے پڑھو صدقِ دل سے سلامِ محبت
ز راہِ وفا موت سے پہلے مرجا یہی ہے مگر حکمِ عامِ محبت
رسا کی رسائی ہو اس جا پہ یارب جو ہے منبعِ لطفِ عامِ محبت

مسلمہ کی دعا

چند اشعار

دیتا ہے مشکلات میں تسکین تو مجھے پیہم سنا کے مژدۂ لاتقنطو مجھے
یارب عمل کی جنگ میں کر سرخرو مجھے دے عائشہؓ کا قلب خدیجہؓ کی خو مجھے
ہو میرا ہاتھ اور تری توحید کا علم خوفِ حریف ہو نہ خیالِ عدو مجھے
میں مسلمہ ہوں لاج مری تیرے ہاتھ ہے دنیا میں اور دین میں دے آبرو مجھے

اگر دل سے رہا قانع تو شاہِ خسرواں ہوگا تو کل دولتِ دراین کا طبل و نشاں ہوگا
خدا کے واسطے اے مسلم خوابیدہ اٹھ تو بھی ترا یہ خوابِ غفلت ایک دن خواب گراں ہوگا
مصیبت ہے کہ نسواں میں نہیں احساسِ خودداری نہ ہوگا اب اگر پیدا تو کب اے خواہراں ہوگا
اگر ہو جائے پیدا تیرے دل میں جذبۂ خدمت تو اے خاتونِ مسلم تجھ سے روشن اک جہاں ہوگا

یہ نظم لاہور کے اجلاس میں پڑھی گئی۔ شان لیگ مولفہ سیدہ ریاض فاطمہ صفحہ گیارہ، بارہ میں بھی شامل ہے۔

خدا کا شکر ہے اب اپنا مستقبل درخشاں ہے
ضیائے لیگ سے دنیائے مسلم میں چراغاں ہے
شکوہ شانِ مسلم لیگ سے خیرہ ہوئیں آنکھیں
عدو اب محوِ حیرت ہے ہراساں ہے پریشاں ہے
مچی ہے خانۂ دشمن میں ہلچل کیا قیامت ہے

کہ ایک دم بڑھ گئے مسلم یہ کس آفت کا ساماں ہے
ہمارے قائدِاعظم وہ دانائے سیاست ہیں
کہ جن کے سامنے گاندھی بھی اک طفلِ دبستاں ہے
جو مستورات کی خدمت پہ ہے یوں معترض شاید
نہیں اسلام کی تاریخ سے واقف وہ ناداں ہے
ہمارا دین خطرہ میں ہو اور ہم محوِ رعنائی
ہمارے واسطے زیور نہیں اب زنجیرِ زنداں ہے
رسا اک آگ لگ جائے نہ کیوں سارے زمانے میں
کہ ہر مسلم خدا کے فضل سے شعلہ بداماں ہے



اصلاح الدین

اصلاح الدین

ہاکی برصغیر کا محبوب کھیل ہے۔ محترم علاؤ الدین صدیقی ابن جناب حکیم الدین کے نامور صاحبزادے، عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی اصلاح الدین نے اپنے برق رفتار کھیل سے دنیا بھر کے شائقین کی توجہ حاصل کی اور ایک عرصے تک مرکزِ نگاہ بنے رہے۔ انھوں نے اپنے کھیل کے معیار کو مسلسل بڑھایا اور مخالف ٹیموں کی راہ میں آہنی دیوار بنے رہے۔

جناب اصلاح الدین کی ولادت ۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ ایک سال بعد ہی آپ کے خاندان نے پاکستان ہجرت کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۶۳ء میں میٹرک اور ۱۹۶۸ء میں اسلامیہ کالج کراچی سے بی اے کیا۔ ۱۹۶۷ء میں محکمہ کسٹمز میں ملازمت اختیار کر کے اس کی مضبوط ہاکی ٹیم میں شامل ہوئے اور اسی سال بین الاقوامی ہاکی میں پہلا قدم رکھا۔ قومی اور بین الاقوامی ہاکی مقابلوں میں بارہ سال تک ایک فاتح کی سی زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۹۷۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس تمام عرصے میں اصلاح الدین صاحب نے نہ صرف پاکستان کا نام روشن کیا بلکہ ہاکی کے فروغ کے لئے یادگار خدمات انجام دیں اور عالمی سطح پر مقبولیت بھی حاصل کی اور ہاکی کے شائقین کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

جناب اصلاح الدین نے ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۸ء کے ایشین گیمز میں پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۸ء کے عالمی کپ اور ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۶ء کے اولمپک مقابلوں میں پاکستان کی طرف سے کھیلے۔ ۱۹۷۵ء میں عالمی ہاکی الیون اور ۱۹۷۸ء میں ایشین ہاکی الیون میں شامل رہے۔

آپ نے ایک سو تین بین الاقوامی ٹیسٹ میچ کھیلے جن میں اصلاح الدین نے ایک سو سترہ گول کئے۔ یہ کسی بھی پاکستانی کھلاڑی کا ایسا انفرادی ریکارڈ ہے جو آج بھی ہاکی پلیئرز کے لئے قابلِ رشک ہے۔ اس عرصہ میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۸ء تک یعنی چار سال مسلسل پاکستان کی قومی ہاکی ٹیم کے کپتان رہے۔ آپ کی قیادت میں پاکستان نے ۵۲ بین الاقوامی میچ کھیلے جن میں سے ۴۳ میچوں میں پاکستانی ٹیم کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس قابلِ فخر ریکارڈ سے اصلاح الدین صاحب کی قائدانہ صلاحیتوں اور موثر حکمتِ عملی ترتیب دینے کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی قیادت میں پاکستانی ٹیم کو متعدد گولڈ میڈل حاصل کرنے کا اعزاز حاصل

رہا۔ ۱۹۷۸ء میں فرسٹ چیمپئن ٹرافی بھی حاصل کرنے کا اعزاز آپ کو حاصل ہے۔

اصلاح الدین صاحب کا شمار پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے بہترین برق رفتار ونگرز میں ہوتا ہے۔ پنلٹی کارنر کو روکتے وقت پنلٹی کارنر لگانے والے کھلاڑی پر جھپٹنے کی برق رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جرمنی کی ٹیم نے ایک دفعہ اعتراض کیا کہ وہ کوئی نشہ کر کے دوڑتے ہیں۔ اس پر چھ ڈاکٹروں پر مشتمل میڈیکل بورڈ نے آپ کا معائنہ کیا۔ کمپیوٹروں نے بتایا کہ سولہ گز کی ڈیش میں اصلاح الدین کی رفتار گیند کی رفتار سے دوگنی ہوتی ہے۔

آپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ہاکی کے فروغ کے لئے مسلسل کام کیا۔ ہاکی ٹیم کے مینجر اور سلیکشن بورڈ کے رکن کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ چیف کوچ بھی رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت اچھے اور سلجھے ہوئے مبصر بھی ہیں۔ سید قاسم محمود کے مطابق ریڈیو اور ٹی۔وی پر اپنے مخصوص برق رفتار اسلوب میں کھیل پر رواں تبصرہ کرتے ہیں۔

تقریباً تمام دنیا کا سفر کر چکے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں اصلاح الدین صاحب کی خدمات کے اعتراف میں حسن کارکردگی کا صدارتی اعزاز دیا گیا اور ۱۹۹۷ء میں اے۔بی۔ آئی سوسائٹی امریکہ نے مین آف دی ایئر کا اعزاز دیا۔ آپ کے لاتعداد انٹرویوز شائع ہو چکے ہیں۔ مختلف مضامین میں بھی آپ کی خدمات کو ماہرین نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ محکمہ کسٹم سے وابستگی برقرار ہے۔

اصلاح الدین صاحب ذاتی طور پر انسانی خوبیوں کا پیکر ہیں۔ خوش اخلاقی مزاج کا حصہ ہے۔ کرکٹ اور اسکواش سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اپنے تجربات کو کتابی شکل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

خان بہادر شیخ الٰہی بخش

آپ شیخ مدار بخش صاحب کے فرزند اکبر تھے۔ آپ کا نام ہندوستان سے عرب تک کارِ خیر اور اولوالعزمیوں کی وجہ سے مشہور ہوا اور قومی و ملکی بے لوث اور مسلسل خدمات نے اس کو روشن سے روشن تر کر دیا تھا۔ شیخ الٰہی بخش صاحب کا رجحان ابتدا ہی سے مذہب کی طرف زیادہ رہا۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی، خیرات و زکوٰۃ اور دیگر کار خیر میں حصہ لینا اپنے لئے باعثِ نجات جانتے تھے۔ آپ کے مواضعات سے جو غلہ، ترکاری، پھل اور دیگر اشیاء آتیں، پہلے ان کی زکوٰۃ نکالی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ خاندان کے لئے جو چیز بھی خریدی جاتی اس پر زکوٰۃ نکالی جاتی نیز جو لگان اور کرایہ کی رقم آتی اس پر بھی زکوٰۃ لازمی نکالی جاتی تھی۔ نہایت عبادت گزار تھے۔ نام و نمود سے نفرت کرتے تھے اور انسانیت کی خدمت کو سعادت سمجھتے تھے۔

خان بہادر شیخ الٰہی بخش ایک کاروباری انسان تھے اور وقت کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے ہر کام کے لئے آپ نے اوقات کا تعین کیا ہوا تھا۔ آپ کے کاموں کو سرانجام دینے کے لئے جو عملہ مقرر تھا، وہ بھی پاکیزہ اور اعلیٰ مرتبت اشخاص پر مشتمل تھا۔ اس میں مولوی رعایت الحق صاحب (حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے استاد)، مولوی عبدالحق صاحبؒ (حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے والد ماجد) اور مولوی احمد علی محدث (اپنے زمانہ میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے) کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

خان بہادر موصوف کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ آپ کے داہنے پیر کے تلوے میں پدم تھا جو اقبال مندی اور فراوانیٔ دولت کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ اپنی دولت کو آپ نے خیر و خیرات کے لئے وقف رکھا اور یہ سلسلہ تمام عمر جاری رہا۔ نیکی کے کاموں کی نمائش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے آپ کے مخفی عطیات کا علم بہت بعد میں ہوا۔

شیخ الٰہی بخش صاحب کے ہزارہا کارِ خیر کے واقعات موجود ہیں۔ آپ نے ہی میرٹھ اور دیگر شہروں میں بکثرت مساجد تعمیر کرائیں۔ احاطہ عدالت میرٹھ میں ایک عمارت اہلِ مقدمہ کی آسائش کے لئے بنوائی اور ۷۷-۱۸۷۶ء کی خشک سالی کے زمانے میں میرٹھ میں ایک بڑا محتاج خانہ قائم کیا۔ اس خدمت کے اعتراف میں حکومت وقت نے آپ کو خلعتِ فاخرہ اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ حضرت شاہ پیر صاحبؒ میرٹھی کی تعمیر کردہ مسجد "اندرون شاہ پیر دروازہ میرٹھ کی درستگی ۱۲۸۰ھ میں کرائی۔ نو محلہ شہر میرٹھ میں قاضی وقت نے ایک چھوٹی مسجد تعمیر کرائی تھی جو اچھی حالت میں نہیں تھی۔ شیخ الٰہی بخش صاحب نے کثیر لاگت سے اس مسجد کی جگہ مع اونچی کرسی کرا کر موجودہ عالی شان اور خوبصورت مسجد ۱۲۹۳ھ میں تعمیر کرائی جو اب اونچی مسجد کہلاتی ہے۔ خان بہادر موصوف نے "نہرِ زبیدہ" واقع مکہ معظمہ کی مرمت کے لئے دو

قسطوں میں ایک لاکھ روپے کی گرانقدر رقم عنایت فرمائی۔ اکثر شرفاء و غرباء کی مستقل تنخواہیں بھی مقرر کی ہوئی تھیں۔

خان بہادر شیخ الٰہی بخش صاحب کا سب سے اہم اور یادگار کارِ خیر "شاہجہانی جامع مسجد دہلی" کی واگزاری ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ناکام ہو جانے کے باوجود انگریزوں کو بہت جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس لئے انہوں نے جذبہ انتقام کے تحت دہلی کی عظیم الشان و بے نظیر جامع مسجد کی بے حرمتی میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی تھی۔ اس کو فوج کے گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا تھا۔ اس بات کے چرچے ہونے لگے تھے کہ اس کو گرجا گھر میں تبدیل کر دیا جائے مگر اس اسکیم کو روبہ عمل نہ لایا جا سکا۔ فوجی حکام نے قلعہ دہلی کی مدافعت کے پیشِ نظر ان تمام عمارتوں، حویلیوں اور بازاروں کو منہدم کرنا شروع کر دیا۔ قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان گنجان علاقہ تھا۔ قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان جو میدان اس وقت موجود ہے اور جس کو پریڈ گراؤنڈ بھی کہا جاتا تھا، وہ انہیں عمارتوں کی تباہی کا نوحہ خواں ہے۔ بعد میں یہ چرچے بھی ہونے لگے کہ جامع مسجد دہلی کو مسمار کر کے یہاں بھی میدان بنا دیا جائے۔ یہ خبریں مسلمانانِ ہند کے دلوں پر بجلی بن کر گریں۔ دہلی کے مسلمانوں نے بہت سی ایک درخواست حکامِ اعلیٰ کو پیش کی کہ اس مسجد کے انہدام کے احکام منسوخ کئے جائیں۔ یہ درخواست بیکار گئی۔ اس صورتِ حال میں مسلمان شیخ الٰہی بخش صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کی دو وجوہات بتائی گئی ہیں۔ اول یہ کہ فوجی ٹھیکیدار ہونے کی وجہ سے شیخ صاحب کے تعلقات فوجی و سول حکام سے بہت اچھے تھے اور دوم یہ کہ آپ کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ شیخ صاحب خود اس صورتِ حال سے پریشان تھے۔ چنانچہ آپ نے انگریزی حکام سے بات چیت کا آغاز کیا۔ حکامِ وقت نے بتایا کہ مسجد کے انہدام کے لئے جو تیاریاں کی گئی ہیں اور فوج کے قیام کی وجہ سے جو اخراجات انگریزوں کو اٹھانے پڑے ہیں اگر شیخ صاحب اس کی ادائیگی کر دیں تو مسجد کے واگزاشت کے سوال پر غور کیا جا سکتا ہے۔ شیخ الٰہی بخش صاحب نے اس موقع کو سعادت سمجھتے ہوئے آمادگی ظاہر کر دی اور شیخ صاحب نے کئی لاکھ روپے کی خطیر رقم پیش کر کے جامع مسجد کو واگزاشت کرا لیا۔ اس کے بعد مسجد کی صفائی پر بھی آپ نے کافی رقم خرچ کی اور جب ان امور سے فراغت پائی تو صلاح و مشورے سے دہلی کے چند مسلمانوں کی ایک کمیٹی اس کے انتظامات اور دیکھ بھال کے لئے مقرر کر دی۔ شیخ صاحب کے اس عظیم کارِ خیر کے متعلق "صحیفہ زریں" شائع کردہ حکومت ہند صفحہ ۲۰۸ پر جہاں اس خاندان ریاست لال کرتی کی خدمات کا ذکر ہے، وہاں ذیل عبارت تحریر ہے:

H#ELAHI#BUKSH#WITH#HIS#INTELLEGENCE#AND#WISDOM#

"SHEIK

SAVED#THE#JUMA#MASJID#DELHI#DESTRUCTION."

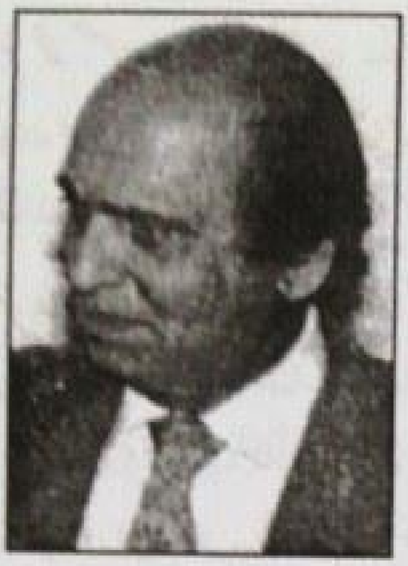
اسی طرح صحیفہ زریں اردو مطبوعہ منشی نولکشور لکھنؤ کے صفحہ ۲۰۸ پر تحریر ہے "شیخ الٰہی بخش نے جامع

مسجد دہلی کو اپنی فرزانگی سے غدر کے پر آشوب زمانہ میں منہدم ہونے سے محفوظ رکھا"۔

اس واقعہ کی شہرت تمام ہندوستان میں ہو گئی اور آج تک لوگ شیخ الٰہی بخش صاحب میرٹھی کی اس دریا دلی اور نیکی کے تذکرے کرتے رہتے ہیں۔ اس عظیم خدمت کے بعد آپ کے چند احباب نے زور دیا کہ جامع مسجد میں کسی مناسب جگہ پر یہ کارنامہ ایک سنگِ مرمر پر کندہ کرا کر نصب کرا دیا جائے تاکہ یادگار رہے مگر چونکہ آپ نام و نمود کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے اس پر راضی نہیں ہوئے۔

خان بہادر شیخ الٰہی بخش صاحب نے ۲۱ جولائی ۱۸۸۲ء مطابق ۴ رجب المرجب ۱۳۰۰ھ کو انتقال فرمایا اور حضرت شاہ پیر صاحبؒ کے جوار میں اپنے خاندانی قبرستان میں اپنے والد کے متصل دفن ہوئے۔ آپ کے انتقال پر مسلمانانِ میرٹھ نے ہی نہیں پوری ملت اسلامیہ نے یادگار خراجِ عقیدت پیش کیا۔

حیاتِ بشیر مؤلفہ سید حبیب الرحمٰن شاہ



انتظار حسین

انتظار حسین

محترم انتظار حسین اس عہد کے اہم ترین اور معتبر افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ہی نہیں بلکہ جہاں بھی اُردو افسانے سے دلچسپی رکھنے والے افراد موجود ہیں وہاں انتظار حسین صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ میرٹھ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ محترم انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا آغاز وہاں سے ہوا۔

محترم انتظار حسین کی ولادت ۲۱ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ڈبائی ضلع بلند شہر میں ہوئی۔ آپ کے والد مذہبی آدمی تھے اور مذہباً شیعہ تھے جبکہ باقی تمام افرادِ خانہ اہلِ سنت تھے۔ اس ماحول میں تقریباً دس گیارہ سال کی عمر تک ڈبائی میں رہے۔ یہاں کے نقوش آپ کے ذہن میں آج بھی تازہ ہیں۔ دس گیارہ سال شہرِ مولد میں گزار کر ہاپوڑ آ گئے۔ یہاں تعلیمی سلسلہ قائم رکھتے ہوئے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد میرٹھ پہنچے اور یہاں میرٹھ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں پروفیسر کرار حسین پڑھا رہے تھے۔ جن کی شخصیت سے آپ متاثر بھی ہیں۔ میرٹھ کالج سے ایم۔ اے کیا ہی تھا کہ تقسیم ملک کا وقت آ گیا اور آپ نے میرٹھ سے پاکستان ہجرت کی۔

آپ ابتداء سے ہی ادبی مزاج رکھتے تھے۔ دورانِ تعلیم لکھنے لکھانے کا شوق پیدا ہوا اور ادیب بننے کی خواہش روز بروز بڑھتی گئی۔ آپ کی ابتدائی تحریریں ''قیوما کی دکان'' اور ''استاد'' تقسیم ملک کے وقت فسادات کے دوران میرٹھ میں ہی لکھی گئیں۔ ان تحریروں کے حوالے سے افسانہ نگاری کا شوق بڑھا اور آج انتظار حسین ایک دبستان کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ انتظار حسین صاحب مسلم کلچر کے ترجمان ہیں۔ ان کا کلچر کا تصور محدود نہیں ہے۔ ماضی کی بازیافت اور جڑوں کی تلاش کا پیچیدہ سوال انتظار صاحب کے فکشن کا مرکزی سوال ہے۔

انتظار حسین صاحب کی خدمات کا اعتراف ہر طرف کیا جا رہا ہے۔ یہاں صرف چند صاحبان نقد و نظر کے مضامین سے اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جن میں انتظار حسین کے فکر و فن کے حوالے سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

گوپی چند نارنگ: ''اپنے پُرتاثیر تمثیلی اسلوب کے ذریعے انہوں نے اردو افسانے کو نئے فنی اور معنیاتی امکانات سے آشنا کرایا ہے اور اردو افسانہ کا رشتہ بیک وقت داستان، مکاتب، مذہبی روایتوں، قدیم اساطیر اور دیومالا سے ملا دیا ہے۔''

ڈاکٹر محمد حسن: ''انتظار حسین نے کردار نگاری اور واقعات نگاری پر بڑی قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ جزئیات اور فضا کے ہمہ گیر بیان پر اس کی گرفت لاثانی ہے۔ انتظار کو عہدِ جدید کی اہم افسانوی دریافت کہا جا سکتا ہے۔''

ڈاکٹر وارث علوی: ''انتظار حسین کا یہ امتیازی وصف ہے کہ ان کے کسی جملے پر شعریت یا غنائیت یا شاعرانہ پن کا گمان نہیں ہوتا، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ان کی پوری کوشش غنائیت سے گریز کی طرف ہے۔ اس کے باوجود ان کا اسلوب غنائی شاعری کے اسلوب کی مانند ہم پر وجد کی کیفیت طاری کرتا ہے۔ یہ نثر کی معراج ہے اور ایسے معجزے آسمانی صحائف میں ہی نظر آتے ہیں جن کے اثرات انتظار حسین کے اسلوب پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ آسمانی صحائف کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے جو کہا گیا ہے وہ اہم نہیں ہے بلکہ کیسے کہا گیا ہے وہ اہم ہے۔''

سراج منیر: ''انتظار حسین کی ایک اہمیت ہمارے لئے یہ بھی ہے کہ اسالیب کا اتنا وسیع دائرہ شاید ان سے پہلے کسی اور افسانہ نگار میں دکھائی نہیں دیتا۔''

آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

افسانوی مجموعے

گلی کوچے: یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں آپ کی اولین کہانی ''قیوما کی دکان'' (مطبوعہ، ادبِ لطیف، لاہور، دسمبر ۱۹۴۸ء) بھی شامل ہے۔ کُل کہانیوں کی تعداد گیارہ ہے۔ اسے پہلی بار ۱۹۵۲ء میں شاہین پبلشرز، لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس میں ''استفسار'' کے تحت افسانہ نگار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ''سانجھ بھئی چوندیس'' کے عنوان سے ایک رپورتاژ بھی شامل ہے۔

کنکری: سنِ اشاعت کے اعتبار سے یہ انتظار حسین صاحب کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اسے ۱۹۵۵ء میں مکتبہ جدید لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس میں چودہ افسانے شامل ہیں۔ اس میں ''ونجھاری کی گھریا'' کے عنوان سے آپ نے افسانہ نگاری کے فن پر اہم گفتگو کی ہے۔

آخری آدمی: ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں گیارہ کہانیاں شامل ہیں۔ اس کی اشاعت کا اعزاز کتابیات لاہور نے حاصل کیا۔ ''آخری آدمی'' کا دیباچہ باقر رضوی نے تحریر کیا ہے اور افسانہ نگار نے اپنے کرداروں کے بارے میں بتایا ہے۔

شہرِ افسوس: اسے مکتبہ کارواں لاہور نے ۱۹۷۲ء میں پیش کیا۔ اس میں سترہ افسانے ہیں۔ اس میں افسانہ نگار کا ایک مضمون بعنوان ''کہانی کی کہانی'' بھی شامل ہے۔

کچھوے: اس میں بھی سترہ افسانے ہیں۔ اس کی اشاعت کا اعزاز مطبوعات لاہور نے ۱۹۸۱ء میں حاصل کیا۔ اس میں انتظار حسین نے ''نئے افسانہ نگار کے نام'' کے حوالے سے اپنے افسانوں کے جواز

میں گفتگو کی ہے۔

خیمے سے دور: اسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے بڑے اہتمام سے ۱۹۸۶ء میں پیش کیا۔ اس سترہ افسانوں پر مشتمل مجموعے کو بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔

خالی پنجرہ: اس میں بارہ نئی اور پانچ پرانی کہانیاں شامل ہیں۔ اسے بھی سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۹۳ء میں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ اس میں شامل افسانہ 'پریم کاربونیٹ' کو مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۵۸ء میں بہترین افسانے کے انعام سے نوازا تھا۔

آپ کے افسانوں کا کلیات دو جلدوں پر سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کر دیا ہے۔ پہلے حصے کا نام ''جنم کہانیاں'' ۱۹۸۷ء اور دوسرے حصے کا نام ''قصہ کہانیاں'' ۱۹۹۰ء ہے۔

ناول اور ناولٹ

چاند گہن: مکتبہ کارواں، لاہور: ۱۹۵۳ء، دن اور داستان: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی: ۱۹۵۹ء، بستی: ادارہ ادبیات نو، لاہور ۱۹۸۰ء، تذکرہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۸۷ء، آگے سمندر ہے: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۵ء

تراجم/فکشن

نئی پود: ایوان تورگنیف (ناول): مکتبہ اُردو، لاہور ۱۹۵۲ء، ناؤ اور دوسرے افسانے (امریکی ناول): آئینہ ادب، لاہور ۱۹۵۸ء

سرخ تمغہ: سٹیفن کرین (ناول): یونائیٹڈ بک ڈپو، لاہور ۱۹۶۰ء، سارہ کی بہادری۔ ایلس ڈیلگیشن (ناول): شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۶۳ء، ہماری بستی۔ تھارنٹن وائلڈر (ڈراما): اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۷ء

تراجم: ادبیات

فلسفہ کی نئی تشکیل: جان ڈیوی: سیش محل کتاب گھر، سویرا: ۱۹۶۱ء، ماؤزے تنگ۔ سٹیورٹ شریم (سوانح و افکار): نگارشات، لاہور ۱۹۶۶ء

سفر نامہ

زمین اور فلک اور: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۷ء

ڈراما

خوابوں کے مسافر (اسٹیج ڈراما): مطبوعہ شب خون، الہ آباد، ۱۹۶۸ء، نفرت کے پردے میں (ٹی وی ڈراما): مطبوعہ سویرا، کراچی، ۱۹۷۰ء، پانی کے قیدی (ٹی وی ڈراما) مطبوعہ سویرا، کراچی ۱۹۷۳ء

متفرقات

سن ستاون میری نظر میں (ترتیب بہ اشتراک ناصر کاظمی): آئینہ ادب، لاہور، الف لیلہ (مرتبہ) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، انشاء اللہ خاں انشا کی دو کہانیاں (مرتبہ): مجلس ترقی ادب، لاہور، قائداعظم کے لڑکپن تک کا زمانہ: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور، کلیلہ و دمنہ: یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، لاہور، باتیں اور ملاقاتیں (مکالمے): مکتبہ عالیہ، لاہور، ذرے (ادبی کالم): پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور، علامتوں کا زوال (تنقید): مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اجمل اعظم (سوانح حکیم اجمل خاں)

محترم انتظار حسین نے صحافت میں بھی اپنے کردار سے گہرے نقوش قائم کیے ہیں۔ آپ نے لاہور کے نظام، امروز، آفاق، نوائے وقت، اور مشرق کے علاوہ ادبی جرائد خیال اور ادب لطیف میں لکھا ہے اور ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ آپ کے کالم بڑی توجہ سے پڑھے جاتے ہیں۔

انتظار حسین صاحب کی خدمات کے اعتراف میں رائٹرز گلڈ آدم جی ادبی انعام برائے ناول "بستی" پیش کیا گیا جسے آپ نے قبول نہیں کیا۔ حکومت پاکستان کا اعلیٰ ترین سول ایوارڈ "پرائیڈ آف پرفارمنس" حاصل کر چکے ہیں۔ دہلی کے ہارپر کولنز پبلشرز نے "یاترا ایوارڈ" بھی دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے فکر وفن اور شخصیت پر چند کتابیں اور رسائل و جرائد کے خصوصی نمبر شائع ہوئے ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری: سائرہ بانو، ۱۹۸۱ء

۲۔ دو ماہی "الفاظ" علی گڑھ: خصوصی شمارہ مئی اگست ۱۹۸۱ء

۳۔ انتظار حسین اور ان کے افسانے: مرتبہ گوپی چند نارنگ، ۱۹۸۶ء

۴۔ ماہنامہ "کتاب نما" دہلی: خصوصی شمارہ مئی ۱۹۹۲ء

۵۔ انتظار حسین کی غیر افسانوی تحریریں: فیاض احمد (تحقیقی مقالہ برائے پنجاب یونیورسٹی)

۶۔ انتظار حسین کی ناول نگاری: رجیل، مقالہ برائے ایم فل (جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی)

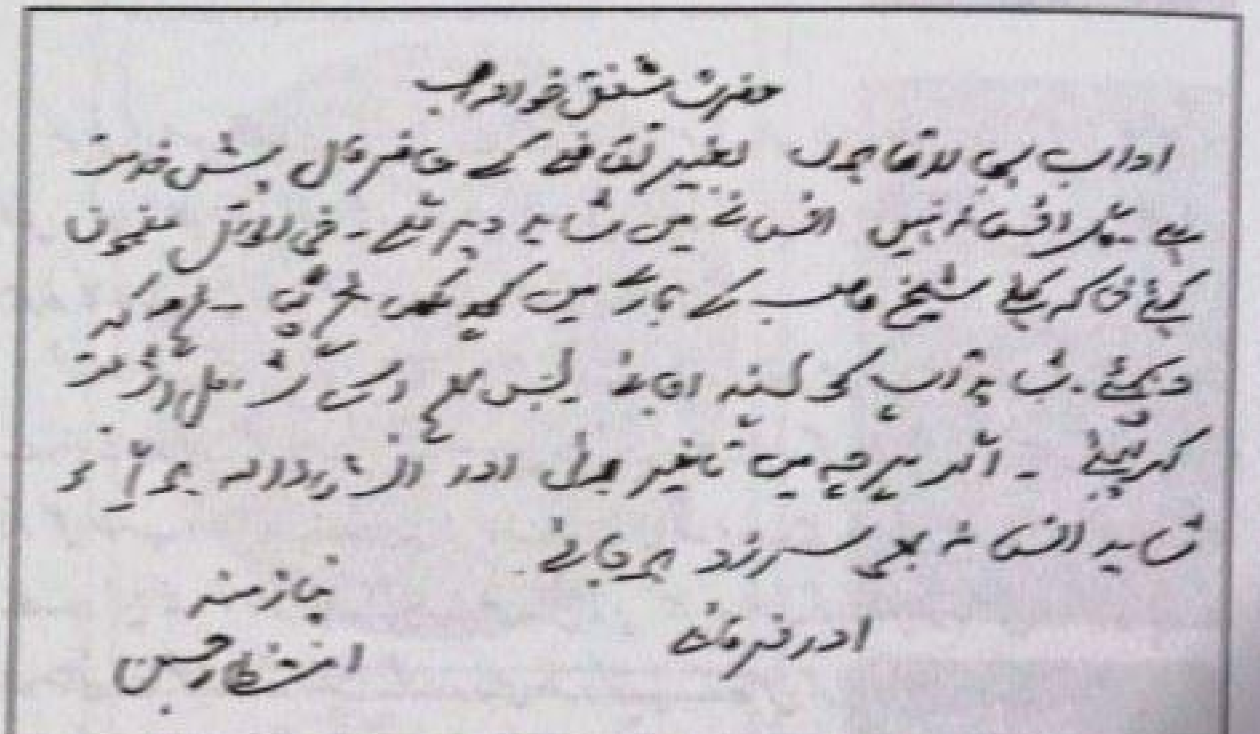
انتظار حسین صاحب پر بہ زبان انگریزی بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے جن میں چند یہ ہیں:

1. JOURNAL OF SOUTH ASIAN LITERATURE : The writings of Intizar Husain.
   Guest Editor: Mohammad Umar Memon–1983.
2. PARTITION LITERATURE : A Study of Intizar Husain.
   Modern Asian Studies: July, 1980.
   By Mohammad Umar Memon.
3. AN UN-WRITTEN EPIC AND OTHER STORIES
   Edited by Mohammad Umar Memon.
   Sange Meel Publications, Lahore, 1987
4. THE LEAVES: Translated by Alok Bhalla & Vishwa Mitra Adil.

5. BASTI : Translated by Frances W. Pritchett Harper Collinns.

آج بھی محترم انتظار حسین کا قلم رواں ہے۔ توقع ہے کہ ابھی اور بھی ادبی معرکے سر کریں گے۔

ماخذ: انتظار حسین ایک دبستان، مرتبہ: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم



حضرت شفیق خواجہ

آداب [illegible]

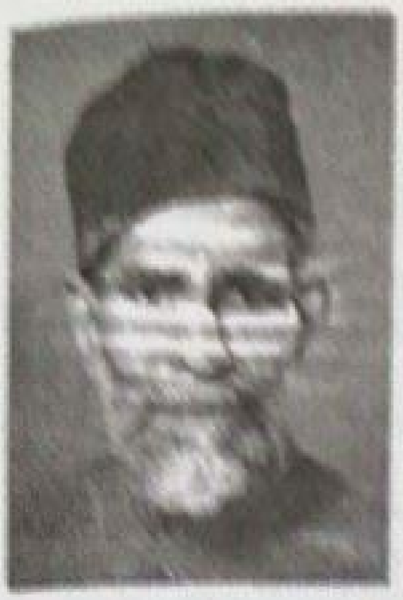
[illegible]

نیازمند

انتظار حسین

اور فرمائیے

عکس تحریر: انتظار حسین



محمود حسین

ایس۔ محمود فوٹو گرافر

میرٹھ کی نامور شخصیات کے حوالے سے ایک مشہور و معروف اور جہان مصوری و فوٹو گرافی کا معتبر نام ایس۔ محمود حسین فوٹو گرافر کا بھی ہے۔ ان کا اسٹوڈیو ایس۔ محمود اینڈ سنز فوٹو گرافر کے نام سے بجلی بازار میرٹھ کینٹ میں واقع تھا جو انہوں نے وہاں ۱۹۰۹ء میں قائم کیا تھا۔

محمود صاحب کے آباو اجداد کا خاص تعلق دہلی کے قدیم خاندانوں میں سے تھا جو فن مصوری کے پیشہ سے وابستہ تھے اور ہاتھی دانت پر قلمی تصویریں بنایا کرتے تھے۔ ان کے والد شیخ نذیر حسین آرٹسٹ کا مختصر ذکر بھی مناسب ہوگا جو اپنے وقت میں نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ میں بھی فن مصوری میں شہرت رکھتے تھے۔ وہ آج تک فخر خاندان سمجھے جاتے ہیں۔ شیخ نذیر حسین صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ پورے ہندوستان سے منتخب ہو کر انگلینڈ گئے اور وہاں ملکہ وکٹوریہ کے خاص آرٹسٹ مقرر ہوئے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب انگلینڈ جانا خواب و خیال سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی چلا جاتا تھا تو وہ اپنے گھر کے دروازے پر نام کی تختی پر ENGLAND RETURN لکھوانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ شیخ نذیر حسین صاحب ہاتھی دانت کی تراشی ہوئی مختلف سائز کی تختیوں پر قلمی تصویریں بنایا کرتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی تصویروں میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جس شخص کی تصویر بنائی جاتی' اس کے چہرے کی LIKENESS اور EXPRESSION میں بال برابر بھی فرق نہیں ہوتا تھا۔ وہ رنگوں کا استعمال بڑی خوش سلیقگی اور ہنرمندی کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں حسن و امتزاج کا مرقع ہوتی تھیں' جیسے آج کل کی کوئی TRANSPERENCIES ہوں۔ ان کے شاہکار یورپ کی کئی آرٹ کی نمائشوں میں رکھے گئے۔ انہیں لندن میں منعقدہ دو نمائشوں

COLONIAL AND INDIAN EXHIBITION : 1886

اور INTERNATIONAL EXHIBITION : 1902 میں بالترتیب فرسٹ پرائز اور گولڈ میڈل ملے۔ فرانس میں ہونے والی ایک بڑی نمائش (مقابلہ)

GREAT EXHIBITION-EXHIBITION IN EXHIBITION میں انعام یافتہ بہت سی پینٹنگز شامل کی گئیں۔ اس نمائش میں بھی انہیں PAINTINGS MINITURES میں فرسٹ پرائز ملا۔ اہم اور تاریخی شخصیات کی طرف سے لاتعداد توصیفی سرٹیفکیٹ بھی ان کی فنی عظمت کے گواہ ہیں۔ ان میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اس فرمان کے ساتھ سرٹیفکیٹ اہم ہے کہ شیخ نذیر حسین کو سلطنت برطانیہ میں کسی بھی قسم کی مدد درکار ہو تو انہیں بہم پہنچائی جائے۔

انہوں نے فن مصوری کی خدمت ہی میں عمر گذاری اور ۱۹۳۵ء میں دہلی میں انتقال کیا۔ دو لڑکے شیخ



گولڈ میڈل برائے شیخ نظیر حسین:
نمائش منعقدہ لندن ۱۹۰۲ء



شیخ نظیر حسین (مصور)

تجمل حسین اور شیخ محمود حسین اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں۔ شیخ تجمل حسین نے بھی فن مصوری کو ہی ترجیح دی۔ منیچر پینٹنگ اور آئل کلر میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ کمرشل آرٹ میں انہوں نے بطور خاص شہرت حاصل کی۔ شیخ تجمل حسین نے تقسیمِ ہند کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔

ایس۔ محمود حسین صاحب نے فن مصوری اپنے عالمی شہرت یافتہ والد شیخ نذیر حسین صاحب سے حاصل کیا اور فوٹوگرافی اپنے شوق سے سیکھی۔ فوٹوگرافی کو بطور پیشہ اپنایا اور کمال و شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔

آپ نے ۱۹۰۴ء میں میو اسکول آف آرٹ لاہور سے چار سالہ ELEMENTARY کورس سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کورس میں آپ کے مضامین تھے:

(1)FREE HAND DRAWING.

(2)DECORATIVE DESIGN IN FOLOURS.

(3)LIGHT AND SHADE DRAWING.

(4)MODELLING IN CLAY FROM NATURE.

(5)BUILDING CONSTRUCTION.

(6)GEOMETRICAL DRAWING.

(7)RUDIMENTS OF PERSPECTIVE.

اس کورس کی بدولت انہیں اپنے کام میں بڑی سہولت ملی اور دوسرے فوٹو گرافرز پر فوقیت حاصل ہوئی۔ ایس۔ محمود حسین صاحب نے اولا" اپنا اسٹوڈیو چاندنی چوک دہلی میں قائم کیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد دہلی کو چھوڑ کر اپنے خاندان کے ساتھ مستقل طور پر میرٹھ منتقل ہو گئے اور میرٹھ میں اپنا اسٹوڈیو ایس۔ محمود اینڈ سنز فوٹو گرافر کے نام سے صدر میرٹھ کینٹ کے بمبئی بازار میں قائم کیا۔ میرٹھ میں انہوں نے اپنی بہترین کارکردگی اور ہنر مندی کے سبب بہت جلد مقبولیت اور شہرت حاصل کرلی۔ اس وقت فوٹو گرافی صرف روٗسا اور خواص تک ہی محدود تھی اور ایک معزز پیشہ خیال کی جاتی تھی۔ محمود صاحب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ FINISHING'RETUCHING اور ہینڈ کلرنگ میں مہارت رکھتے تھے۔ گروپ فوٹو بنانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ سو سوا سو افراد کا گروپ اس عمدگی سے بناتے تھے کہ گروپ میں موجود ہر شخص واضح نظر آتا تھا اور وہ پس منظر پر بھی خصوصی نگاہ رکھتے تھے۔ اس زمانے میں بڑے سائز کے پلیٹ کیمرے استعمال ہوتے تھے جن میں آٹومیٹک شٹر نہیں ہوتے تھے۔ لینس کے اوپر ڈھکنا نما گول کیپ لگی ہوتی تھی۔ پکچر ایکسپوز کرنے کے لئے کیمرے میں فلم لگانے کے بعد ہاتھ سے لینس کی کیپ بہت ہی قلیل وقفہ کے لئے اتار کر دوبارہ لگائی ہوتی تھی۔ ان کا ایکسپوز دینے کا بڑا ہی خوب صورت انداز تھا جس سے لوگ محظوظ بھی ہوتے تھے۔

فلم یا پلیٹ ڈیولپ ہو جانے کے بعد وہ نگیٹیو پر ہر ایک کے چہرے کو RETOUCH کرتے تھے۔ اس طرح فوٹو میں نکھار پیدا ہو جاتا تھا۔ آوٗٹ ڈور گیپ کے نیگیٹو میں مصنوعی بادل بڑی خوبصورتی سے بنا دیتے تھے جس سے حسن مزید بڑھتا تھا۔ پورٹریٹ بنانے میں بھی محمود صاحب ماہر تھے۔ ایکسپریشن کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ COPY TO COPY کے کام میں ایک زمانہ ان کا معترف تھا۔ ان کا قول تھا کہ کام سے ہی کام کرنے والے کا نام ہوتا ہے اور کام ہی شخصیت کی پہچان ہوتا ہے۔

وقت گذرنے کے ساتھ ان کی شہرت اور کام میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ مختلف کاموں کے لئے اپنے اسٹاف میں دس بارہ آدمیوں کا اضافہ کیا لیکن ہر کام کی نگرانی خود کی۔ ان کی معاونت بڑے صاحبزادے حامد حسین کرتے تھے۔ اپنے والد کی تربیت سے حامد حسین صاحب نے فوٹو گرافی میں مہارت حاصل کی۔

محمود صاحب نے کناٹ پیلس دہلی میں ان کی نگرانی میں ایک شاخ قائم کی مگر خود میرٹھ میں ہی رہے۔ محمود صاحب نے جن قابل ذکر بڑی شخصیتوں کی تصاویر بنائیں ان میں وائسرائے ہند لارڈ للذلہ لٹ گو' قائداعظم 'پنڈت جواہرلال نہرو'سبھاش چندر بوس' رابندر ناتھ ٹیگور' ڈاکٹر سریتا رام' ڈاکٹر سورج مل وکٹ سی۔ ایم۔ مودی' رائے صاحب تاراچند اور نواب محمد اسمٰعیل خاں شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت فسادات پھوٹ پڑے تو بلوائیوں نے دہلی کا اسٹوڈیو لوٹ لیا۔ حامد حسین صاحب یوپی چھوڑ کر پاکستان آگئے اور انہوں نے کراچی میں ایس۔ محمود اینڈ کمپنی کے نام سے وکٹوریہ روڈ پر اسٹوڈیو قائم کیا۔ اس وقت بھی محمود صاحب میرٹھ چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے مگر جب فسادات بڑھ گئے تو انہوں نے اپنا اسٹوڈیو اونے پونے ایک ہندو کے ہاتھ فروخت کر دیا اور کراچی آگئے۔ یہاں دونوں باپ بیٹوں نے مل کر کام کیا اور یہاں بھی بہت جلد ملک گیر شہرت حاصل کرلی اور ملک کے مایہ ناز فوٹوگرافر تسلیم کرلیے گئے۔ محمود حسین صاحب کو یہ بہت بڑا اعزاز حاصل ہوا کہ قائداعظم نے ان کو بہ حیثیت گورنر جنرل آف پاکستان اپنی سرکاری پورٹریٹ اور پہلی کابینہ کا گروپ فوٹو بنوانے کے لئے گورنر جنرل ہاؤس بلوایا اور اپنے قیمتی وقت میں سے ایک گھنٹہ دیا۔ اس وقت یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ جب قائداعظم پورٹریٹ بنوانے کے لئے بیٹھے تو ہمیشہ کی طرح بہت سنجیدہ تھے۔ اس وقت ان سے گذارش کی گئی کہ آپ ذرا مسکرائے تو انہوں نے فرمایا "I CAN NOT LAUGH BY ORDER" اور یہ کہہ کر وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔ اسی لمحے ان کی تصویر بنالی گئی۔ یہ ان کی ایک یادگار تصویر شمار ہوتی ہے' جس کو خود قائداعظم نے بھی بہت پسند فرمایا۔ اس کے علاوہ بھی ان کے کئی پوز لئے گئے۔ ان میں سے تین تصویروں کو سرکاری استعمال کے لئے منتخب کیا گیا۔ محمود صاحب کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کے اسٹوڈیو میں ملک کے دیگر گورنر جنرل' صدور' وزراء اعظم اور وزراء بہ نفس نفیس تصاویر بنوانے کے لئے تشریف لائے۔ ان شخصیات میں خواجہ ناظم الدین' غلام محمد' اسکندر مرزا' فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں' جنرل یحییٰ' شہید ملت لیاقت علی خاں' حسین شہید سہروردی' محمد علی بوگرہ' آئی آئی چندریگر' ذوالفقار علی بھٹو' سردار عبدالرب نشتر' فیروز خاں نون' پیرزادہ عبدالستار' چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس رشید اور جسٹس منیر صاحبان شامل ہیں۔

ایس۔ محمود حسین صاحب کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ قائداعظم' فیلڈ مارشل ایوب خاں اور جنرل اسکندر مرزا نے بحیثیت گورنر جنرل' صدر پاکستان اور نواب آف بہاولپور نے بطور خاص اپنا فوٹوگرافر مقرر کرکے APPOINTMENT LETTERS دیئے۔ زمانہ ضعیف العمری میں انہوں نے اپنے ہونہار بڑے صاحبزادے حامد حسین کے سپرد سارا کام کردیا تھا اور خود صرف نگرانی کرتے تھے۔ اسٹوڈیو کے کاموں میں محمود صاحب کے چوتھے بیٹے شوکت حسین اپنے بھائی کی معاونت کرتے تھے۔ انہیں دونوں بھائیوں نے اپنے اسٹوڈیو کو کامیابی سے چلا کر اپنے والد کے نام و کام کو زندہ رکھا۔ محمود صاحب کا انتقال

کراچی میں ۲۸ جنوری ۱۹۷۰ء کو ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ پاپوش نگر کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

ایس۔ محمود حسین نے پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری اور دوسری کے انتقال کے بعد تیسری شادی کی تینوں سے ہی اولادیں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی' دوسری بیوی سے ایک بیٹی اور دو بیٹے اور تیسری اہلیہ سے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ آپ نے انتقال کے وقت تیرہ اولادیں چھوڑیں۔ بیٹوں میں حامد حسین' عاقل حسین' طاہر حسین' شوکت حسین' مسعود حسین' واحد حسین اور خالد حسین ہیں۔

ایس۔ محمود حسین صاحب کے بیٹوں میں حامد حسین' عاقل حسین اور شوکت حسین ہی فنی وارث رہے۔ حامد حسین بھی انتقال کر چکے ہیں۔ عاقل حسین اور شوکت حسین صاحبان "فوٹو کو" کے نام سے کام کر رہے ہیں۔ محمود صاحب کے انتقال کے بعد پہلے حامد حسین کو لوگ محمود کہتے تھے اور اب شوکت حسین صاحب کو محمود کہتے ہیں۔



حامد حسین (فوٹو گرافر)

مولانا بدر عالم مہاجر مدنیؒ

۱۸۹۸ء میں حاجی تہور علی بدایوں میں محکمہ پولیس میں انسپکٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کا وطن میرٹھ تھا۔ روحانی تعلق مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے رکھتے تھے۔ وہیں اس سید گھرانے میں مولانا بدر عالم ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید کی تعلیم کے بعد ابتدائی تعلیم الٰہ آباد کے انگریزی اسکول میں حاصل کر رہے تھے کہ انہیں ایام میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک وعظ سن کر دینی تعلیم حاصل کرنے کے فیصلے سے اپنے والد کو آگاہ کیا۔ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں آپ کے والد نے مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل کر دیا' جہاں آپ نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے دورہ حدیث پڑھ کر ۱۳۳۶ھ میں سند الفراغ حاصل کی۔ آپ مولانا کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔

مولانا بدر عالم سند فراغت حاصل کرنے کے بعد "مظاہر العلوم" میں ہی تدریس پہ مامور ہوئے۔ دو سال درس دینے کے بعد دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے اور یہاں دوبارہ دورہ حدیث میں شریک ہو کر ۱۳۳۹ھ میں حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ' حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ جیسے اکابر علماء سے دورہ حدیث کی کتابیں پڑھیں اور سند فراغت تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۴۰ھ میں دار العلوم ہی میں اپنے اساتذہ کے پہلو بہ پہلو مسند تدریس پر فائز ہوئے۔ ۱۳۴۶ھ کے وسط میں اپنے استاد مکرم مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے۔ وہاں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ پانچ سال تک مولانا کشمیری کے درس صحیح بخاری میں پورے التزام کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ سترہ سال تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں علم حدیث کی تدریسی خدمات انجام دیں۔ آخر میں صدر مدرس منتخب ہوئے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے ڈابھیل سے بہاولپور چلے گئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کی شہریت پسند کی اور یہاں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے قائم کردہ دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الٰہ یار میں مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی دعوت پر استاذ حدیث اور نائب مہتمم کے منصب پر فائز ہوئے اور درس و تدریس اور تبلیغ و ارشاد کے ساتھ ساتھ نظامِ اسلام کے نفاذ کے لئے کوشاں رہے۔ آپ نے دستورِ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں بھی حصہ لیا۔

مولانا بدر عالمؒ نے ان مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کی طرف بھی خصوصی توجہ رکھی۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی وفات کے بعد' آپ نے اپنے استاد کے علوم و معارف کو عربی میں "فیض الباری علی الصحیح البخاری" کے نام سے چار جلدوں میں مرتب کیا جس میں اپنے استاد کی نادر علمی تحقیقات اور تفردات کو پیش کر کے آپ نے ایک عظیم علمی کارنامہ انجام دیا۔ یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی ہے۔ ۱۳۶۲ھ میں ندوۃ المصنفین سے وابستگی کے زمانے میں "ترجمان السنۃ" کے نام سے اردو زبان میں حدیث کی ایک جامع کتاب ترتیب دی۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

آپ کی ان کتب کے علاوہ دیگر تصانیف میں جواہر الحکم (تین جلدیں)، "متروک الحقیر" "تبعۃ النذیر" "ترجمہ الجزء الاعظم" "نزولِ عیسیٰ علیہ السلام" "آوازِ حق" "شانِ حضور" "فریادِ عصر" "عرضِ حال" کے نام ایک مکتوب اور "مجوب الارث" شامل ہیں۔

آپ نے اولاً حضرت مولانا خلیل الرحمن قدس سرہ کے دامن کو تھاما اور آخر میں حضرت مولانا عزیز الرحمن عثمانی کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا قاری محمد اسحاق میرٹھیؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا اور خلیفہ مجاز بنائے گئے۔ آپ کا سلسلہ ارشاد و ہدایت وسیع ہے۔

مولانا بدرِ عالم نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ آپ کی آرزو تھی کہ مدینہ منورہ میں زندگی کے شب و روز بسر کریں۔ آپ نے البدر الساری تعلیقات فیض الباری میں انتہائی والہانہ اور رقت انگیز انداز میں اپنی اس آرزو کا اظہار بھی کیا تھا۔ یارِ محبوب الحرمت میں شرفِ قبولیت کے ساتھ سرفرازی ہوئی۔ ٹنڈو الہ یار (سندھ) سے ۱۳۷۳ھ میں مدینہ منورہ ہجرت فرمائی اور دیارِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آماجگاہ بنا لیا۔ بیس ۲۰ رجب ۱۳۸۵ھ / ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو جمعہ کی شب دارِ فانی کو الوداع کہا اور جنت البقیع کی مقدس خاک کا حصہ بن گئے۔

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے

مشاہیر علماء نے مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ کی دینی خدمات اور ذاتی صفات کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں "حضرت مولانا سید بدرِ عالم صاحب میرٹھیؒ کی ذاتِ گرامی علم و عمل اور شریعت و طریقت کا مجمع البحرین تھی"۔ مولانا خیر محمد جالندھری کہتے ہیں "حضرت مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ بہت بڑے عالم، محدث، فقیہہ اور عارف تھے اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے علوم و معارف کے ترجمان تھے"۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں "مولانا سید بدرِ عالمؒ دورِ حاضر کے ان ممتاز علماء میں سے تھے جن کی بدولت علم و دین کی ساکھ قائم ہے۔ جن سے مدرسے آباد اور حیا باقی ہیں"۔ مولانا ماہر القادری نے مولانا بدرِ عالم کے انتقال کے بعد ماہنامہ "فاران" کراچی دسمبر ۱۹۶۵ء کے شمارے میں تحریر کیا ہے "ان سے ملاقات کا شرف مدینہ منورہ میں حاصل ہوا۔ دینی محبت سے لے کر تحقیق اور اقامتِ دین کے موضوع پر ان سے کئی صحبتوں میں طویل گفتگو رہی۔ ان کا طرزِ کلام دل نشین اور دل میں اتر جانے والا ہوتا تھا۔ بعض المجلس ان کے وعظ و تلقین اور افہام و تفہیم سے دوچار ہوئیں"۔

مولانا بدرِ عالمؒ اپنے دور کے ایک جید عالم، عظیم محدث، مقبول مدرس و مقرر اور قابلِ احترام مصنف کے ساتھ ساتھ عربی اور اردو کے ادیب و شاعر تھے۔ اپنے علمی کمالات اور جامعیت کے اعتبار سے قدماء سلف کی یادگار تھے۔

مشاہیر علماء دیوبند : جلد اول، مس... مولانا بدرِ عالم... ؛ کراچی، دسمبر ۱۹۶۵ء
فاران کراچی دسمبر ۱۹۶۵ء

حکیم بلدیو سہائے

حکیم بلدیو سہائے کا شمار میرٹھ کے مایہ ناز حکماء میں ہوتا تھا۔ وہ ہندوستان کے ان چند حکماء میں شامل تھے جنہوں نے فنِ طب کی بے لوث خدمت کی۔ انہوں نے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے وزیر حکیم احسن اللہ خاں (جو طب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے) سے طب کی تکمیل کی اور میرٹھ واپس آ کر فن کے فروغ کے لئے دن رات محنت کی۔ ان سے فیض حاصل کرنے والوں میں نامور حکماء شامل ہیں جن میں ان کے ہم وطن حکیم محمد مقرب حسین خاں اور حکیم محمد فخر الدین شامل ہیں۔ ان دونوں حکماء نے بھی مشن کو آگے بڑھایا اور مشہور ہوئے۔

حکیم بلدیو سہائے بڑے حاذق طبیب تھے۔ ان کے دور میں میرٹھ میں ایک اور حاذق حکیم نواب مبارک علی خاں بھی شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ ان دونوں بزرگوں میں فرق صرف یہ تھا کہ حکیم بلدیو سہائے کے نسخے قیمتی ہوتے تھے اور نواب صاحب کے نسخے ایک دو پیسہ سے زیادہ کے نہیں ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے ہاتھ میں بڑی شفا دے رکھی تھی۔

حکیم بلدیو سہائے نیک نفس اور آزاد منش تھے۔ سید حبیب الرحمٰن شاہ نے تحریر کیا ہے کہ ایک شخص نے حکیم صاحب سے کہا کہ آپ قیمتی نسخے لکھتے ہیں اور نواب صاحب ایک دو پیسہ سے زیادہ کے نسخے کبھی نہیں لکھتے۔ حکیم بلدیو سہائے نے فوراً جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ نواب صاحب کے پاس اللہ چھو بھی ہے۔ کہنے کو تو یہ بات مذاق ہو سکتی ہے مگر درحقیقت انہوں نے ایک حقیقت بیان کی تھی۔

حکیم صاحب کی شہرت دور دور تک پھیلی۔ راجہ صاحب گوالیار نے اپنے یہاں علاج معالجہ کے لئے مقرر کیا۔ گوالیار جانے سے پہلے اپنے مطب کا جملہ انتظام اپنے قابل فخر شاگرد حکیم سید مقرب حسین کے سپرد کر دیا۔ حکیم صاحب نے بڑی شان و شوکت سے زندگی بسر کی۔ ان کے بیٹے حکیم مہاراج سنگھ نے بھی اس علم سے عوام الناس کو فیض پہنچایا۔



نواب بہادر خاں

نواب بہادر خاں

نواب بہادر خاں مشہور مغل بادشاہ شاہجہاں کے جلیل القدر و بارسوخ منصب دار تھے۔ ان کا اصلی نام سر آمد اول خاں اور خطاب بہادر خاں تھا۔ ۱۰۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۰۳۲ھ میں اپنے والد ماجد نواب دریا خاں کے توسل سے شہزادہ ولی عہد شاہجہاں کی حکومت میں عمدہ منصب داری پر فائز ہو کر خطاب "بہادر خاں" سے سرافراز ہوئے۔ ۱۰۳۷ھ میں شاہجہاں نے بادشاہ کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں تو اس نے بہادر خاں کو شرفِ اختصاص بخشا اور منصب چار ہزاری ذات اور دو ہزار سوار پر ممتاز فرما کر خلعت خاصہ و خنجر مرصع علم و اسپ طویلہ خاص بازین مطلا و فیل اور پچاس ہزار روپے نقد مرحمت فرمائے۔ محمد عبید اللہ خاں نے اپنی تصنیف "یادگارِ دہلی" میں تحریر کیا ہے "نیز بہ روایت معتبران کی استدعا پر موضع موسوم سابق گڑھ تا نوا حال بہادر گڑھ ضلع میرٹھ برائے سکونت بہ جاگیر آل تمغا فرمایا و روز دو شنبہ ۱۲ رجب ۱۰۳۷ھ کو بہنگام جشن نوروز دوبارہ خلعتِ فاخرہ سے سرفراز فرما کے جاگیر داری سرکار کالپی جس میں قصبہ سہنہدہ بھی داخل تھا، تفویض فرمائی۔

نواب بہادر خاں شاہجہاں بادشاہ کے ایام شہزادگی کے رفقائے خاص میں سے تھے۔ اس لئے بادشاہ ان کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا۔ نواب صاحب خود بھی ہمہ وقت جاں نثاری کے لئے تیار رہتے تھے۔ شاہجہاں کے عہد میں نواب بہادر خاں نے اہم معرکے سر کئے اور نمایاں فتوحات حاصل کیں۔ جس کی وجہ سے ہندوستان سے باہر بھی ان کی شجاعت و سپہ گری کے چرچے ہوئے۔ اعزاز و اقتدار میں بھی روز افزوں ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ سب سے اعلیٰ خطاب "چغتا" سے بھی ممتاز ہوئے جو شاہانِ مغلیہ کا مخصوص خاندانی لقب تھا۔

نواب بہادر خاں ایک نڈر اور بہادر سپہ سالار تھے۔ انہوں نے ۱۰۳۸ھ میں راجہ جھجھار سنگھ بندیلہ، ۱۰۴۰ھ میں خان جہان خاں لودی و عادل شاہ والی بیجاپور، ۱۰۴۲ھ میں سرکشان پرگنہ ملکوسہ، ۱۰۴۵ھ میں دوبارہ راجہ جھجھار سنگھ بندیلہ، ۱۰۴۸-۱۰۴۷ھ میں شاہ ایران، ۱۰۵۰-۱۰۴۹ھ میں پرتھی راج وچنپت

بندیلہ، ۱۰۵۲ھ میں شاہ ایران، ۱۰۵۴ھ میں راجپوتان بجھیل اور ۱۰۵۸ھ میں سکھان صوبہ پنجاب کے خلاف معرکوں میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۰۵۱ھ میں قلعہ تارا گڈھ اور ۱۰۵۵ھ میں بلخ وبدخشاں کی تسخیر میں بھی بہترین حکمتِ عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فتوحات حاصل کیں۔ بلخ کی تاریخی جنگ کا قطعۂ تاریخ نصیر شیرازی نے کہا ہے۔ جس میں مادہ تاریخ فتح بلخ بصنعت تعمیہ، استخراج کیا ہے۔ قطعہ ہے:

شکر للل• کز عنایاتِ خداوندِ جہاں	کرد فتح ملکِ توراں سرورِ مالک رقاب
بادشاہِ غازی، عادل شہنشاہِ جہاں	آنکہ کرد اورا جہاں ازجملہ شاہان انتخاب
گشت در تسخیر عالم ثانیِ صاحب قراں	ایزد اورا کرد درکشور ستانی کامیاب
درویش عزمِ جہانگیری شے گریکذرد	گیرد اقبالش جہان را صبح پیش از آفتاب
سالِ این تاریخ جست از عقل دانشور نصیر	گفت باطبعش زراہ تعمیہ کے نکتہ یاب

وائی توران براراز ملک توران وانگھے
ثانی صاحب قران بنشاں بجائیش کن حساب

۱۰ ذی الحج ۱۰۵۸ھ کو شاہ عباس والئی ایران نے بغیر اعلانِ جنگ موسم سرما میں قلعۂ قندھار کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت شدید برف باری ہورہی تھی۔ ۱۲ صفر ۱۰۵۹ھ کو وہ قلعہ فتح کرکے ہرات و فراہ کی جانب چلا گیا۔ اس نے سردار محراب خاں کو قلعہ دار مقرر کردیا تھا۔ شاہجہاں نے یہ خبر سن کر شہزادہ اورنگ زیب کو ستر ہزار فوج معہ ایک سو چونتیس امراء نامدار و منصب داران قلعۂ قندھار کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ اس مہم میں نواب بہادر خاں قندھار کے مالوری دروازہ کے سامنے مورچے تیار کرارہے تھے کہ ۱۹ رجب ۱۰۵۹ھ کو دفعتاً" ان کا بعارضہ ضیق النفس انتقال ہوگیا۔ ان کے عزیزوں نے جو اس معرکے میں شریک تھے، ان کی نعش قندھار سے بہ عجلت و حفاظت شاہجہانپور لاکر محلّہ بہادر گنج میں دفن کی اور قبر کے گرد ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کرادیا جو وہاں موجود ہے۔

نواب بہادر خاں کے فیل خانہ میں کسی بھی وقت سو ہاتھیوں سے کم نہ رہے۔ بستیوں کے قیام اور عمارات کی تعمیر کا بھی وہ بے حد شوق رکھتے تھے۔ الہ آباد و لاہور میں کئی حویلیاں، دہلی میں محلّہ بہادر پورہ، آگرہ میں ان کے بیٹے نواب عزیز خاں بہادر سے منسوب کرہ عزیز خاں مشہور ہیں۔ قنوج اور کالپی میں نواب صاحب کے عالیشان مکانات اور باغات تھے۔ حضرت شیخ کبیر بالا پیر صاحب کا پختہ مزار بھی قنوج میں انہیں کا تعمیر کردہ ہے۔ مکن پور ضلع کانپور میں حضرت شاہ بدیع الدین معروف بہ شاہ مدار کے احاطہ کے اندر زائرین کے قیام کے لئے ایک عالی شان دالان بھی انہوں نے تعمیر کرایا۔ اس پر فارسی کا یہ قطعہ کندہ ہے۔

بر آستانۂ مہر سپھر عینِ یقین	مدارِ عالم و علم و عمل بدیع الدین
بعہدِ شاہجہاں بادشاہِ دین پرور	کہ شدز لطفِ عمیمش جہاں پر آئین

باعتقادِ دل نیت بہادر خاں کشید سر بفلک ایں عمارتِ سنگین
بچشم اہلِ یقیں ایں مقام محموداست کہ گفت حضرت عیسیٰ بجرخ جبلِ متین
نواب بہادر خاں مرحوم کی علمی قابلیت بھی اچھی تھی۔ شعر گوئی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ ان کی ایک فارسی غزل ہے:

ترکِ سر کردن بمیدان شیوۂ رنداں بود
مشکل است ایں کار لیکن پیش مرد آساں بود
مردِ میدانِ شجاعت رانبا شد ہم سر
ہر کہ ازسر نگندرد کے مردِ ایں میداں بود
بر نہ گردانم ز دشمن روئے در میدان جنگ
میکنم جنگ و جدل گر رستم دستاں بود
روئے خوداز قبلہ گرداند بوقت ہر نماز
ہر کہ از کفار روزِ حرب روگرداں بود
قوتِ بازو شود از زخم تیز اندر مصاف
پر برآید بر تنم از تیرکان پرّان بود
اے بہادر درجہاں ہر باغ دارد میوۂ
میوۂ باغِ بہادر خنجرو پیکاں بود

نواب بہادر خاں کے دس فرزند ارجمند تھے جن میں نواب دلاور خاں سب سے بڑے اور عزیز خاں سب سے چھوٹے تھے۔

یادگارِ سلف ص ۱۸۵ تا ۱۷۹

بیگم شمرو

ہندوستان کی تاریخ میں بیگم شمرو کی پر شکوہ داستانِ زندگی میں آخری مغل بادشاہوں، ملکی طوائف الملوکی اور دیگر مسائلِ تاریخ و تمدن کے مناظر ملتے ہیں۔ دہلی اور میرٹھ کے راستے میں بیگم آباد (جہاں سوڈی ملز ہیں) اور خاص میرٹھ چھاؤنی میں "بیگم کا پل" اور بیگم باغ انہی بیگم شمرو کی یادگار ہیں۔ دہلی میں لال قلعہ کے سامنے چاندنی چوک میں ایک محلہ بھی ان کے نام سے مشہور ہے۔

بیگم شمرو کا اصل نام معلوم نہ کیا جا سکا وہ بیگم شمرو مشہور تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی یا آخری بادشاہوں کے کاغذات میں ان کا خطاب "زیب النساء" درج ہے۔ یہ خطاب انہیں مغل دربار سے عطا ہوا تھا۔

بیگم شمرو کا مولد ضلع میرٹھ کا قصبہ "کوتانہ" ہے۔ یہ میرٹھ سے تیس میل شمال و مغرب کے گوشہ میں دریائے جمنا کے قریب واقع ہے۔ سنِ ولادت جو تسلیم کیا گیا وہ ۱۷۴۶ء ہے۔ بیگم شمرو کے باپ کا نام لطیف علی خاں تھا۔ بعض حضرات نے لطف علی خاں تحریر کیا ہے۔ وہ عربی النسل اور رئیس تھے۔ یہ خاندان دو پشت سے آکر یہاں آباد ہوا تھا۔ گھریلو زبان فارسی تھی۔ بیگم شمرو کی عمر صرف چھ سال کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے سوتیلے بڑے بھائی نے جب انہیں اور ان کی والدہ کو بہت پریشان کیا تو وہ دونوں دہلی چلی گئیں۔

بیگم شمرو پستہ قد گداز بدن خاتون تھیں۔ خوبصورتی میں یکتا تھیں اور ذہانت و طباعی قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ وہ ایک بہادر عورت تھیں۔ خطرات کی کبھی پرواہ نہیں کرتی تھیں اور مردوں کی طرح ہر کام خود سرانجام دیتی تھیں۔ اپنی رعایا اور فوج کے تمام امور کو اس طرح سنبھالتی تھیں کہ بڑے بڑے مدبر دنگ رہ جاتے تھے۔

بیگم شمرو کی عمر انیس سال تھی جب ایک جرمن نوجوان رین ہارڈ کی نظر ان پر پڑ گئی اور دونوں میں ایسا ربطِ خاص پیدا ہوا کہ دونوں کی شادی ہو گئی اور یہ اس وقت سے بیگم شمرو مشہور ہوئیں۔ یہ جرمن نوجوان طبیعت کا بہت سنجیدہ اور کم سخن تھا۔ اکثر چپ چپ اور افسردہ سا رہتا تھا۔ اسی سنجیدگی کی وجہ سے اس کے یورپین احباب اسے "سومبر" کہتے تھے جو زبان زد ہوتے ہوتے شمرو ہو گیا۔

والٹر رین ہارڈ جنگِ آزادی سے سو سال پہلے قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان آیا۔ اس وقت اکثر یورپین یہاں کی بساط سیاست و تجارت پر آکر جم جاتے تھے اور ملک کی عام ابتری اس باب میں بہت معاون ثابت ہوئی تھی۔ والٹر رین ہارڈ ابتدا میں بنگال کی فرانسیسی فوج میں ملازم ہوا تھا۔ پھر یہ شخص نواب بنگال کے ہاں ملازم رہا۔ اس کے بعد خواجہ گریگوری خان یا گرگین خاں (مشہور آرمنی مدبر) کے پاس چلا گیا جو میر قاسم کی افواج کا سردار تھا۔ یہ جرمن سپاہی فوجوں کے قواعد پریڈ سکھاتا تھا۔ شاہ عالم کے زمانے میں اس نے بندیلکھنڈ میں پہنچ کر وہاں کی دیسی ریاستوں کو دبانا اور ان سے خراج وصول کرنا

شروع کر دیا۔ وہاں سے اس نے بھرت پور کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر اس نے خود ایک فوج بنائی اور اپنے لشکر کو کرائے پر چلانا شروع کیا۔ اس نے ضابطہ خاں سے غوث گڑھ میں مقابلہ کیا جس میں ضابطہ خاں کو شکست ہوئی اور اس کا خزانہ شمرو کے دستِ تصرف میں آیا۔ اس کامیابی سے اس کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔ اسے مغل دربار سے چھ لاکھ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی اور پھر اس نے اپنا صدر مقام "سردھنہ" کو بنا لیا جو میرٹھ سے تیرہ میل چھاؤنی سے آگے ایک قصبہ ہے۔ یہ جاگیر ۱۷۷۳ء میں اسے عطا ہوئی تھی اور گنگا جمنا کے دوآبہ میں مظفر نگر سے لے کر علی گڑھ کے علاقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا انتقال ۴ مئی ۱۷۷۸ء کو ہوا۔

والٹر رین ہارڈ کے انتقال کے بعد اس کے یورپین افسران اور سپاہیوں کی متفقہ درخواست پر شاہ عالم نے اس کی بیوہ کو سردار اور جاگیر کا وارث تسلیم کر لیا اور وہ سردھنہ کی جاگیر پر قابض رہیں۔ شمرو کی اس مسلمان بیگم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن اس کی ایک اور مسلمان بیوی سے جو پہلے نکاح میں آچکی تھیں، ایک لڑکا تھا جس کا نام ظفریاب خاں تھا۔ شمرو کے انتقال کے تین برس بعد بیگم نے ۷ مئی ۱۷۸۱ء کو عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور مسیحی نام "جوآنا" رکھا گیا اور ظفریاب خان بھی عیسائی ہوا اور اس کا نام والٹر بلتھاز زار رکھا گیا۔

ضابطہ خاں کے لڑکے غلام قادر روہیلہ نے ۱۷۸۷ء میں مغل بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ وہ اپنے باپ کی کھوئی ہوئی عظمت کی واپسی کے لئے دلی پر حملہ آور ہوا۔ اس زمانے میں سکھوں نے زور باندھ رکھا تھا اور شاہ دہلی کی طرف سے بیگم شمرو پانی پت میں سکھوں سے لڑ رہی تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ غلام قادر نے دلی کے لال قلعہ میں پہنچ کر شاہ عالم کی بری حالت کر دی ہے تو وہ شیرنی کی طرح بپھری ہوئی دہلی واپس آئیں اور قلعہ کے لاہوری دروازے یعنی چاندنی چوک کے دروازہ کے سامنے انہوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ غلام قادر نے صورت حال دیکھ کر سلطنت مغلیہ باہم تقسیم کر لینے کی تجویز پیش کی، جسے بیگم شمرو نے نمک حرامی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ یہاں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ غلام قادر کی توپیں قلعہ کے پاس سلیم گڑھ پر نصب تھیں۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مقابلہ ناممکن ہے اس لئے وہ بھاگ کھڑا ہوا اور شہنشاہِ ہند کی جان بخشی ہوئی۔ اس کے صلہ میں شکر گزار بادشاہ نے بیگم شمرو کو "زیب النساء" کا خطاب عطا کیا۔ ۱۷۸۸ء میں نجف قلی خاں کی بغاوت کے وقت بھی بیگم شمرو نے پالکی میں بیٹھ کر اپنی فوج کی خود کمان کرتے ہوئے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور بادشاہ کی جان بچائی۔ فتح کے بعد بادشاہ نے دربار منعقد کیا اور اس میں بیگم کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور ایک گراں بہا خلعت کے علاوہ ایک پرگنہ بادشاہ پور جو دہلی سے دکن کی جانب دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے، بیگم کو عطا کیا۔ بعد میں نجف علی خاں نے بادشاہ سے معافی چاہی جو بیگم شمرو کی سفارش سے منظور کر لی گئی۔

۱۷۹۲ء میں بیگم شمرو کی فوج میں مفسدوں کا زور ہو گیا اور جھگڑے رہنے لگے۔ بیگم شمرو کے بہی خواہوں

نے مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کر لیں تاکہ وہ مشکلات پر قابو پا سکیں۔ اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال تھی۔ جارج طامس نامی ایک افسر جو بیگم کے ساتھ کئی لڑائیوں میں شریک رہ چکا تھا' ایک عرصہ سے بیگم کی طرف مائل تھا مگر بیگم کا رجحان ایک فرانسیسی "لے ویشو" کی طرف تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نیک اطوار شخص تھا۔ ۱۷۹۳ء میں بیگم نے "لے ویشو" سے شادی کر لی۔ اس وجہ سے دونوں افسروں میں ٹھن گئی اور جارج طامس کی سازش سے فوج بیگم کے خلاف ہو گئی۔ پھر یہ بھی ہوا کہ شادی کے بعد لے ویشو میں تکبر آ گیا۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے بیگم شمرو نے گوالیار کے حکمران سندھیا کو جاگیر سپرد کرنے کا سوچا۔

لے ویشو نے چندر نگر واپس جانے کے لئے گورنر جنرل سر جان شور کو خط لکھا۔ جواب آنے سے پہلے ہی فوج نے بغاوت کر دی اور لے ویشو اپنی بیگم کو لے کر بہت کم وقت میں سردھنہ سے نکل گیا۔ راستے میں باغیوں نے انہیں گھیر لیا۔ بیگم پالکی میں سوار تھیں اور لے ویشو گھوڑے پر' دونوں طرف سے بندوقیں چلیں۔ پہلی بندوق جب چلی تو بیگم کو خیال ہوا کہ اس کے شوہر کو گولی مار دی گئی ہے' ممکن ہے کہ یہی حشر اس کا بھی ہو۔ یہ خیال آتے ہی بیگم نے اپنی کمر سے زر کار پیش قبض نکال کر سینہ میں پیوست کر لیا۔ کنیزوں نے شور مچا دیا۔ لے ویشو کو کسی نے بتا دیا کہ بیگم نے خود کو ہلاک کر لیا ہے۔ ایک کنیز نے پردہ اٹھا کر دکھایا کہ بیگم کا نقاب خون آلود ہے۔ لے ویشو نے یہ دیکھتے ہی اپنے داب میں سے طمنچہ نکال کر اپنا دماغ پاش پاش کر لیا۔ بیگم نے اگرچہ خود اپنے سینے میں خنجر پیوست کیا تھا مگر ہاتھ اوچھا پڑا تھا اور وہ صرف زخمی ہوئی تھیں۔ باغیوں نے انہیں تین روز تک توپ سے باندھے رکھا اور یورپین افسر کے سمجھانے پر کہ عورت کی ایسی توہین مذہباً "حرام ہے" انہیں قید سے آزاد کر دیا۔

اکتوبر ۱۷۹۵ء میں شمرو کا لڑکا ظفریاب خاں مظفر الدولہ سردھنہ واپس آ گیا اور جاگیر و افواج کا انتظام سنبھالا۔ اسی اثناء میں جارج طامس ایک جمعیت لے کر سردھنہ کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ میرٹھ کے ایک قصبہ کھتولی تک ہی پہنچا تھا کہ فوج بیگم شمرو کی حمایت پر آمادہ ہو گئی اور ظفریاب کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا گیا جہاں وہ باغ بیگم شمرو میں ایک عرصہ تک نظر بند رہا۔ بیگم شمرو پھر مسند نشیں ہوئیں اور فراخ دل بیگم نے یورپین باغی افسروں کو معاف کر دیا اور ان سے محض معافی نامہ لکھوایا۔

اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور دورہ تھا۔ اور لارڈ ویلزلی نے حکم دیا کہ سردھنہ کی جاگیر ضبط کر لی جائے۔ کئی اسباب کی وجہ سے یہ حکم روبہ عمل نہ آ سکا مگر جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کے گورنر جنرل ہو کر آئے تو انہوں نے بیگم شمرو کو ۱۶ اگست ۱۸۰۵ء کو ایک خط لکھا کہ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ نے انگریزوں کی وفاداری اور مدد کا حلف اٹھا لیا ہے۔ میں آپ کے رویہ سے خوش ہو کر آپ کی جاگیر کے الحاق کے سابقہ احکامات واپس لیتا ہوں مگر جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا بیگم شمرو سے معاہدہ ہوا تو یہ شق بڑھا دی گئی کہ "زیب النساء جب تک زندہ ہے اس وقت تک اس کی حکومت دوآبہ پر قائم رہے گی۔" یعنی بیگم کے مرنے کے بعد اس کا الحاق کمپنی کے ساتھ ہو گا۔ ۱۸۰۳ء میں ظفریاب خاں کا دہلی میں

انتقال ہوا اور اس کی لاش آگرہ میں اس کے باپ کے پاس دفنائی گئی۔

مختصر علالت کے بعد ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء کو بدھ کے دن صبح ساڑھے چھ بجے یہ نامور خاتون نوے سال کی عمر پا کر اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی ہزاروں افراد کا اجتماع ہو گیا۔ ہر شخص رنج و غم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ دوسرے دن مسیحی مذہب کی رسوم کے مطابق گرجا میں ان کی تدفین ہوئی۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی از روئے معاہدہ جاگیر سردھنہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں چلی گئی اور انگریزی قوانین نافذ کر دیے گئے۔ جس وقت بیگم شمرو کا انتقال ہوا اس وقت فوج میں پیادہ پلٹن ۳۴۳۶ افراد پر مشتمل تھی۔ سو توپ خانے تھے۔ رسالہ میں ۱۴۵ افراد اور ۳۶۶ باڈی گارڈ تھے۔ اس کے علاوہ ایک اسلحہ گھر اور توپیں ڈھالنے کا کارخانہ بھی تھا۔

بیگم شمرو کے عہد میں کبھی قحط نہیں پڑا اور رعایا ہمیشہ خوش حال رہی۔ انگریزی دستاویزات میں انہیں "ہرہائینس" لکھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنا لقب "زیب النساء" برقرار رکھا۔ بیگم شمرو رحم دل، ہمدرد اور نیک طبع خاتون تھیں۔ اپنی ریاست میں انہوں نے امن و امان قائم رکھا اور زیردستوں کو حصول اشخاص کے جور و ظلم سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ مال گذاری بلا جبر وصول کی۔ ان کے دور میں تجارت و زراعت کو فروغ ملا۔ وہ باپ کی طرف سے عرب، ماں کی طرف سے ایران نژاد ہندوستانی اور شوہر کے رشتے سے جرمن کی اہلیہ تھیں۔ ظفر قریشی دہلوی نے لکھا ہے کہ جنگ کے میدانوں میں مردوں کی بسالت اور جوشِ کارزار کا نمونہ بن کر افواج کی کمان کرتی تھیں۔ حملہ کرنے میں شیرنی کی طرح ہولناک اور تند ثابت ہوتی تھیں۔ فیصلہ کرتے وقت ہر چیز کا پس و پیش سوچتی تھیں پھر مشورہ کرتی تھیں اور فیصلہ پر قائم رہتی تھیں۔ بلا امتیاز مذہب مساویانہ سلوک کرتی تھیں مگر مذہب تبدیل کرنے کے بعد مسیحیوں کی بہت مدد کرنے لگی تھیں۔ اسی وجہ سے دور دور سے عیسائی سردھنہ اور اس کے قرب و جوار میں آباد ہوئے۔ وہ کیتھولک مسلک سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہمیشہ دیسی بود و باش رکھی۔ نہ لباس تبدیل کیا اور نہ ولایتی کھانے کھائے ہمیشہ پردہ کے پیچھے بیٹھ کر بات کرتی تھیں۔ تحائف دینے کے معاملے میں فراخدل تھیں۔ جس وقت ان کی جاگیر انگریزوں کے قبضہ میں آئی اس وقت زر نقد نصف کروڑ کے قریب نکلا۔ ان کا ایک وارث ڈیوڈ آکٹر لونی سومبر تھا یعنی شمرو کا پڑپوتا۔ اس کی یادگار میں کلکتہ میں ایک مینار بھی ہے جو اختر لونی کا مینار کہلاتا ہے۔ آکٹر لونی بگڑ کر اختر لونی زبان زد ہوا۔ بیگم کے مرنے کے بعد ان کی وصیت کے مطابق بیگم شمرو کے معالج ڈاکٹر طامس ڈریور کو بیس ہزار روپے اور پاپائے روم کو ڈیڑھ لاکھ روپے خیراتی کاموں کے لئے دیے گئے۔ ان کی دولت مختلف لوگوں میں وصیت کے مطابق تقسیم کی گئی۔

بیگم شمرو نے سردھنہ میں ایک بڑا گرجا گھر تعمیر کرایا تھا جو اب تک ان کی عظمت و شوکت کی یادگار ہے۔ یہ گرجا ایک اطالوی افسر میجر ریگیلینی نے چار لاکھ روپے کے صرفہ سے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا افتتاح ۱۸۲۲ء میں ہوا۔ اس گرجا کا اندرونی حصہ بے پور کے سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ گرجا کے اوپر

چھوٹے اور دو بڑے مینار ہیں جن میں گھنٹہ لگا ہوا ہے۔ گرجے کی تعمیر کے بعد بیگم نے ایک عالیشان محل اپنے لئے بنوایا اور اس سے کسی قدر چھوٹا دہلی میں بھی بنوایا۔ انہوں نے میرٹھ میں کیتھولک فرقہ کے لئے ایک گرجا' ایک بڑا بنگلہ اور رفاہِ عام کے نقطہ نظر سے دیگر عمارات تعمیر کرائیں۔ سردھنہ کا محل ۲۵ نہایت عمدہ تصاویر سے آراستہ تھا۔

ڈائس سومبر نے بیگم کی روح کے لئے ۲۷ جنوری ۱۸۴۹ء کو روم کے گرجا میں دعا کا اہتمام کیا اور وہیں سردھنہ کے گرجا کے لئے سنگِ مرمر کے وہ مجسمے تیار کرائے جو اب تک سردھنہ کے تاریخی گرجا کی زیب و زینت اور باعث شہرت ہیں۔ یہ مجسمے قد آدم سنگ رخام سے تیار کئے گئے ہیں۔ ایک اونچے تخت پر بیگم کا مجسمہ متمکن ہے۔ بیگم ہندوستانی لباس میں تخت پر بیٹھی ہیں اور ان کے ہاتھ میں شاہ عالم ثانی کا وہ فرمان ہے جس کی رو سے جاگیر سردھنہ ان کے نام بحال رکھی گئی تھی۔ تخت سے نیچے داہنی جانب بیگم کے پڑ پوتے ڈائس سومبر اور بائیں جانب ان کے وزیر دیوان رائے سنگھ کے مجسمے ہیں۔ تخت کے پیچھے ایک جانب بیگم کے ایڈیکانگ عنایت اللہ اور دوسری جانب بشپ بیزر کے مجسمے ہیں۔

تخت کے نیچے تین جانب سنگِ مرمر کی لوحیں نصب ہیں۔ ان الواح پر ابھری ہوئی مورتیں کندہ ہیں۔ سامنے کی لوح پر گرجا کے افتتاح کی رسم کندہ ہے۔ بیچ میں بشپ بیٹھا ہوا ہے اور بیگم مع اپنے ہمراہیان تحائف لے کر بشپ کی طرف آ رہی ہیں۔ تخت کی داہنی جانب کی لوح پر ایک جلوس کندہ ہے جس میں بیگم ثمرو ایک ہاتھی پر سوار ہیں۔ ان کے علاوہ چھ مجسمے اور ہیں۔ داہنی طرف پہلا مجسمہ ایک عورت کا ہے جو ایک پتھر پر اپنا پیر رکھے ہوئے ہے یہ مجسمہ عزم اور شجاعت ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا مجسمہ ایک عورت کا ہے جو اپنے جسم پر ایک چادر لپیٹے ہوئے اور اپنے داہنے ہاتھ میں ایک سانپ لئے ہوئے غور اور فکر میں مستغرق ہے۔ یہ مجسمہ پیش بینی کا ہے۔ تیسرا مجسمہ وقت کا ہے جس میں ایک فرشتہ ایک شیشہ ریگ ہاتھ میں لئے ہوئے بیگم کی جانب بڑھ رہا ہے اور دوسرے ہاتھ میں شمعِ حیات گل کر رہا ہے۔ شیشہ میں ریگ سے اوپر کا نصف حصہ خالی ہو گیا ہے۔ گویا کہ حیاتِ مستعار نہیں رہی۔ تخت کی بائیں جانب پہلا مجسمہ ماں کی ممتا ظاہر کرتا ہے جس میں ایک عورت اپنے شیر خوار بچہ کو دودھ پلا رہی ہے اور اس کے آگے ایک لڑکا کھڑا ہے جو سیب پیش کر رہا ہے۔ یہ ثمرِ محبت خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرا مجسمہ ایک عورت کا ہے جس کا چہرہ بشاش ہے اور جس کے ہاتھ میں ایک گلدان انواع و اقسام اور غلوں کی بالوں سے بھرا پڑا ہے اور وہ ایک گلدستہ پیش کر رہی ہے۔ یہ مجسمہ فراوانی اور اچھے وقت کا ہے۔ تیسرا مجسمہ رنج کی تصویر ہے۔ یہ مجسمے صنعت سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے ہیں اور قابلِ دید ہیں اور ایسے ہیں کہ ہندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

بیگم ثمرو کا محل سردھنہ مشن کے پاس ہے۔ محل کے دربار ہال میں چھبیس عمدہ پینٹنگ تھیں جنہیں اتار کر یو۔ پی کی حکومت نے عجائب خانے میں رکھوا دیا۔ سومبر کی اولاد میں آخری آدمی ڈائس سومبر تھا جس کا

۱۸۵۱ء میں لندن میں انتقال ہوا۔ ۱۸۶۷ء میں اس کی لاش سردھنہ لا کر اس کی دادی بیگم شمرو کے پہلو میں دفن کی گئی اور اس کے ساتھ جرمن قسمت آزما سپاہی والٹرزین ہارڈ عرف سومبر عرف شمرو کے خاندان کی آخری یادگار بھی مٹ گئی۔ اب سردھنہ کے گرجا گھر کے علاوہ بیگم آباد' بیگم کا پل میرٹھ' میرٹھ چھاؤنی کا ایک گرجا' سردھنہ کا محل اور دہلی کا باغ بیگم شمرو ان کی یادگار ہیں۔

شباب اردو' مارچ ۱۹۲۲ء' بیگم شمرو: محمد احمد شیبانی ایم اے

آج کل' ۱۵ دسمبر ۱۹۴۳ء بیگم شمرو: ظفر قریشی دہلوی

بیگم محمد شریف

تحریک آزادی اور تحریکِ پاکستان میں کئی باہمت اور پرعزم خواتین نے تاریخی کردار ادا کیا۔ اگرچہ اس زمانے میں خواتین کا تعلیم حاصل کرنا اور مخلوط اجتماعات میں شریک ہونا کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں تھا۔ پھر بھی باشعور خواتین نے اپنے ہم جنسوں میں تعلیم کو فروغ دیتے' ان میں قومی غیرت و حمیت کو بیدار کرنے اور اپنی قوم کے اس موثر طبقے کو متحرک کرنے میں یادگار خدمات انجام دیں۔ طبقہ نسواں میں ایسی ہی ایک پرجوش و باعمل خاتون بیگم محمد شریف تھیں۔

محترمہ کا نام جمیلہ تھا۔ اور سن ولادت ۱۹۰۶ء' یہ وہی سال ہے جس میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ انبالہ کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کی روایات کی امین تھیں۔ والد نور احمد صاحب ایک مفکر اور ماہرِ تعلیم تھے۔ انہوں نے کئی کتب تصنیف کیں۔ ان کی ایک کتاب "تذکرہ و تکلمہ" کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا۔ یہ کتاب برٹش لائبریری کے ذخیرہ کتب کا حصہ ہے۔

جمیلہ صاحبہ کی شادی میرٹھ کے ایک ممتاز قانون دان ریکسز یشن محمد شریف صاحب کے ساتھ ہوئی۔ سیاسی حلقے بیگم محمد شریف کے نام سے ہی پہچانتے ہیں۔ آپ ایک متحرک و فعال مسلم لیگی خاتون تھیں۔ آپ نے تحریکِ پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ میرٹھ کی خواتین نے ۱۹۳۶ء میں بیگم نواب محمد اسمٰعیل خاں کی رہنمائی میں مسلم لیگ کا خواتین ونگ منظم کیا۔ بیگم محمد شریف بھی اس کی بانیوں میں سے تھیں۔ خواتین مسلم لیگ کا بیگم شریف کو سیکرٹری منتخب کیا گیا اور بیگم نواب محمد اسمٰعیل خان کی رحلت کے بعد ۱۹۴۰ء میں صدارت کی ذمہ داریاں سپرد ہوئیں۔

۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کا میرٹھ میں کنونشن منعقد ہوا' جس کے مہمان خصوصی قائداعظم تھے۔ اس کنونشن میں بیگم شریف نے مدلل اور پرجوش خطاب کیا۔ قائداعظم نے محترمہ کی تقریر کو بہت سراہا اور انہیں ہدایت کی کہ یو۔پی کے پس ماندہ اور سیاسی طور پر بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کرنے کے لئے خصوصی دورہ کریں۔ قائداعظم کی خواہش پر بیگم شریف نے پردہ کو برقرار رکھتے ہوئے یو۔پی کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو باور کرایا کہ ان کے لئے متحد ہونا کتنا ضروری ہے اور اس کے لئے مسلم لیگ کا پلیٹ فارم سب سے زیادہ مناسب ہے۔ محترمہ کی کوششوں سے ہزاروں افراد نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور اپنی رائے کی اہمیت سے آگاہی حاصل کی۔ بیگم شریف کا یہ دورہ پاکستان کے حصول میں بہت معاون رہا۔ آپ نے اس سفر میں بڑی تعداد میں مسلمانوں کو مسلم لیگ کا ممبر بنایا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں دوسرے اکابرین کی طرح پاکستان ہجرت کی اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ یہ دور نہایت صبر آزما تھا' نوزائیدہ ملک مختلف قسم کے مسائل سے دوچار تھا۔ جن میں

ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی آبادکاری ایک اہم قومی فریضہ تھی۔ بیگم شریف نے اس مرحلے پر بھی اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ آپ نے شعبہ نسواں انجمن مہاجر کے پلیٹ فارم سے آبادکاری کے منصوبوں میں گہری دلچسپی لی۔ وزیر آبادکاری فضل الرحمٰن کی خواہش پر مہاجرین کی آبادکاری کے کاموں میں حصہ لیا۔ جہانگیر روڈ اور مارٹن کوارٹرز کی تعمیر میں دلچسپی لی۔ اسی دور میں محترمہ کراچی وومن مسلم لیگ کی صدر بنائی گئیں اور بعد میں صوبہ مسلم لیگ کی نائب صدر ہوئیں۔

بیگم محمد شریف نے سماجی، تعلیمی اور مذہبی شعبوں میں اپنی بھرپور توانائی صرف کی۔ آپ نے انجمن تبلیغ اسلام کی بنیاد رکھی اور غریبوں کو مفت تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صدر انجمن ترقی اردو پاکستان نے بیگم شریف کو انجمن کے شعبہ خواتین کا صدر بنایا۔ بیگم صاحبہ آخری سانس تک اس عہدے پر کام کرتی رہیں۔ ۱۹۹۲ء میں آپ نے جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔

بیگم محمد شریف کی تحریک پاکستان اور سماجی، تعلیمی اور مذہبی خدمات کے اعتراف میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے تمغہ خدمت عالیہ کے ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

آپ کی اولاد میں چار بچے ہیں۔ بڑے صاحبزادے اقبال نعیم پاشا نے اپنے والد کے شعبہ کو اپنایا موصوف ایک ممتاز قانون داں ہیں۔ دوسرے بیٹے فیروز قیصر سینئر چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہیں۔ ان کو ایک مرتبہ صدر پاکستان اور دوسری بار وزیر اعظم پاکستان کا اکنامک ایڈوائزر مقرر کیا گیا۔ یہ عہدہ مرکزی وزیر کے برابر تھا۔ بیٹیوں میں رئیس سلطانہ ماہر تعلیم ہیں اب ریٹائر ہو چکی ہیں۔ دوسری صاحبزادی انیس زیدی فیڈرل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج فار وومن، واہ کینٹ کی چھتیس سال پرنسپل رہیں۔

بیگم شریف کو خواتین میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ آپ کی انتھک محنت اور منصوبہ بندی نے پہلے تحریک پاکستان اور پھر تعمیر پاکستان میں وہ کردار ادا کیا ہے، جو مشعلِ راہ رہے گا۔

نواب جلال خاں

نواب جلال خان نام اور دلیر خان خطاب تھا۔ نواب دریا خان کے بیٹے اور نواب بہادر خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۳۰۔۱۰۲۹ھ میں ان کی ولادت موضع پوٹھ ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے بڑے بھائی نواب بہادر خاں کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۰۵۴ھ میں نواب بہادر خاں کے ہمراہ پرگنہ کانتھ کے سرکش رہزن راجپوتوں کی سرکوبی میں دلیرانہ حصہ لیا اور بادشاہِ وقت سے انعام و اکرام پایا۔

نواب جلال خاں نے شہزادہ شجاع کی فوج کے نامور سردار مرزا بیگ کو سیتل گھاٹ پر شکستِ فاش دی اور وہ زخمی ہو کر میدانِ جنگ سے فرار پر مجبور ہوا۔ تسخیر قلعہ سیملہ گڑھ ایک اہم واقعہ ہے جس میں دلیر خاں نے نمایاں حصہ لیا۔ محمد عبید اللہ خاں نے "یادگارِ سلف" میں تحریر کیا ہے "جب وہ دغاباز آسامی جس کو سپہ سالار خانخاناں نے فوج کا رہبر مقرر کیا تھا دلیر خاں کو قبل از صبح خندق کے کنارہ پر لے گیا جس میں مثل بحرِ زخار کے بے انتہا پانی تھا تو قلعہ کے اوپر سے آسامیوں نے طرح طرح کے حربۂ جانستاں چلانے شروع کئے اور اطراف سے گولے و گولیاں وحقہ ہائے آتش اور تیر و پتھر برسنے لگے مگر مبارزان لشکر شاہی نے باوجود مشاہدۂ مرگِ بے امان کے ثابت قدم رہ کر بڑی مردانگی دی خصوصاً" دلیر خاں و آغر خاں نے برستی آگ میں اپنے ہاتھی آگے بڑھائے۔ ہر چند بعض دل باختہ افغانوں نے سمجھایا کہ اب معاملہ حد سے گزر چکا ہے کہ آگ وپانی سے نجات کی امید ہو' اگر اس بحرِ خوں خوار سے بچ کر نکل بھی گئے تو سوائے پتھروں پر سر ٹپکنے اور جان رائیگاں کرنے کے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے رائے صائب کا مقتضا یہ ہے کہ ہنوز قابوئے وقت باقی ہے' لشکر گاہ کو واپس چلیں اور دوبارہ قلعہ کی تسخیر کی تدبیر کریں۔ لیکن دلیر خان نے فرار کے عار کو گوارہ نہ کیا۔ شہادت کو سرمایۂ نجاتِ دارین جانا۔ فلیبان کو سخت آوازے ڈانٹ کے ہاتھی کو آگے بڑھوایا اور ان کی متابعت میں افغانان جانباز و مبارزان جانفشاں آغر خاں و قرادل خاں وغیرہ بھی تکبیر گویاں پیچھے چلے لیکن خندق پُر آب میں بحالتِ شناوری جس کسی کے گولی لگتی تھی' غرق ہو جاتا تھا پھر سر پانی سے باہر نہ نکالتا تھا اس طرح جماعتِ کثیر درجۂ شہادت سے بہرہ یاب ہوئی اور وہ ملعون آسامی رہبر بھی جو بھاگنے کی فکر میں تھا مگر آغر خاں کے ہمرائیوں نے اس کو باندھ رکھا تھا' بندوق کی گولی لگنے سے غرقِ بحرِ فنا ہوا اور اس موقع پر بادشاہی لشکر کی ایک اور جماعت شہید و زخمی ہوئی۔ تیس چار گولیاں بندوق کی' دلیر خاں کے بھی جوشن پر لگیں مگر ان کے جسم پر لگنے سے پہلے سرد ہو گئیں اور کارگر نہ ہوئیں۔ آخر کار دلیر خاں معہ باقی ماندہ ہمرائیوں کے شناوری کر کے حصار کے نیچے ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں گولی و گولہ نہ پہنچتا تھا اور اپنے زورِ بازو و امداد ہمدمانِ جاں نثار سے جس طرح شہباز اپنے شکار پر جھپٹ کر حملہ کرتا ہے' قلعہ کی دیوار فلک شکوہ پر چڑھ گئے اور ایسی دادِ مردِ شجاعت

دی کہ اگر رستم دستاں ایک شمہ اس داستاں کا سنتا تو زبان انصاف سے گویا ہو کر اپنا نام رستم ہونا پسند نہ کرتا اور اگر افراسیاب ان کی جرأت و جلالت کا مشاہدہ کرتا تو انگشتِ حیرت دانتوں میں دبا جاتا۔ حاصل کلام باوجود ہمرائیوں کی قلت و مخالفین کی کثرت و ہجوم کے دلیر خاں نے حملہ کرکے آسامیوں کی ایک جماعت کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور قلعہ کے باہر بادشاہی لشکر میں فتح کے شادیانے بجنے شروع ہو گئے۔ مخالفین نے مغلوبِ رعب و ہراس ہو کے راہِ فرار اختیار کی۔ اس وقت میر مرتضٰی خاں داروغہ توپخانہ و دیگر بہادر بھی امداد کو پہنچ گئے اور آسامیوں کے گروہا گروہ قلعہ کے ہر گوشہ و کنارہ سے نکل کر بھاگنے لگے۔ جن میں سے اکثر بوقتِ فرار مقتول و اسیر ہوئے۔"

خانخاناں نے اس فتح پر دلیر خاں کے پاس جا کر ان کو اپنے گلے سے لگایا اور بعد تحسین و آفرین کے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔

دلیر خاں نے مختلف جنگوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور اعزازات حاصل کئے۔ انہوں نے ۱۰۹۴ھ میں اورنگ آباد میں عالمِ جاودانی کو رحلت فرمائی۔ ان کی نعش اورنگ آباد سے قصبہ شاہ آباد ضلع ہردوئی میں لا کر اس مقبرہ میں دفن کی گئی جس کو انہوں نے خود اپنی زندگی میں تعمیر کرایا تھا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۶۴ یا ۶۵ سال تھی۔

شاہجہاں نے نواب دلیر خاں کو موضع انگنئی کھیڑہ اور سارا علاقہ بعد جاگیر عطا فرمایا تھا۔ دلیر خاں نے موضع انگنئی کھیڑہ کی جگہ قصبہ شاہ آباد' آباد کیا اور عالی شان مکانات تعمیر کرا کے وہیں سکونت اختیار کی تھی۔ انہوں نے شاہ آباد میں جامع مسجد تعمیر کرائی تو اس سے کچھ فاصلے پر اہلِ ہنود ساکنانِ شاہ آباد کی پرستش کے لئے ایک مندر بھی بنوا دیا جس کا نام سنگھٹ مشہور ہے۔ ان کے اشنان کے واسطے ایک پختہ تالاب بھی تیار کرایا جو مرحوم کے مقبرہ کے متصل موجود ہے۔

یادگارِ سلف: ۲۸۲ تا ۲۷۵

سید جمیل الدین ہجر

سید جمیل الدین ہجر خلف میر ابرار علی اکابر سادات کرام میں سے تھے۔ ان کے بزرگ شہاب الدین غوری کے دور حکومت میں بغداد سے ہندوستان آئے تھے۔ ذا سنہ دہلی میں انہوں نے سکونت اختیار کی تھی۔ میر ابرار علی ایک فاضل شخص تھے۔ وہ دہلی میں نواب بہادر جنگ والی بہادر گڑھ کی سرکار میں عہدہ وکالت سے سرفراز ہوئے اور ایک عرصے تک ان ذمہ داریوں سے بحسن وخوبی عہدہ برا ہوتے رہے۔ اس کے بعد طبیعت کی بے نیازی اور استغنائے مزاج کی وجہ سے گوشہ نشین ہو گئے۔

صادق الاخبار دہلی ۱۸۵۷ء ہی پہلے سے جاری تھا۔ اس کے روحِ رواں سید جمیل الدین ہجر تھے۔ اس وقت دہلی کے تین اخبارات صادق الاخبار' دہلی اردو اخبار اور سراج الاخبار' دہلی کے عوام اور مجاہدوں کو آزادی کے پیغامات پہنچانے اور ان میں جوش و جذبہ قائم رکھنے میں پیش پیش تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے مشہور مقدمہ میں ان اخبارات کے اقتباسات بھی سنائے گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ساتھ جمیل الدین ہجر پر بھی مقدمہ چلا اور ان کو تین سال کی سزائے قید ہوئی۔

سید جمیل الدین ہجر کی ساری زندگی اخبار نویسی میں گزری۔ انہوں نے محب کشور ہند کے نام سے ایک پریس ۱۸۶۱ء میں قائم کیا جس کے مالک مولوی سید اقبال الدین احمد اور مہتمم سید ہدایت علی تھے۔ ۱۸۶۴ء میں میرٹھ کے بڈھانہ محلہ' سپٹ بازار سے ایک ہفت روزہ' 'لارنس گزٹ' ' جاری کیا جس کے مدیر منشی مشتاق اور معاون مدیر منشی نثار علی تھے۔ ۱۸۷۲ء میں ہفت روزہ' 'محب ہند' ' میرٹھ ہی سے جاری کیا۔

سید جمیل الدین ہجر اپنے وقت کے بیباک اور قوم پرست صحافی تھے۔ انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں قوم و صحافت کے لئے وقف کر دی تھیں۔ مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب' 'تاریخ صحافتِ اردو' ' میں لکھا ہے جلب ہجر اپنے علم وفضل کے اعتبار سے بڑے لائق وقابل وتجربہ کار ایڈیٹروں میں شمار ہوتے تھے۔

ہجر ایک پختہ گو شاعر بھی تھے۔ ان کے ذخیرۂ سخن میں نعتیہ کلام بھی ملتا ہے جس میں عقیدت ومحبت کی فراوانی قاری کو متاثر کرتی ہے۔

جناب ہجر کا انتقال ۱۸۸۲ء مطابق ۱۲۹۹ء میں ہوا۔ جارج شور نے تاریخ وفات کہی:

لکھی ہے رنج وغم تاریخ ہم نے

حکیم فصیح الدین رنج ص ۷، ۲ تاریخ صحافت اردو دوسری جلد کا پہلا حصہ ص ۴۳۸ تا ۴۵۵



ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل جالبی

اردو زبان و ادب کے معتبر محقق، مفکر، نقاد اور مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت سے کون واقف نہیں ہے۔ آپ نے مختصر وقت میں اردو زبان و ادب کو شاہکار کتب دی ہیں جو ہمیشہ آپ کے نام و کام کو زندہ رکھیں گی۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ ہیں۔ اس کے باوجود طبیعت میں انکساری، مزاج میں وضعداری، تعلق میں توازن، خلوص، ایثار اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ آپ کی ذات کے جوہر ہیں جو آپ کی مایۂ ناز شخصیت کو دوچند کرتے ہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں یوسف زئی پٹھانوں میں ایک بزرگ سوات سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انہیں بزرگ کی آٹھویں پشت میں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب ہیں۔ آپ کا نام نامی محمد جمیل خاں ہے۔ جس زمانے میں فرسٹ ایئر کے طالب علم تھے، آپ نے اپنا نام جمیل جالبی کر لیا۔ نام کے ساتھ "جالبی" کا لاحقہ اس لئے لگایا گیا کہ اردو کے صفِ اول کے صحافی سید جالب دہلوی اور جمیل جالبی صاحب کے دادا دونوں ہم زلف بھی تھے اور رشتہ کے بھائی بھی۔ جالبی صاحب کے آئیڈیل سید جالب دہلوی تھے۔ اس لئے جالب کی رعایت سے آپ نے اپنے نام کے ساتھ "جالبی" لگا لیا اور آج علم و ادب کی دنیا میں محمد جمیل خاں "جمیل جالبی" کے نام سے معروف و معتبر ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے دادا کا وطن میرٹھ تھا۔ آپ کے والد محمد ابراہیم خاں صاحب کی ولادت بھی میرٹھ میں ہوئی اور اسی شہر میں ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوا۔ جالبی صاحب کے نانا مرزا احمد بیگ صاحب اچھا علمی ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ کے فارسی مکاتیب مرتب کر کے شائع کئے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ اکبری بیگم کو بھی ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے ایک زمانے میں شعر و شاعری بھی کی اور مذہبی موضوعات پر ایک کتاب بھی لکھی۔ آپ کے والد کے ماموں سراج میرٹھی بھی اچھے شاعر تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ولادت اسناد میں یکم جولائی ۱۹۲۹ء ہے۔ لیکن پیدائش کی اصل تاریخ ۱۲ جون

۱۹۲۹ء ہے۔ علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں میٹرک کا امتحان سہارنپور کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے پاس کیا۔ پھر میرٹھ کالج سے ۱۹۴۵ء میں ایف۔ اے اور ۱۹۴۷ء میں بی۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کی اور نامساعد حالات کے باوجود اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ انگریزی میں ایم۔ اے کے بعد اردو میں ایم۔ اے کیا اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ بعد میں سندھ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ ڈی۔ ایس۔ ایس کی اعزازی ڈگری بھی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے کراچی میں بہادر یار جنگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعض دوستوں کے اصرار پر سی۔ ایس۔ ایس کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیابی نے قدم چومے۔ آپ کو انکم ٹیکس افسر بنا دیا گیا۔ ترقی کرتے ہوئے انکم ٹیکس کمشنر کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ تیس سال تک اس محکمہ سے وابستہ رہنے کے بعد قبل از وقت سبکدوشی حاصل کر کے اپنے آپ کو ادب کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ پیش کی گئی۔ علم کی بہتر خدمت کا ایک موقع سمجھتے ہوئے آپ نے اسے قبول کر لیا اور ستمبر ۱۹۸۳ء سے ستمبر ۱۹۸۷ء تک اس عہدے پر انتہائی ذمہ داری کے ساتھ فرائض ادا کئے۔ یونیورسٹی کے ہر شعبہ پر توجہ دی اور ادارے کی ترقی اور فروغ کے ساتھ ساتھ معیار کو بڑھانے کے لئے کوشاں رہے۔ اسی لئے آپ کا دور یونیورسٹی کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر موصوف کو ایک اہم سرکاری ادارے مقتدرہ قومی زبان کا صدر نشین مقرر کیا گیا۔ اس حیثیت میں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اردو کے فروغ اور اس کو سرکاری طور پر رائج کرنے کے لئے انتھک محنت کی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب حصولِ نوادر کمیٹی' قومی عجائب گھر پاکستان' مجلس برائے ترقی و فروغ کتب خانہ جات کراچی' بورڈ آف گورنرز اردو لغت بورڈ کراچی' کمیٹی برائے حصول نجی کتب خانہ جات' قومی لائبریری پاکستان اسلام آباد' مطبوعات کمیٹی : اکادمی ادبیات پاکستان' گورننگ بورڈ نیشنل بک کونسل آف پاکستان' وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان اسلام آباد' محکمانہ انتخاب کمیٹی : وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان' اسلامی تعلیمی کمیشن وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان' انتخابی بورڈ' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اور سینیٹ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے رکن رہے ہیں۔ پاکستان کلچر سوسائٹی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اکادمی کے صدر' لغت بورڈ کے اعزازی صدر اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمد رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بورڈ آف گورنرز قائد اعظم اکادمی' صوبائی تعلیمی کونسل : حکومت سندھ کراچی' مشاورتی بورڈ اقبال اکادمی' بورڈ آف گورنرز اردو سائنس بورڈ لاہور' بورڈ آف گورنرز وفاقی اردو آرٹس کالج کراچی' محققین و ادباء بہبود فنڈ بورڈ : اکادمی ادبیات پاکستان' اسلام آباد اور اپیل کمیٹی وفاقی حکومت اسلام آباد کے رکن اور مشاورتی بورڈ : اردو لغت بورڈ کراچی' پاکستان لائبریری ایسوسی

ایشن اور بہترین مطبوعات کمیٹی نیشنل بک کونسل آف پاکستان اسلام آباد کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی ہے جن میں پی۔ ای۔ این انٹرنیشنل کانگریس فرینکفورٹ : ۱۹۵۹ء' جشنِ اقبال صدی نئی دہلی : ۱۹۷۷ء' سیمینار میر تقی میر' جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی : ۱۹۸۳ء' سیمپوزیم رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ : ۱۹۸۶ء' عالمی اردو کانفرنس مارشیس : ۱۹۹۱ء' خطباتی و ثقافتی دورہ ایران : ۱۹۹۲ء اور سارک ممالک کا پہلا میلہ و سیمینار بھارت : ۱۹۹۲ء شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے بابائے اردو یادگاری خطبہ کراچی : ۱۹۸۰ء' روزنامہ "سیاست" توسیعی خطبہ حیدر آباد دکن : ۱۹۸۳ء' علامہ اقبال یادگاری خطبہ پنجاب یونیورسٹی لاہور : ۱۹۸۵ء' فیض میموریل لیکچر اردو مرکز لندن : ۱۹۸۸ء' ڈاکٹر عابد حسین میموریل لیکچر نئی دہلی : ۱۹۸۹ء اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری خطبہ کراچی : ۱۹۹۳ء یادگار خطبات دیئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی پہلی تحریر "بنات" دہلی اور پہلا مضمون "بابائے صحافت میر جالب دہلوی" مسلم علی گڑھ میں ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ آپ کی پہلی شائع ہونے والی کتاب "جانورستان" تھی۔ یہ جارج آرول کا ناول تھا۔ یہ ترجمہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ بعد میں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے تنقید' تحقیق' لغات' کلچر' تاریخ ادب' تراجم اور شخصیات کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے شاہکار نہیں تاریخ ساز کتب تحریر کیں۔ یہ گرانقدر تصانیف تشنگانِ علم و ادب کی ہمیشہ رہنمائی کرتی رہیں گی۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ہر کتاب کے سامنے صرف پہلے ایڈیشن کا سنِ اشاعت درج ہے۔

تنقید :

۱۔ تنقید اور تجربہ (۲۲ تنقیدی مضامین کا مجموعہ) : ۱۹۶۷ء
۲۔ نئی تنقید (۳۲ تنقیدی مضامین کا مجموعہ) : ۱۹۸۵ء
۳۔ ادب کلچر اور مسائل (۵۶ تنقیدی مضامین کا مجموعہ) : ۱۹۸۶ء
۴۔ محمد تقی میر : ایک مطالعہ : ۱۹۸۱ء
۵۔ معاصر ادب (۹۹ تنقیدی مضامین کا مجموعہ) : ۱۹۹۱ء
۶۔ قومی زبان یک جہتی نفاذ اور مسائل : ۱۹۸۹ء
۷۔ قلندر بخش جرأت لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر : ۱۹۹۰ء

تحقیق :

۱۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (اردو زبان کی پہلی معلوم تصنیف) : ۱۹۷۳ء

٢۔ دیوان حسن شوقی : ١٩٧١ء

٣۔ دیوان نصرتی : ١٩٧٢ء

٤۔ قدیم اردو کی لغت : ١٩٧٣ء

٥۔ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ' جلد اول و دوم : ١٩٩١ء

کلچر :

١۔ پاکستانی کلچر (قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ) : ١٩٦٣ء

٢۔ PAKISTAN THE IDENTITY OF CULTURE

٣۔ CHANGING WORLD OF ISLAM

٤۔ PAKISTAN COUNTRY

تاریخ ادب :

١۔ تاریخ ادب اردو جلد اول (تحقیق' تنقید' کلچر' تاریخ) : ١٩٧٥ء



حیرت ناک کہانیاں: ڈاکٹر جمیل جالبی

۲۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول : ۱۹۸۲ء

۳۔ تاریخِ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم : ۱۹۸۲ء

تراجم :

۱۔ جانورستان : ۱۹۵۸ء

۲۔ ایلیٹ کے مضامین (ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے ۳۰ تنقیدی مضامین کا ترجمہ ایلیٹ کے بارے میں ۴ مضامین کے ساتھ)

۳۔ ارسطو سے ایلیٹ تک (ڈھائی ہزار سالہ مغربی فکر کے منتخب شاہکار ادب پاروں کا اردو ترجمہ مع تعارف) : ۱۹۷۵ء

۴۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت (پروفیسر عزیز احمد کی شہرہ آفاق تصنیف اسلامی موڈرن ازم کا اردو ترجمہ) : ۱۹۸۹ء

۵۔ برصغیر میں اسلامی کلچر (پروفیسر عزیز احمد کی بین الاقوامی شہرت یافتہ کتاب اسلامک کلچر کا اردو ترجمہ) : ۱۹۹۰ء

مرتبہ کتابیں :

۱۔ حاجی بغلول منشی سجاد حسین : ۱۹۶۰ء

۲۔ بزمِ خوش نفساں (شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ) : ۱۹۸۵ء

۳۔ ن۔ م۔ راشد۔ ایک مطالعہ : ۱۹۸۶ء

۴۔ کلیاتِ میراجی : ۱۹۸۹ء

۵۔ میراجی۔ ایک مطالعہ : ۱۹۹۰ء

سندھی میں ترجمہ شدہ کتابیں :

۱۔ پاکستانی کلچر

۲۔ حیرت ناک کہانیاں

ان کے علاوہ قومی انگریزی لغت : ۱۹۹۲ء۔ انگریزی اردو کی یہ لغت اب تک شائع ہونے والی ساری لغات سے نہ صرف ضخیم تر ہے بلکہ تمام جدید الفاظ اس لغت میں آ گئے ہیں۔ الفاظ اور اندراجات کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہے اور ہر لفظ کے معنی اور اس کے مختلف روپ کو اس میں پیش کیا گیا ہے۔ مترادفات بھی اس لئے دیئے گئے ہیں تاکہ مترجمین اپنے مطلب کا لفظ آسانی سے تلاش کر سکیں۔ اس لغت کی اب تک پچاس ہزار سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ یہ لغت ہندوستان میں دہلی سے بھی

شائع ہو چکی ہے۔

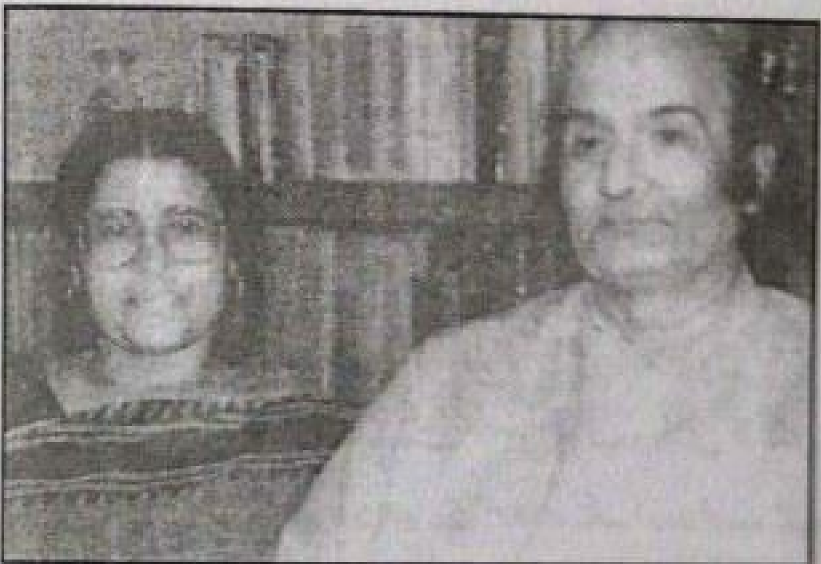
ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے تحقیقی مضامین "تہذیبی اور سماجی موضوعات اور کتابوں پر لکھے پیش لفظ اور تبصرے بھی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ آپ کے ڈیڑھ سو سے زائد انٹرویوز ہوئے ہیں' جو مختلف اخبارات' رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ نے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی ۱۹۸۸ء تک کی تحریروں کی وضاحتی فہرست مرتب کر کے "ڈاکٹر جمیل جالبی : سوانحی کتابیات" کے نام سے لاہور سے ۱۹۸۸ء میں شائع کی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے آپ کی شخصیت اور فکر و فن پر ایک کتاب "ڈاکٹر جمیل جالبی : ایک مطالعہ" ۱۹۹۲ء میں تالیف کی جو "نقوش" لاہور کے زیر اہتمام چھپی ہے۔ یہ کتاب ۴۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ بہت سی تصاویر کے صفحات اس کے علاوہ ہیں۔ برصغیر کی تقریباً تمام اہم علمی و ادبی شخصیات کے ڈاکٹر صاحب سے متعلق مضامین اس کتاب کی زینت ہیں۔ ان مضامین میں آپ کی شخصیت کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر آپ کی کتب کی اہمیت اور افادیت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اگست ۱۹۵۵ء میں سہ ماہی "نیا دور" کراچی سے جاری کیا جو ۱۹۹۲ء تک شائع ہوتا رہا۔ یہ ادبی جریدہ ان دو ایک پرچوں میں سے ایک ہے جنہیں ادب و دانش کا حقیقی معنوں میں ترجمان کہا جا سکتا ہے۔ یہ جدید ادب کا علمبردار تھا اور ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۲ء تک اردو ادب میں جو رجحانات ابھرے'



بارہ کہانیاں: ڈاکٹر جمیل جالبی

ان کا اظہار سب سے زیادہ اسی رسالے میں ہوا۔ اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ اس عرصے میں اردو ادب کن کن راستوں سے گزرا، کن رجحانات سے تخلیقی ادب کا عمل جاری رہا تو "نیا دور" کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اردو کے بہترین مصنفوں کی بہترین تحریریں اس رسالہ میں شائع ہوئیں۔ اس سے پہلے آپ نے ابتدائی دور میں ماہنامہ "ساقی" کراچی میں جون ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک "باتیں" کے عنوان سے ہر ماہ ادبی کالم لکھے۔ یہ ادبی کالم آپ سے پہلے فراق گورکھپوری اور میراجی لکھتے رہے تھے۔ ماہنامہ "علامت" لاہور میں بھی تقریباً دس سال ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۹ء تک ہر ماہ "ادبی زاویے" کے عنوان کے تحت



ڈاکٹر جمیل جالبی اور بیگم جمیل جالبی

ادب و فکر کے جدید ترین موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نوجوانی میں شاعری کی لیکن جلد ہی احساس ہوا کہ شاعری سے کہیں زیادہ اہم کام نثر میں ہو سکتے ہیں۔ اس لئے شاعری سے توجہ ہٹالی اور نوجوانی کا یہ دانش مندانہ فیصلہ اردو کے حق میں سو فیصد درست رہا۔

ذاتی زندگی میں بھی خوش قسمتی ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے لئے سایۂ رحمت بنی رہی۔ یکم نومبر ۱۹۵۳ء کو آپ کی شادی خاندان ہی کی ایک صاحبزادی نسیم شاہین صاحبہ سے ہوئی۔ ذہنی رفاقت نے ڈاکٹر صاحب کو پرسکون ماحول میں کام جاری رکھنے کے مواقع فراہم کئے۔ آپ نے اپنی ایک اہم کتاب "پاکستانی کلچر" کو اپنی اہلیہ کے نام معنون کرتے ہوئے لکھا ہے "نسیم شاہین کے نام : محبت گلشن دل بہار است"۔ آپ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں چمنستان رنگ و بو میں بہار دل افروز دکھا رہے ہیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر خاور جمیل ہیں جن کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ "شاہ عالم ثانی آفتاب : احوال و ادبی خدمات" شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے صاحبزادے محمد علی ہیں۔ بیٹیوں میں سمیرا جمیل اور فرح جمیل ہیں۔ یہ سب اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی خدمات کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ آپ نے جو کام کیے ہیں، وہ آج کل اداروں سے بھی ممکن نہیں ہیں۔ ابھی آپ کا علمی سفر جاری ہے اور مزید اہم کاموں کی توقع کی جاسکتی ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں



(حاشیہ)

سید جالب دہلوی

سید بشارت حسین جالب اپنے تخلص ہی سے مشہور تھے۔ آپ دہلی کے ایک معزز خاندان سے تھے۔ عہد مغلیہ میں اس خاندان کے افراد اعلیٰ مناصب پر فائز تھے مگر ۱۸۵۷ء میں دہلی کے دوسرے شرفاء کے ساتھ آپ کا خاندان بھی متاثر ہوا اور امارت و فارغ البالی رخصت ہو گئی۔ آپ کے والد نے ثابت قدمی سے مصائب زمانہ کا مقابلہ کیا اور شال دوزی کو ذریعہ معاش بنا کر اطمینان کے ساتھ زندگی کا سفر مکمل کیا۔

۱۸۷۴ء میں جب سید جالب پیدا ہوئے تو گھر میں خوشحالی کا دور دورہ تھا مگر چند سال کے بعد بعض حالات کی وجہ سے بے فکری رخصت ہو گئی۔ اس حالت میں سید صاحب کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہونا بظاہر مشکل تھا۔ مگر کارساز حقیقی نے ایسا انتظام کر دیا کہ جالب صاحب عمدہ تعلیم حاصل کر سکے۔ آپ کے والد کے دوست و ہمدرد صاحب علم مرزا مغل نے جو خاندان شاہی کے ایک رکن تھے اور حکومت سے وظیفہ پاتے تھے، آپ کو سایہ عاطفت میں لے لیا اور اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی باقاعدہ تعلیم کا اہتمام کیا۔ سید جالب صاحب اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی میں تعلیم پاتے تھے جہاں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی اور خواجہ تصدق حسین مدرس تھے۔ ذہن رسا رکھتے تھے اس لئے جالب صاحب نے

اساتذہ خوش تھے۔ مدرسہ کے اوقات کے علاوہ بھی ان اساتذہ سے ان کے مکانات پر جا کر تحصیل علم کرتے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں انٹرنس پاس کر کے سینٹ اسٹیفنس کالج میں داخل ہوئے مگر خانگی مجبوریوں کی وجہ سے صرف ایف۔ اے تک پہنچ کر کالج چھوڑ دینا پڑا۔

سید جالب دہلوی ابتداء سن شعوری سے شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں میر مہدی مجروح سے اصلاح لیتے رہے پھر مرزا داغ دہلوی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ مشق سخن جاری تھی کہ آپ اخبار نویسی کی طرف متوجہ ہو گئے جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ شعر گوئی موقوف ہو گئی۔ سید ناظر علی شہرت کی تحریک سے آپ نے مضامین نگاری شروع کی اور سب سے پہلے مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے اخبار "اکمل الاخبار" میں اعزازی مدیر کی حیثیت سے کام کیا اس کے ساتھ ہی بعض دوسرے اخباروں میں بھی مضامین لکھتے رہے۔ "اودھ اخبار" لکھنؤ میں آپ کے مضامین زیادہ شائع ہوتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار منشی نولکشور دہلی گئے تو اپنے اخبار میں کام کرنے کے لئے سید صاحب کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے آئے مگر منشی صاحب کے انتقال کے بعد آپ نے ملازمت ترک کر دی اور دکن گزٹ بمبئی میں معاون مدیر کی حیثیت سے فرائض بحسن و خوبی انجام دئے۔ اس کے بعد اخبار "وکیل" امرتسر اور "پیسہ اخبار" لاہور میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ چند سال بعد دہلی واپس آئے اور ۱۹۰۳ء میں اخبار "شریف" کے ایڈیٹر ہو گئے مگر ایک سال بعد پھر "پیسہ اخبار" کی ادارت سنبھال لی۔ اس طرح ۱۹۱۳ء تک مختلف اخباروں میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں جب محمد علی جوہر مرحوم نے "ہمدرد" دہلی جاری کیا تو آپ کو دہلی بلا لیا گیا۔ "ہمدرد" کے بند ہونے پر ۱۹۲۶ء میں آپ نے "ہمدم" لکھنؤ کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور تقریباً بارہ سال متواتر اس کے ایڈیٹر رہے۔ "ہمدم" سے علیحدہ ہونے پر اپنا ذاتی اخبار "ہمت" لکھنؤ سے جاری کیا۔ اسے آخری وقت تک جاری رکھا اور آپ کے بعد بھی جاری رہا۔ چند روز علیل رہ کر جولائی ۱۹۳۸ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔

سید جالب دہلوی ایک وسیع المطالعہ اور وسیع النظر صحافی تھے۔ آپ کی وسیع معلومات کا ہر شخص معترف تھا۔ آپ نے نیک نیتی کے ساتھ ہر معاملہ و مسئلہ پر اظہار خیال کیا اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ دیا نرائن نگم نے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے "اردو اخبار نویسوں میں سید جالب کی قابلیت کے بہت کم اخبار نویس ہیں۔ وسیع تجربہ، زبردست حافظہ، مفصل اور مدلل تحریر کے لحاظ سے اردو اخبار نویسوں میں آپ خود ہی اپنے نظیر تھے"۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے "سید جالب کا وجود اگر لکھنؤ میں نہ ہوتا تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اخباری حیثیت سے لکھنؤ کا کوئی وزن نہ ہوتا، سید جالب مرحوم کا قلم نہایت محتاط، مرنج و مرنجان اور طرز ادا نہایت صاف، سہل اور رواں تھا۔ ان کی معلومات اس قدر وسیع تھیں کہ جس مسئلہ پر کچھ لکھتے تھے اس کے ہر پہلو کو نمایاں کر دیتے تھے۔ اپنے محتاط اظہار خیال اور متین طریقہ تعبیر کی وجہ سے وہ ہر ایک طوفان سے اپنی کشتی ہمیشہ سلامت لے گئے"۔

ماخذ : زمانہ کانپور، ستمبر ۱۹۳۸ء۔۔۔۔ ماخذ : یاد رفتگاں، ص ۱۰۸، ۱۰۹

مولوی چراغ علی

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی اُن قد آور شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی محنت سے دنیا میں بلند مرتبہ مقام حاصل کیا اور ایک معمولی منشی سے عملی زندگی کا آغاز کرکے اپنی خداداد ذہانت' لیاقت اور جدوجہد سے اعلیٰ مناصب تک کا سفر کامیابی سے مکمل کیا۔ بابائے اردو نے ان کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا ہے "وقار اور متانت ان پر ختم تھی' استقلال میں پہاڑ تھے' آزاد خیال ایسے تھے کہ سچ بات کہنے یا لکھنے میں کبھی نہ چوکتے تھے' مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے' اسلام کے حامی تھے اور ان کی عمر اور محنت کا زیادہ حصہ اسی میں گزرا۔ ان سے پہلے دو شخصوں نے انگریزی زبان میں یورپین مصنفین کے اعتراضات کی تردید اور اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی تھیں' ایک تو سرسید جن کی کتاب خطباتِ احمدیہ کا انگریزی میں ترجمہ ہوا اور دوسرے رائٹ آنریبل مولوی سید امیر علی بالقابہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی نے اس بحث پر کتابیں لکھی ہیں اس کی اس وقت تک نظیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود ان کے حریف ریورنڈ کینن میکال نے ان کے علم و فضل اور تحقیق کو تسلیم کیا ہے لیکن باوجود اس کے نہایت بے تعصب تھے اور کسی مذہب و ملت سے انہیں خصومت یا پرخاش نہ تھی' یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے"۔

مولوی چراغ علی کے آبا و اجداد سری نگر (کشمیر) کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا ایک مدت تک پنجاب میں ملازم رہے اور وہاں سے میرٹھ آئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ مولوی چراغ علی کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ میں ملازم ہوئے۔ بعد ازاں ان کا تبادلہ سہارنپور ہو گیا جہاں وہ کلکٹریٹ میں ہیڈ کلرک تھے۔ وہ سہارنپور میں محمد بخش کرانی کے نام سے مشہور تھے۔ کرانی کا لفظ اس زمانے میں انگریزی کلارکوں کے لئے بجائے بابو کے استعمال ہوتا تھا۔ چونکہ مولوی محمد بخش انگریزی داں تھے اور انگریزی لباس بھی پہنتے تھے' اس لئے لوگ انہیں کرانی کہنے لگے۔ پنجاب پر انگریزوں کا تسلط ہونے کے بعد صوبے کے انتظام کے لئے جن تجربہ کار افراد کو منتخب کیا گیا' ان میں مولوی محمد بخش بھی شامل تھے۔

۱۸۴۹ء میں مولوی محمد بخش محکمہ بندوبست میں داخل ہوئے اور بتدریج عہدہ مہتمم بندوبست پر سرفراز ہوئے اور کچھ عرصے صوبہ پنجاب کے اضلاع ملتان' ڈیرہ غازی خاں' جھنگ وغیرہ میں مامور رہے۔ سرحدی اضلاع کے بندوبست سے فارغ ہونے کے بعد ضلع سیالکوٹ میں متعین کئے گئے۔ اس کے بعد ضلع شاہ پور میں اسی اہم کام پر مامور ہوئے۔ اس زمانے میں مہتمم بندوبست جیسا اعلیٰ عہدہ ہندوستانیوں کو شاذ و نادر ہی ملتا تھا۔ یہ عہدہ ڈپٹی کمشنر یا کلکٹر کے عہدے سے کم نہیں تھا۔ مولوی محمد بخش عین عالمِ جوانی میں "غالباً" پینتیس سال کی عمر میں ۱۸۵۶ء میں انتقال فرما گئے۔ انہوں نے چار بیٹے چراغ

علی، ولایت علی، عنایت علی اور منصب علی چھوڑے۔ مولوی چراغ علی بڑے بیٹے تھے جن کی اس وقت عمر بارہ سال سے زائد نہ تھی۔ مولوی محمد بخش مرحوم کا مقبرہ میرٹھ میں موجود ہے۔ والدہ، بیوی اور بچے ان کے انتقال کے بعد میرٹھ میں ہی رہے۔

مولوی چراغ علی میرٹھ میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی دادی اور والدہ کے زیرِ سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی لیکن یہ تعلیم معمولی تھی۔ سوائے معمولی اردو، فارسی اور انگریزی کے، نہ کسی اور علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں کمشنری گوکھپور میں ضلع بستی نیا نیا قائم ہوا تھا، وہاں کے خزانے کی منشی گری پر تقرر ہوا۔ سرکاری کام سے فارغ ہو کر مطالعۂ کتب اور لکھنے پڑھنے میں سارا وقت صرف کرتے تھے۔ پادری عماد الدین کی کتاب "تاریخِ محمدی" کے جواب میں رسالہ "تعلیقات" انہوں نے اسی زمانے میں لکھا۔ منشورِ محمدی اور مخبرِ صادق لکھنؤ وغیرہ میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

مولوی محمد ذکریا صاحب کی تحریک پر ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں مولوی چراغ علی لکھنؤ گئے اور اپنے والد کے ایک محسن گوراسلی سے ملے جو وہاں جوڈیشنل کمشنر تھے۔ اس ملاقات کے نتیجے میں ڈپٹی منصری پر پہلے عارضی اور پھر مستقل تقرر ہو گیا اور بعد میں سیتاپور تبادلہ ہوا۔

مولوی صاحب ابتدا سے ہی مذہبی رجحان رکھتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اسلام کی حقانیت پر قلم اٹھایا یا عیسائی معترضین کے جواب لکھے۔ حیدر آباد سے ترجمے وغیرہ کا کچھ کام سرسید احمد خاں کے پاس آیا تو انہوں نے مولوی چراغ علی کو اس کام کی تکمیل کے لئے منتخب کیا۔ اس لیے ۱۸۷۶ء میں مولوی صاحب رخصت لے کر علی گڑھ گئے اور کئی مہینے سرسید کے پاس رہ کر اس کام کو بحسن و خوبی مکمل کیا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۷۷ء میں نواب سالار جنگ اعظم نے نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی کے ذریعے سرسید سے ایک لائق شخص طلب کیا۔ سرسید نے مولوی چراغ علی کو منتخب کیا اور وہ حیدر آباد چلے گئے۔ جہاں وہ مددگار معتمد مالگزاری ہوئے۔ معتمد خود نواب محسن الملک تھے۔ بعد میں مولوی صاحب معتمد مالگزاری ہو گئے۔ بعد میں صوبہ داری ورنگل پر مامور ہوئے پھر اسی عہدہ پر گلبرگہ تبادلہ ہوا اور پھر نواب محسن الملک کی جگہ معتمد مال و فنانس مقرر ہوئے۔ وہ ایک ذمہ دار اور دیانت دار شخص تھے۔ اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے ادا کرتے تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تحریر کیا ہے۔ "غالباً مولوی چراغ علی سے بڑھ کر کسی شخص نے سرکاری کام کو اس طرح بے لاگ، بے تعلق اور بے لوث رہ کر انجام نہ دیا ہوگا۔ وہ رعایت اور جانبداری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات میں وہ یہ بالکل بھول جاتے تھے کہ ان کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات ان کے پیشِ نظر رہتے تھے اور انہیں پر وہ بلا رُو رعایت فیصلہ کرتے تھے۔ ..... بڑی بڑی مسلوں اور مدتوں کے پیچیدہ معاملات چند سطروں میں سلجھا دیتے تھے اور ۔۔۔۔۔ گویا معاملے کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔ ان کی تحریر جامع و مانع اور حشو و زائد سے

پاک ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ نہایت تیز فہم اور صائب الرائے تھے"۔ مولوی سید علی حسن خاں بہادر سابق معتمد فینانس (وزیر مالیات) حیدرآباد فرماتے ہیں۔ "اصلاح پر سے جو گوشوارے آتے تھے اور ان پر جو مولوی صاحب تنقیح کرتے تھے اس سے ان کی وقتِ نظر اور اعلیٰ درجے کی ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ جو عہدیدار کہ بڑے بڑے دورے کرتے تھے' ہر معاملے کی چھان بین کرتے اور انتظامی معاملات میں باخبر رہتے تھے' ان سے تعلقدار لوگ اتنا نہیں ڈرتے تھے' جتنا مولوی چراغ علی مرحوم کی گھر بیٹھے تحقیقوں کی تنقیح سے۔"

مولوی چراغ علی مطالعے سے بے حد شغف رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی۔ اس ذوق کی انتہا یہ تھی کہ بیت الخلاء میں بھی کتابیں رہتی تھیں اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ تمام وقت تصنیف و تالیف اور مطالعۂ کتب میں صرف ہوتا تھا۔ ان کا کتب خانہ قابلِ دید تھا۔ بابائے اردو تحریر فرماتے ہیں۔ "وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہ تک پہنچتے اور اس کا مال و ماعلیہ کے سراغ میں چپے چپے اور ڈالی ڈالی پھرتے' اور پتال تک کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے' اور لوگوں کو بھیج کر مصر و شام و دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے۔ اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر انہوں نے قلم اٹھایا" دوسروں کے لیے بہت کم گنجائش چھوڑی ہے۔ ان کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا اور مواد فراہم کرنے کے لیے انہوں نے کس قدر محنت اور مشقت اٹھائی ہے۔"

مولوی چراغ علی کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ ہندی موسیقی پر یورپین لوگوں کو اعتراض ہے تو انہوں نے اسے سیکھنا شروع کیا اور پیانو پر گتیں نکالنی شروع کیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہندی موسیقی کو سائنٹیفک طور پر مدون کریں۔ چنانچہ لکھنا بھی شروع کیا تھا۔ اس کا نا تمام مسودہ موجود ہے۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس کام کو مکمل نہ کر سکے۔ علم ہیئت میں بھی مولوی صاحب کو خوب دخل تھا۔

مولوی صاحب متعدد علوم اور کئی زبانوں کے عالم تھے۔ سرسید احمد خاں نے ان کے انتقال کے بعد اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے۔ "متعدد علوم میں نہایت دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی زبان اور عربی علوم کے عالم تھے' فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے۔ عبری و کالدی زبان میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی انہوں نے تصنیف کی ہے۔" مولوی صاحب کی زیادہ تر تصانیف انگریزی میں ہیں۔ ان کی انگریزی کتابوں پر ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات نے جو تبصرے کیے ہیں ان میں مولوی صاحب کی انگریزی تحریر کی

بھی تعریف کی ہے۔ "پائنیر" انگلستان کا مشہور پرچہ ہے جس کی ادبی تنقید کی دھوم ہے۔ اس نے اپنی اشاعت ۵ جنوری ۱۸۸۴ء میں لکھا ہے۔ "مولوی صاحب کی انگریزی قابلِ قدر ہے۔" "جنرل آف دی پنجاب" نے لکھا ہے۔ "مصنف کو انگریزی زبان پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے اور وہ شرح و مذہب اسلام کا بڑا عالم ہے۔"

بابائے اردو نے اپنے تفصیلی مضمون میں لکھا ہے کہ "بجٹ (موازنہ) سب سے اول مولوی چراغ علی نے تیار کیا۔ اگرچہ موازنہ اب کچھ کا کچھ ہو گیا ہے اور خاصہ ایک دفتر ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کا یہ قول ہے جو اختصار اور صفائی اس موازنہ میں پائی جاتی ہے وہ موجودہ موازنہ میں نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آج کل موازنہ کی ترتیب میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے لیکن بغجوائے الفضل للمتقدم فضیلت کی دستار مولوی صاحب مرحوم ہی کے سر رہے گی۔"

مولوی چراغ علی نے ایڈمنسڑیشن رپورٹ بابت ۸۵۔۱۸۸۴ء لکھی جو چھ سو سینتیس بڑے صفحات پر مشتمل ہے، یہ پہلی رپورٹ ہے اور بعد ازاں جتنی رپورٹس لکھی گیئں وہ سب اس کی پیروی میں لکھی گئیں۔

"حیدر آباد (دکن) انڈر سر سالار جنگ" یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ بابائے اردو نے لکھا ہے "مولوی صاحب نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت اور جاں کاہی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر بحث اس میں ان تمام انتظامات اور اصلاحات سے ہے جو سر سالار جنگ اعظم کے عہد میں عمل میں آئیں لیکن جس انتظام اور صیغے پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے، اسے ابتدا سے لیا ہے اور اس کی اصل، تغیرات، وجہِ تسمیہ اور تاریخی حیثیت وغیرہ کو محققانہ طور سے بیان کیا ہے اور اس کے متعلق تمام مواد اور اعداد کو گوشواروں کی صورت میں مہیا کر دیا ہے۔ اس تاریخی اور انتظامی حیثیت کے ساتھ ساتھ ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی کا مقابلہ آس پاس کے صوبہ جات سے بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھے بغیر کوئی شخص حیدر آباد کی گزشتہ اور موجودہ حالت انتظامی سے پورا واقف نہیں ہو سکتا۔

مولوی چراغ علی نے ایک کتاب "جاگیرات و جاگیر داران" شروع کی تھی لیکن بعض حضرات کے عدم تعاون کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکی۔

مولوی صاحب نے اپنی انگریزی اور اردو تصانیف کے ذریعے اسلام کی زبردست مدافعت کی۔ آپ کی معروف تصانیت درج ذیل ہیں:

۱۔ منشورِ محمدی (اردو)۔

۲۔ مخبرِ صادق (اردو)۔

۳۔ تعلیقات (اردو)، لکھنو: ۱۸۷۲ء (عیسائی مشنری امام الدین کی خلاف اسلام کتاب "تاریخ محمدی" کا جواب۔

۴۔ اسلامی جہاد کی وضاحت میں انگریزی کتاب

۵۔ قدیم قوموں کی مختصر تاریخ (۱۸۷۱ء)

۶۔ العلوم الجدیدہ (۱۸۸۳ء تا ۱۸۸۵ء) نامکمل

۷۔ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام (۱۸۸۳ء) انگریزی CONTEMPORARY REVIEW

بابت اگست ۱۸۸۸ء میں شائع شدہ انگریزی مشنری میلکم (MALCOLM)

کے خلاف اسلام انگریزی مضمون بعنوان

IS PROGRESS POSSIBLE UNDER ISLAMIC GOVT

(کیا اسلامی حکومت کے ماتحت ترقی ممکن ہے) کا جواب۔

مولوی چراغ علی میانہ قد اور بھاری جسم کے آدمی تھے۔ ان کے چہرے سے رعب داب اور متانت ٹپکتی تھی۔ چہرہ بھاری بھرکم، سر بڑا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ کم گو تھے، ہر بات میں سنجیدگی اور وقار اور اعلیٰ خیالات رکھنے والے شخص تھے۔ صداقت کے قدردان تھے۔ فضول اور لایعنی باتوں سے انہیں طبعی نفرت تھی۔ کسی سے بے جا تکرار اور بحث نہیں کرتے تھے۔ جس کام کا ارادہ کر لیتے تھے اسے پورا کرتے تھے۔ ہمیشہ ہر قسم کی دھڑے بندیوں سے الگ رہے۔ ہر قسم کے تعصب سے بری تھے۔ اس لیے عوام و خواص ہر مرتبہ کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

مولوی صاحب کو ذیابیطس کی شکایت تھی۔ ۱۰ جون ۱۸۹۵ء کو مع اہل و عیال علاج کے لئے بمبئی تشریف لے گئے۔ انتہائی توجہ سے علاج شروع ہوا مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور عین وقت کا یہ عظیم فرزند ۱۵ جون ۱۸۹۵ء کو داغ مفارقت دے گیا۔ ان کی تدفین بمبئی کے قبرستان میں ہوئی۔ پسماندگان میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ مولوی چراغ علی کی وفات پر تمام اردو انگریزی اخبارات میں اظہار افسوس کیا گیا۔ سرسید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" میں اپنی تعزیتی تحریر میں لکھا "مولوی چراغ علی مرحوم ایک بے مثل اور مرنجان مرنج شخص تھے، ہمارے کالج کے ٹرسٹی اور نہایت بڑے معاون تھے۔ حیدرآباد میں سالار جنگ اعظم نے ان کو بلایا تھا۔ اس زمانے سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدرآباد میں ہوئے اور پارٹیاں بھی قائم ہوئیں مگر ان کو بجز اپنے کام یا شغلے کے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حیدرآباد میں کیا ہو رہا ہے۔ متعدد علوم میں نہایت اعلیٰ درجے کی دستگاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے، عبری و کلدانی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بھی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے بڑے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں کہ ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی، نہایت افسوس اور رنج کے لائق ہے۔"

مولوی چراغ علی کے انتقال پر سید محمود خلف سرسید نے جو فارسی قطعہ میں تاریخ کی صنعت کو مد

پسند کرتے تھے، یہ تاریخ نکالی:

حیف چراغ علی از دنیا نہاں شد ۱۸۹۵ء

مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے قطعہ میں مرحوم کی سیرت کو خوبصورت پیرائے میں نظم کیا۔ فرماتے ہیں:

آہ آہا از رحلت بے گاہِ اعظم یار جنگ — کز میانِ رہ زہمرہاں عناں پیچید و رفت
حیف دنیا را بہ پنجاہ سالگی کردہ وداع — بزمِ مارا بزمِ ماتم بازگردانید و رفت
مستفیداں پُر نہ کردی دامنِ معنی ہنوز — مشتے از گنجینۂ لعل و گہر پاشید و رفت
از سحابِ فیضِ کلکش ناشدہ سیراب خلق — ساعتے برقِ یمانی از افق تابید و رفت
عقد ہانکشودہ ماند و نکتہ ہا نوشتہ ماند — ہر جوئے شیر کوہِ بے ستوں کندید و رفت
کرد بے آزارِ خلق اعمال ساطانی ادا — نے زکس رنجید و نے کس را برنجانید و رفت
یاورانِ قوم را تا زیست یاور بود و یار — ہرچہ بتوانست در آیندۂ شاں کوشید و رفت
از دلِ پُردردِ اگاہی صدائے بر نخاست — مدتے چوں بحرِ کاہل در نہاں جوشید و رفت
طبع آزادش بہر ملت کہ بینی صلح داشت — در دلِ خویش و دلِ بیگانہ در گنجید و رفت
گر زید صد سال کس انجام او مرگست و بس — چوں شرر بر وضع دوراں میتواں خندید و رفت

مولوی محمد اعظم چریاکوٹی کے قطعۂ تاریخ وفات کو بابائے اردو نے ایک اچھا قطعہ تاریخی قرار دیا ہے۔ یہ قطعہ بھی پیش خدمت ہے۔

آں گرامی معتمد کز حسن رائش بید رنگ — یافت آرے در دکن مال و خزانہ آب و رنگ
محکم اخلاصِ دلی بالملتِ اسلام داشت — در معیشت بود رفتارش بر آدابِ فرہنگ
علم را جوہر شناسے، قدر دانِ اہلِ علم — طالبِ حکمت نگہ دارندۂ آئین ہنگ
باعلوِ فکرتش مرغِ ہما بر کندہ بال — عقلِ کل در مرغزارِ جودتش آہوئے لنگ
باسبک روحی متینے بود چوں کوہِ گراں — کلکِ او در دشتِ معنی برق رفتارے سرنگ
بہر معنہا دلش دریائے گوہر خیز بود — وقت گویائی دہانش بود شکر بار تنگ
شہ نمایاں ناگہاں از گوشۂ رخسار او — دانۂ ریشِ قضا چیزے کم از قدر مشنگ
بارہا از بہر اصلاحش برو نشتر زوند — تاشد از نشتر زبنہا کار بر بیمار تنگ
رفتہ رفتہ شد بس ابتر حال او و درچند روز — بود گویا صورتِ تصویر بر پشت پلنگ
عاقبت بیوقت مرگ از گلشنِ گیتی ربود — انچنانش کز کمین ساحل نشیناں را نہنگ
الغرض چوں رختِ ہستی بست از دنیائے دوں — ہاتفی گفت از جلالی، وائے اعظم یار جنگ ۱۳۱۲ھ

مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۳۷۸، ۳۷۹ چند ہم عصر، ص ۳۶ تا ۵۷

پروفیسر حسن عسکری

معروف نقاد، ادیب اور افسانہ نگار محمد حسن عسکری کا نام اردو ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے وسیع مطالعے اور وافر معلومات کی وجہ سے ہی قابلِ قدر نہ تھے بلکہ اس لئے بھی وہ محترم رہے کہ بقول مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی "اپنی خوش خلقی، تواضع، ایثار اور سادگی میں اپنی مثال آپ تھے۔ شرافت و متانت کے ایسے پیکر میں نے زندگی میں کم دیکھے ہیں..... انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے مغرب کی مرعوبیت بلکہ ذہنی غلامی کے بتوں کو پاش پاش کیا ہے، وہ اپنے وسیع و عمیق مطالعے کے ذریعے اس راز کو پاچکے تھے کہ مغرب کی سب سے بنیادی گمراہی مابعد الطبیعت سے اعراض ہے، اور یہ گمراہی صرف فلسفے اور اخلاق وغیرہ تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس نے مغرب کی ایک ایک حرکت و نقل کو متاثر کیا ہے، یہاں تک کہ وہ ادب، شاعری اور تنقید میں بھی ایسے غیر محسوس انداز سے رچ بس گئی ہے کہ سرسری نظر میں اس کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جن مسلمانوں نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا انہوں نے اس کی بہت سی باتیں معصوم اور بے ضرر سمجھ کر اپنا لیں، حالانکہ ان کا رشتہ در حقیقت مغرب کی اسی بنیادی گمراہی سے جڑا ہوا تھا"۔ پروفیسر حسن عسکری نے ہی اسلامی ادب کی تحریک چلائی اور ناصر کاظمی کو دریافت کیا۔ انہیں کی فکر سے متاثر ہو کر کئی حضرات نے ایک خاص مقام حاصل کیا۔ معروف نقاد و شاعر سلیم احمد نے اپنی ایک طویل نظم "مشرق" میں پروفیسر حسن عسکری کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے:

بڑے فیض پہنچے مجھے زندگی سے — یہیں میں ملا تھا حسن عسکری سے
یہ صاحب وہ ہیں جن کی اک ضربِ کاری — قلم کے ہزاروں حریفوں پہ بھاری
غلامی میں ان کی کٹی عمر ساری — وہ میرے صنم ہیں میں ان کا پجاری
وہ گر مو قلم ہیں تو تصویر ہوں میں — انہیں کی لکھی ایک تحریر ہوں میں
شروعِ جوانی کا وہ اک زمانہ — کہ جو بن گیا ہے پرانا فسانہ
دیا تھا سرِ راہ میں جل رہا تھا — کہ میرا شعور آنکھ ابھی مل رہا تھا
مجھے راہ سے عسکری نے اٹھایا — چراغِ تہِ دامنِ دل بنایا
میں پتھر تھا اور خاک میں رُل رہا تھا — پہ نادیدہ میزان میں تل رہا تھا
مرے جوہری نے مجھے دیکھا بھالا — تراشا، سنوارا، نکھارا، اجالا

محمد حسن عسکری صاحب کی تاریخِ ولادت ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء لکھی گئی ہے۔ کئی حضرات نے ان کا مولد سراوہ

ضلع میرٹھ اور بعض نے الٰہ آباد لکھا ہے۔ محمد حسن عسکری صاحب کے بھائی محمد حسن مثنیٰ نے محترم مشفق خواجہ کے نام اپنے ایک مکتوب بتاریخ ۱۸ جنوری ۱۹۸۳ء میں ان کی تاریخ ولادت ۵ نومبر ۱۹۱۹ء مطابق ۱۱ صفر ۱۳۳۸ھ بتائی ہے اور مولد سراوہ تحریر کیا ہے۔ ان کا تاریخی نام محمد اظہار الحق تھا۔ یہ نام کبھی استعمال نہیں ہوا۔ ان کے بہن بھائیوں کو بھی ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا۔

حسن عسکری صاحب کے دادا مولوی حسام الدین قصبے کی مشہور شخصیت تھے۔ وہ پرتاپ گڑھ میں ڈپٹی کلکٹری کی حیثیت سے ۱۹۰۸ء میں ریٹائر ہوئے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ حدیث کے عالم تھے۔ ان کے کئی کتابچے اسی موضوع سے متعلق شائع ہوئے۔ حسام الدین صاحب کے چار بیٹے تھے، جن میں سے تیسرے بیٹے محمد معین الحق، حسن عسکری صاحب کے والد تھے۔ وہ بلند شہر میں کورٹ آف وارڈز میں کلرک تھے۔ وہاں سے ۲۹-۱۹۲۸ء میں ضلع بلند شہر کی ایک چھوٹی ریاست شکارپور کے والی چودھری رگھوراج سنگھ اکاؤنٹینٹ کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کی بقیہ عمر وہیں گزری۔ عسکری صاحب اور دیگر عزیز و اقارب بھی تعلیم کے لئے سراوہ سے نکلے، یوں اس خاندان کا آبائی گھر سے تعلق ختم ہو گیا۔

پروفیسر حسن عسکری صاحب کی تعلیم کی ابتدا قرآن پاک اور اردو سے ہوئی تھی۔ پھر سراوہ کے پرائمری اسکول میں کچھ عرصہ پڑھنے کے بعد شکارپور کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد شکارپور کے واحد انگریزی اسکول ڈی۔ اے۔ انگلش اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں مولوی مبارک حسین سے فارسی اور اردو پڑھی۔ بعد میں مسلم ہائی اسکول بلند شہر سے ۱۹۳۶ء میں میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور میرٹھ آ گئے۔ میرٹھ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں سے ۱۹۳۸ء میں انٹر اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ سلسلہ تعلیم جاری رکھتے ہوئے ۱۹۴۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ہی انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا۔ میرٹھ اور بلند شہر میں ہوسٹل میں رہنے کے بجائے مکان کرائے پر لے کر رہے۔ میرٹھ میں دو سال پڑھا۔ اس زمانے میں پروفیسر کرار حسین صاحب بھی وہاں پڑھاتے تھے مگر یہ اتفاق تھا کہ عسکری صاحب ایسے سیکشن میں رہے کہ ان سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا مگر عمر بھر ان کو استاد سمجھا۔ الٰہ آباد میں عسکری صاحب اپنے پھوپھی زاد بھائی نعیم الرحمن کے یہاں رہے جو الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبہ عربی میں استاد تھے۔ نعیم الرحمن صاحب کے والد یعنی عسکری صاحب کے پھوپھا منشی خلیل الرحمن (عذرا اور اخبار اندلس والے) بھی وہیں پر مقیم تھے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد تلاشِ معاش کے سلسلے میں دہلی گئے۔ شاہد احمد دہلوی کے مشہور رسالے "ساقی" دہلی سے پہلے ہی تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ دہلی میں محکمہ فوجی اطلاعات میں کچھ عرصہ کام کیا اور دہلی ہی میں ریڈیو اسکرپٹ رائٹر کے طور پر بھی کام کرتے رہے مگر جلد ہی مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء اینگلو عربک کالج دہلی میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں اینگلو عربک کالج پاکستان تحریک کا گڑھ بنا ہوا تھا۔

اسی دور میں ان کے استاد پروفیسر ادیب نے الٰہ آباد یونیورسٹی کی لیکچرر شپ کی پیش کش کی مگر انہوں نے دہلی میں رہنا پسند کیا۔ شبلی کالج اعظم گڑھ میں بھی ملازمت کی سبیل نکلی مگر وہاں بھی نہیں گئے لیکن میرٹھ میں میرٹھ کالج کے پروفیسر کرار حسین صاحب نے چند ماہ کی چھٹی لی تو اس عرصے میں میرٹھ کالج میں انگریزی پڑھانا قبول کرلیا۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں مکتبہ جدید لاہور کے لئے ترجموں کا کام کرتے رہے۔ جب ملک کی تقسیم عمل میں آئی تو حسن عسکری صاحب اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اکیلے ہی ہجرت کر کے لاہور آگئے۔ اس وقت ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ دیگر افراد خاندان میرٹھ میں تھے مگر وہ بھی نومبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان پہنچ گئے۔

پاکستان میں انہوں نے پاکستانی ادب کا نعرہ بلند کیا اور اسلامی ادب کی تحریک چلائی۔ ناصر کاظمی کو صابر دت کے مطابق دریافت کیا۔ صابر دت نے لکھا ہے "ان کے خیال میں ناصر کاظمی پہلا پاکستانی شاعر تھا جس نے اپنے اشعار میں قیام پاکستان کے وقت ہونے والی سازشوں کے نتیجے میں جو برا وقت مسلمانوں کو دیکھنا پڑا' اس کے تمام پہلوؤں کو مجسم کردیا تھا"۔ سعادت حسن منٹو بھی اس زمانے میں ہجرت کر کے لاہور پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے منٹو کے ساتھ مل کر "اردو ادب" نکالا۔ حسن عسکری اور سعادت حسن منٹو کی راہیں الگ الگ تھیں' اس لئے یہ رسالہ جلد ہی بند ہو گیا اور حسن عسکری صاحب کراچی آگئے۔ یہاں چند ماہ "ماہ نو" کی ایڈیٹری کے بعد ۱۵ جولائی ۱۹۵۰ء کو اسلامیہ کالج سے وابستہ ہوگئے اور شعبہ انگریزی کے نگراں رہے۔

پروفیسر حسن عسکری نے فرانسیسی زبان کو بغیر کسی استاد کے خود پڑھا اور سیکھا۔ اس زبان میں مضامین تک لکھنے لگے تھے۔ انہوں نے فرانسیسی زبان سے جو ترجمے اردو میں کئے ہیں' وہ اردو میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عسکری صاحب نے فرانسیسی ناول نویس بولیئر کے مشہور ناول "مادام بوواری" اور ستاداں کے ناول "سرخ و سیاہ" کو فرانسیسی زبان سے اردو میں منتقل کیا۔

محمد حسن عسکری صاحب نے بطور ادیب اپنی زندگی کا آغاز ماہنامہ "ساقی" دہلی سے کیا تھا۔ ان کے مضامین اور تراجم اکثر رسالوں میں چھپتے رہتے تھے۔ "ساقی" میں "جھلکیاں" کے عنوان سے ان کا ایک ہی کالم مستقل شائع ہوتا تھا۔ یہ کالم ۱۹۴۷ء کے فسادات کے تعطل کے سوا پابندی سے نومبر ۱۹۵۷ء تک چھپتا رہا۔ انہوں نے ابتدا میں افسانے بھی لکھے جو رسائل کی زینت بنتے رہے۔ عسکری صاحب کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "جزیرے" ۱۹۴۳ء اور دوسرا مجموعہ "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔

ایک نقاد کی حیثیت سے پروفیسر حسن عسکری صاحب کو معتبر مقام حاصل ہوا۔ ان کی تحریروں نے گہرے نقوش چھوڑے۔ ان کی تنقید نے ایک اور رخ پیش کیا جس نے بعد میں دبستان کی شکل اختیار کرلی۔ ڈاکٹر انور سدید نے "اردو ادب کی مختصر تاریخ" میں پروفیسر حسن عسکری صاحب پر گفتگو کرتے

شاید اس بات کی ابتدا یوں ہوئی تھی کہ ہر مرنے والے کو
شہید کہیں کہا جاتا ہے اور شہید دراصل ہوتا کیا ہے۔ اس بات کی
وجہ یہ تھی کہ وہ اسی لفظ "شہید" کی بڑی عزت کرتے تھے۔
لیکن پچھلے پانچ چھ سال کے عرصے میں یہ لفظ تو اتنا رہ گیا اور بہت سے
لفظوں کا احترام اٹھ گیا ہے۔ ادیبوں کے دل سے بھی اٹھ چکا ہے،
حالانکہ ادیبوں کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ لفظوں کا احترام کریں۔
"عظیم" کے لفظ کی توقیر بہت دن سے ختم ہو چکی ہے۔
اب "تخلیق" کے لفظ کا نمبر آیا ہے۔ آج سے بیس سال
پہلے اگر یہ لفظ خدا کے سوا کسی اور کے لیے استعمال کیا جاتا تو
لوگوں کے جذبات مجروح ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا۔
آج کل یہ حال ہے کہ شہر کی نالیوں کی صفائی کے متعلق مضمون
کو بھی "تخلیق" کہا جاتا ہے۔ جس طرح "عظیم" کے
معنی "اچھا" ہو گئے تھے، اسی طرح اب "تخلیق"
سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ لوگوں کو جو چیز پسند آئی
— چاہے وہ نظم ہو یا افسانہ یا تنقید یا تحقیقی
مضمون۔ "تخلیق" کو لوگوں نے دال روٹی
بنا کے رکھ دیا ہے۔ نہ تو اس لفظ کا حسن محسوس
کرتے ہیں نہ اس کی ہیبت۔ یہ لفظ زبان سے نکالتے ہوئے
دل میں کسی قسم کی تھرتھری پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اردو
ادب کی جو گت بن چکی ہے اس کا ثبوت اس سے
بہتر کیا ہوگا۔

یہ نیا رسالہ جو "تخلیق" کے نام سے
نکل رہا ہے، اگر اس لفظ کا وقار پھر سے
قائم کر سکے، بلکہ خود بھی اس لفظ کی عزت کرے،
تو یہ بھی اردو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔

محمد حسن عسکری

عکسِ تحریر: پروفیسر محمد حسن عسکری

ہوئے لکھا ہے:

"محمد حسن عسکری کی تنقید میں انسانی دماغ کے عمل اور ردِ عمل کو اہمیت حاصل ہے...... انہوں نے افراد کے تجزیے میں نفسیات کے مطالعے سے زیادہ کام لیا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ انہوں نے فن کی قدر و قیمت کے تعین کے لئے نفسیات پر کچھ زیادہ انحصار نہیں کیا۔ تنقید کو عسکری نے ایک ایسا عمل بنا دیا جو انسان کے دکھ درد کی نئی تعبیر کرنے کے علاوہ اسے وہ چیز حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے، جو مادی خوشی سے ماورٰی ایک اور نوع کی مسرت ہے۔ اس عمل نے ہی عسکری کو نئے پوشیدہ براعظموں کی سیاحت پر آمادہ کیا اور وہ روایت کے قدیم رشتوں کا کھوج لگانے نکلے تو مابعد الطبیعات کی تعبیر ان کا مقصدِ حیات بن گئی"۔

حسن عسکری صاحب کو ہمیشہ ایک ایسے نقاد کی حیثیت حاصل رہی جس کی بات توجہ سے سنی جاتی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید نے تحریر کیا ہے:

"جدید تحریکوں کے اس دور میں محمد حسن عسکری فی ذاتہ ایک ایسے دبستان تھے جسے آزادی کی وسعت ملی۔ ان کے رفقاء میں مظفر علی سید، سلیم احمد، سجاد باقر رضوی، انتظار حسین، سہیل احمد خاں، جاذب قریشی، سراج منیر، جمال پانی پتی اور کسی حد تک تحسین فراقی جیسے نقاد شامل ہیں"۔

انہوں نے "اردو نثر کے میلانات" کے حوالے سے لکھا ہے کہ ڈاکٹر عبد الوحید قریشی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ:

"بزرگ نقادوں میں ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر محمد صادق، رفیق خاور اور عابد علی عابد کے نام بھی اس دبستان میں قابلِ ذکر ہیں"۔

حسن عسکری صاحب کے تنقیدی مضامین کے مجموعے انسان اور آدمی، ستارہ اور بادبان، جھلکیاں، وقت کی راگنی اور "جدیدیت اور مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ" چھپ چکے ہیں۔

عمر کے آخری برسوں میں حسن عسکری صاحب بے انتہا مذہبی ہو گئے تھے۔ اپنا زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزارتے تھے۔ اکثر ان پر کشف کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ اپنے آخری دنوں میں بھی وہ عربی اور فارسی کے علم بلاغت کے مطالعے میں مصروف تھے۔ "البلاغ" کراچی میں ان کا ایک مضمون "اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟" شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں ایک عرصے تک موضوعِ گفتگو بنا رہا۔ اس مضمون نے ادب اور تنقید کے شائقین کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولیں۔ حسن عسکری صاحب مختلف افکار، فلسفوں اور نظام ہائے حیات کے گہرے مطالعہ کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ دین کی طرف آئے تھے، اس لئے ان کی دینی فکر میں دور دور تک معذرت خواہی کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔ انہوں نے حضرت مفتی محمد شفیعؒ بانی دار العلوم کراچی کے ایک مقالے "اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت" کا انگریزی ترجمہ کیا جو پروفیسر کرار حسین صاحب کی نظر ثانی کے بعد

DISTRIBUTION OF WEALTH IN ISLAM

کے نام سے چھپا اور اب تک بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب "الانتباہات المفیدہ" کا بھی عسکری صاحب نے ترجمہ کیا۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی اس ترجمے کے بارے میں رائے ہے "اصل کتاب چونکہ بہت مختصر اور اصطلاحات سے پر تھی، اس لئے یہ بڑا مشکل کام تھا، لیکن عسکری صاحب نے اس ترجمے میں غیر معمولی فضل و کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھی پروفیسر کرار حسین صاحب کی نظر ثانی کے بعد

ANSWER TO MODERNISM

کے نام سے شائع ہو چکی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ انگریزی ترجمہ مجھے اصل سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے"۔ حسن عسکری صاحب نے اردو میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں ارسطو اور افلاطون سے لے کر جدید مغربی فلاسفہ تک کے مشہور مفکرین کے بنیادی فلسفوں کو بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا تھا، اور مغرب کی فکری گمراہیوں کی ایک جامع فہرست بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کی تھی، وہ چھپ نہ سکی۔ مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب کی فرمائش پر انہوں نے حضرت مفتی محمد شفیعؒ کی آٹھ جلدوں پر مشتمل اردو تفسیر "معارف القرآن" کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا۔ ابھی وہ قرآن کریم کا سوا پارہ یعنی تفسیر کی پہلی جلد کا دو تہائی حصہ مکمل کر پائے تھے کہ وقتِ اجل آپہنچا اور ۷ صفر ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۸ جون ۱۹۷۸ء کو اپنے خالقِ حقیقی کے پاس اپنے لاکھوں مداحوں کو سوگوار چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ نمازِ جنازہ ممتاز اسکالر مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی نے پڑھائی۔ تدفین دار العلوم کورنگی کے قبرستان میں ہوئی جہاں ممتاز علماء کرام آرام فرما ہیں۔

محترمہ شیما مجید نے "مقالات محمد حسن عسکری" کے نام سے پروفیسر حسن عسکری کے مقالات کو دو ضخیم جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ پہلی جلد میں ادبی تحریریں شامل ہیں اور دوسری جلد میں سیاسی، ثقافتی، مذہبی، لسانی، تعلیمی اور فنونِ لطیفہ سے متعلق مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ پروفیسر موصوف کی درج ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

تصانیف:

۱۔ میری بہترین نظم (مرتبہ) کتابستان الہ آباد، طبع اول ۱۹۴۲ء

۲۔ میرا بہترین افسانہ (مرتبہ) ساقی بک ڈپو دہلی، طبع اول ۱۹۴۳ء

۳۔ انتخاب طلسمِ ہوشربا (مرتبہ)، مکتبہ میری لائبریری، طبع اول ۱۹۵۳ء

۴۔ انتخاب میر، ساقی کراچی، ستمبر ۱۹۵۸ء

تراجم:

۱۔ ریاست اور انقلاب از لینن، کتابستان الہ آباد، طبع اول ۱۹۴۲ء

۲۔میں کیسے ادیب بنا از میکسم گورکی' الحدید لاہور' طبع اول ۱۹۴۳ء
۳۔مادام بوواری از گستاؤ فلابیر' مکتبہ جدید لاہور' طبع اول ۱۹۵۰ء
۴۔آخری سلام از کسٹوفر شروڈ' مکتبہ جدید لاہور
۵۔میں کیوں شرماؤں از سٹیلا کرنس' کتابستان الہ آباد
۶۔موبی ڈک از ہرمن میلول' شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور' طبع اول ۱۹۶۷ء
۷۔سرخ وسیاہ از ستاں دال' مکتبہ جدید لاہور' طبع اول ۹۵۳'ء

افسانوی مجموعے:

۱۔جزیرے' ساقی بک ڈپو دہلی' طبع اول ۱۹۴۳ء
۲۔قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے' ساقی بک ڈپو دہلی' طبع اول ۱۹۴۷ء
۳۔محمد حسن عسکری کے افسانے (افسانوی کلیات) مرتبہ محمد سہیل عمر' نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۹ء

تنقیدی مجموعے:

۱۔انسان اور آدمی' مکتبہ جدید لاہور' طبع اول ۱۹۵۳ء
۲۔ستارہ یا بادبان' مکتبہ سات رنگ کراچی' طبع اول ۱۹۶۳ء
۳۔وقت کی راگنی' مکتبہ محراب لاہور' طبع اول ۱۹۷۹ء
۴۔جدیدیت (مغربی گمرائیوں کا خاکہ)' آب حیات راولپنڈی' طبع اول ۱۹۷۹ء
۵۔جھلکیاں' جلد اول مرتبہ محمد سہیل عمر' نغمانہ عمر' مکتبہ روایت لاہور
۶۔جھلکیاں' جلد دوم (تخلیق عمل اور اسلوب) مرتبہ سہیل عمر' نفیس اکیڈمی کراچی' ۱۹۸۹ء
۷۔مجموعہ محمد حسن عسکری (تنقیدی کلیات)' سنگ میل لاہور ۱۹۹۴ء
۸۔عسکری نامہ (افسانے' مضامین)' سنگ میل لاہور ۱۹۹۸ء

نقوشِ رفتگاں' اردو ادب کی مختصر تاریخ'
انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا' مشرق'
فن اور شخصیت کوائف نمبر'
مکتوب محمد حسن مثنی بنام حضرت مشفق خواجہ

پروفیسر خلیق احمد نظامی

پروفیسر خلیق احمد نظامی کا تعلق ایک ایسے علمی گھرانے سے ہے' جس نے علم و ادب اور تعلیم و تہذیب کے فروغ و استحکام میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس خاندان کی علی گڑھ تحریک کے ساتھ وفاداریاں بھی بہت پرانی ہیں۔ پروفیسر نظامی کے دادا سرسید احمد خاں اور نواب وقار الملک سے بہت قریب تھے۔

محترم عزیز احمد نظامی کا شمار میرٹھ کے ممتاز و معزز شہریوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک قانون داں تھے۔ ان کی اولاد میں پروفیسر خلیق احمد نظامی 'لئیق احمد نظامی' خلیل احمد نظامی' ڈاکٹر کمال احمد نظامی اور پروفیسر ڈاکٹر توفیق احمد نظامی کے علاوہ تین بیٹیاں تھیں جن میں ڈاکٹر جمال آرا نظامی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی اور ڈاکٹر توفیق احمد نظامی بھی اسی علمی ادارے سے وابستہ رہے۔ لئیق احمد نظامی صاحب دیوان شاعر تھے اور ثمر تخلص فرماتے تھے۔ ڈاکٹر کمال احمد نظامی امریکہ میں ہیلتھ سروسز کے ڈائریکٹر ہیں۔ خلیل احمد نظامی ادارۂ ترقیات کراچی کے ڈائریکٹر جنرل رہے اور آج کل سرسید یونیورسٹی آف انجینیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے چانسلر ہیں۔ ان سب بھائیوں نے اپنے شعبوں میں قابلِ ذکر کام کیا اور معتبر ہوئے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی خاندانی روایات کو قائم رکھا۔ آپ کے والد محترم عزیز احمد نظامی آل انڈیا مسلم لیگ میرٹھ کے خزانچی تھے۔ انہوں نے پاکستان کے قیام کے بعد نقلِ مکانی نہیں کی اور میرٹھ میں ہی ان کا انتقال ہوا۔

پروفیسر نظامی کی ولادت ۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ہوئی۔ آپ نے میرٹھ میں تعلیم پائی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۴۷ء میں آپ علی گڑھ چلے گئے جہاں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ترسیل علم کا موقع ملا۔ ۱۹۵۳ء میں ریڈر اور ۱۹۶۳ء میں پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں آپ کو سینئر پروفیسر کی حیثیت سے صدر شعبہ تاریخ و معارف بنایا گیا۔ جس کے بعد ایڈوانسڈ اسٹڈیز (مجلس تحقیقات) کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا اور ڈین آف سوشل سائنسیز بھی' پھر ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی بنائے گئے۔ کچھ مدت تک نگراں برائے امور طلبہ اور پھر نیجر احمدی اسکول برائے نابینا رہے۔ بعد میں ڈائریکٹر سرسید اکیڈمی اور پھر پرو وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کئی مرتبہ وائس چانسلر بھی رہے۔ اس طرح اٹھائیس سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لیکچرار سے وائس چانسلر تک کے عہدوں پر کام کیا۔

اندرا گاندھی کے دور میں حکومتِ ہند نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے آپ کی خدمات مستعار لے کر شام میں سفیر بنا کر بھیجا۔ آپ نے وہاں بھی بحسن و خوبی خدمات انجام دیں۔ شام میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۸ء تک رہے۔ مدتِ معینہ پوری کر کے پھر علی گڑھ واپس آئے اور شعبہ تاریخ و معارف اسلامیہ کے ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھالا۔ پروفیسر موصوف ۱۹۸۵ء تک باقاعدہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ ساٹھ سال کی عمر ہونے پر

آپ کو ریٹائر کر کے دوبارہ سروس میں لے لیا گیا جسے آپ نے عمر کی آخری سانس تک جاری رکھا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی بہت بااخلاق، پرخلوص، سادہ مزاج اور نستعلیق انسان تھے۔ دوسروں کی دل آزاری پسند نہیں کرتے تھے۔ مطالعے سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ مختلف علوم و فنون، انگریزی ادب و شاعری، تصوف، تاریخ، جغرافیہ اور مدنیت سے متعلق بے شمار کتب اور بڑی تعداد میں مخطوطات آپ کے پاس موجود تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ کتب آپ کے ذخیرہ علمی میں شامل تھیں۔ تاریخ و معارف اسلامیہ کے بعد آپ کو تصوف سے خاص دلچسپی تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کی بنیادی تحقیق کا مرکز ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کی تاریخ و ثقافت رہی۔ سلاطین دہلی کی عمومی تاریخ کے علاوہ، وہ کام جو آپ نے نمایاں صوفیاء کرام پر کیا، تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ مثلاً "شیخ فریدالدین گنج شکرؒ، حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ اور دوسرے بزرگ۔ موصوف کی "تاریخ مشائخ چشت" قرون وسطیٰ کی ثقافتی تاریخ کی بہترین عکاس ہے۔ آپ کی یہ موقر تالیف اس بات کی شاہد ہے کہ آپ نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ یہ کتاب مئی ۱۹۵۳ء میں مکمل ہوئی۔ پروفیسر محمد حبیب (پروفیسر تاریخ و سیاست جامعہ علی گڑھ) نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے "خلیق احمد نظامی صاحب کی تصنیف "تاریخ مشائخ چشت" کو جو ہندوستان کے سب سے اہم مذہبی سلسلے سے متعلق ہے، دنیا سے روشناس کراتے وقت میں فخر و مسرت کی عجیب کیفیت محسوس کرتا ہوں۔ عرصہ ہوا، ایک سلسلے میں مجھے میرٹھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مصنف جو میرے ایک پرانے شاگرد مسٹر عزیز احمد نظامی کے صاحبزادے ہیں، پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ ایم۔اے کے طالب علم تھے لیکن ہندی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں ان کا غیر معمولی انہماک بالخصوص تصوف کے وسیع مطالعہ کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ نظامی صاحب ہندوستانی تاریخ کے ہونہار نوجوان فاضلوں میں ہیں۔ میری دعا ہے کہ رب العالمین میرے اس نوجوان شریکِ کار کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے علمی کاموں کو پورا کر سکے، جن کو اس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔" پروفیسر نظامی نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی خطوط کو دریافت اور شائع کیا۔ یہ خطوط ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے شاہ صاحب کی خدمات کو سمجھنے کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خطوط پر مشتمل پہلی تاریخی دستاویز ہے، جس کے نظامی صاحب مرتب ہیں۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے "میرے نوجوان رفیق کار خلیق احمد نظامی نے حکومت ہند کے قرون وسطیٰ کی تاریخ اور اس کے لٹریچر کا جس گہرے انہماک اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اس سے میں نے مستقبل کی بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں۔ کامل غیر جانبداری اور ناقدانہ تحقیق ان کی علمی کاوشوں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔"

سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک پر بھی آپ کا تحقیقی کام نہایت اہم ہے۔ ایلیٹ اور ڈاؤس کی تاریخ ہند پر پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ضمیمے ہندوستانی تاریخ پر ایک تحقیقی کام ہے اور بہت معیاری ہے،

نے مولانا ابوالکلام آزاد نے " AS AN EXCELLENT JOB " کہا ہے۔ تاریخ نگاری پروفیسر نظامی کی بنیادی دلچسپیوں میں سے ایک رہی ہے۔ ہندوستانی قرونِ وسطیٰ کے لٹریچر میں آپ نے نفسیاتی تاریخ کی ایک نئی روایت جاری کی ہے۔

پروفیسر نظامی کا کام معروف تاریخ دانوں اور بلادِ شرقیہ پر تحقیق کرنے والوں کی طرف سے قرونِ وسطیٰ کی ہندی تاریخ اور ثقافت کے علم میں نئی زمین کے ابھار کے طور پر سراہا گیا ہے۔ آپ نے ہندوستان کی صوفی تحریک کی تحقیق میں بھی عرق ریزی سے کام کیا۔ پیرس کے پروفیسر لوئس میسگنن (PROFESSOR LOUIS MASSGNON) نے آپ کو یقینی طور پر ہندوستانی صوفی ازم کے سب سے بڑے ماہر کے طور پر سراہا ہے۔ میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر چارلس جے ایڈمز (PROFESSOR CHARLES J.ADAMS) کے بقول " نظامی صاحب کو لازمی طور پر ہندوستان کے اہم ترین ہم عصر تاریخ دانوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ ان کا مقام ان کے مسلم ہند کے علم کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔"

(THE 20TH CENTURY SUPPLEMENT TO THE ENCYCLOPEDIA OF WORLD BIOGRAPHY VOL:3)

جرمنی کی مشہور محقق بلادِ شرقیہ ڈاکٹر این میری شمل

(DR. ANNEMARIE SCHIMMEL)

نے ڈان اور یزر کے نمائندے سے دنیا میں ہونے والی صوفی اسٹڈیز کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہا " پروفیسر نظامی علم کا ایک بحرِ بیکراں ہیں اور صوفی تاریخ دانوں کے سربراہ ہیں۔ ہم اپنے ہارورڈ کے طلباء کو ہر سال ان کے پاس بھیجتے ہیں۔ ہم ان کے ذرائع دیکھتے ہیں۔ ان کے پاس ایک زبردست لائبریری بھی ہے۔" (۲۰ نومبر ۱۹۸۸ء)

پروفیسر خلیق احمد نظامی کی سرسید البم اور البم مولانا ابوالکلام آزاد نے سوانحی خاکہ لکھنے کا ایک نیا طریقہ متعارف کرایا ہے۔ یہ تعلیم اور لطف دونوں زاویوں سے یکتا ہے۔ یہ قاری کے سامنے اپنے موضوع کی اہم باتیں کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا وہ ایک زندہ، رنگ بدلتی زندگی کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کا شمار ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے سرسید احمد خاں کی تحریک کی روح کو پورے طور پر سمجھا ہے اور اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سرسید احمد خاں کی فکری وسعت اور مسلمانانِ ہند کی ذہنی، ثقافتی اور علمی احیاءِ نو کے لیے سرسید احمد خاں کی تحریک کو آگے بڑھانا، پروفیسر نظامی کا اہم مشن رہا۔ آپ کی لکھی ہوئی سرسید احمد خاں کی سوانح عمری حکومتِ ہندوستان نے شائع کی ہے۔ آپ کی کتاب " SIR SYED SPEAKS YOU " کی مدح سرائی کرتے ہوئے ڈاکٹر

ڈی۔ایس۔کوٹھری (DR D.S KOTHARI) نے جو اس وقت U.G.C کے سربراہ تھے "ایک پرشکوہ اشاعت" قرار دیا۔ کریسنٹ لوٹس سیریز (CRESCENT LOTUS SERIES) کے مدیر کی حیثیت سے آپ نے سرسید احمد خاں کی سوانح عمری حیات جاوید کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ سرسید کے گھر کی تعمیر نو اور سرسید اکیڈمی کے قیام میں آپ کی دلچسپی ناقابلِ فراموش ہیں۔ پروفیسر نظامی نے ہی سرسید میموریل لیکچرز متعارف کرائے۔ مقابلے کے امتحانات میں حصہ لینے والے طلباء کے لیے رہنما کلاسیں قائم کیں۔ یونیورسٹی کے طلباء کی تحریروں کو مرتب اور شائع کرنے میں آپ گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یونیورسٹی پبلی کیشنز بیورو کی بنیاد رکھی۔ یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے صدر اور تھیالوجی کے سربراہ کی حیثیت سے بہت سے لوگوں کی تحقیق کو شائع کرانے کا اہتمام کیا۔ سرسید احمد خاں سے منسوب سرسید اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے آپ نے علی گڑھ کے سابقہ طلباء کی ڈائریکٹری مرتب کی اور نواب وقار الملک کے خطوط کی اشاعت کا انتظام کیا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی عالمی شہرت کے حامل تاریخ داں تھے۔ آپ کی پچیس سے زائد کتب ہندوستان کی تاریخ و تہذیب پر منظر عام آچکی ہیں۔ نظامی صاحب کی شائع ہونے والی کتب میں شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی خطوط، تاریخ مشائخ چشت (دیباچہ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین) سوانحِ عبدالحق محدث دہلوی (دیباچہ۔ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق) علوم تاریخ و ثقافت قرونِ وسطی ہندوستان، حیات شیخ فرید الدین گنج شکرؒ (دیباچہ۔ سر ہیملٹن گب) خیر المجالس (دیباچہ۔ ڈاکٹر تارا چند) سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات، ارمغان علی گڑھ، سر سید احمد خاں وغیرہ ہیں۔ نظامی صاحب کی متعدد کتب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ آپ کے لاتعداد مضامین ملکی و غیر ملکی رسائل اور انسائیکلوپیڈیا میں شائع ہوئے ہیں جن میں

1:ENCYCLOPEDIA OF ISLAM (LONDON , (LEIDEN)

2:ENCYCLOPEDIA PERSICA (NEW YORK)

3:ENCYCLOPEDIA OF RELIGION (NEW YORK)

4:ASIAN ENCYCLOPEDIA (NEW YORK)

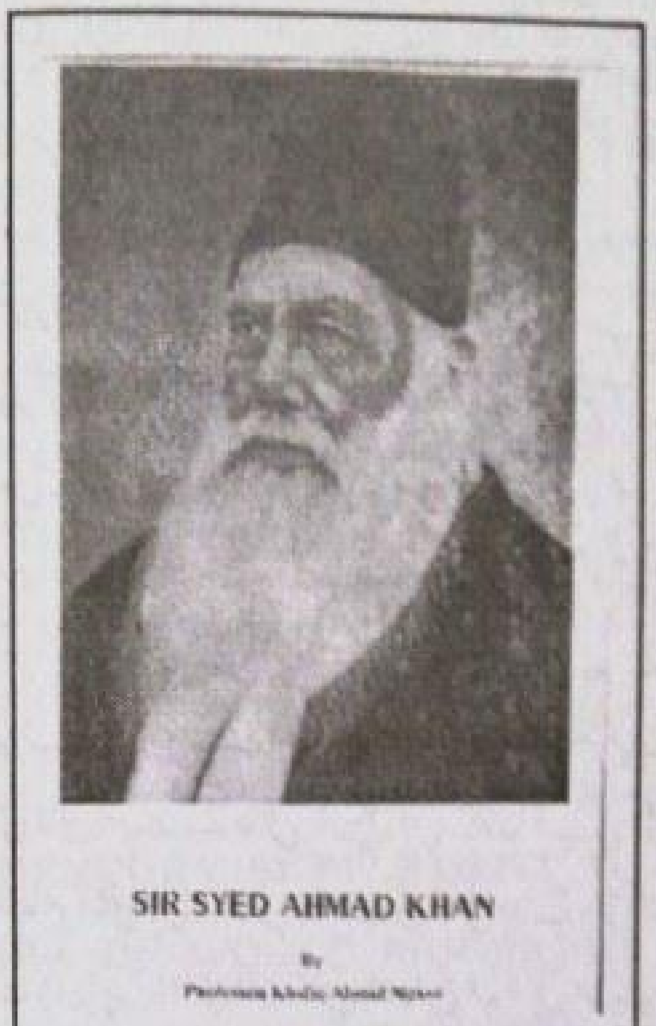
5:URDU ENCYCLOPEDIA (HYDER ABAD)

6:HINDI ENCYCLOPEDIA (VARANASI)

7:SIKH ENCYCLOPEDIA (PATIALA)

شامل ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم ایجوکیشن (کیمبرج)، اسلامک کلچر (حیدر آباد)، انڈو ایرانیکا (کلکتہ)، اسٹڈیز ان اسلام (نئی دہلی)، اسٹڈیز ان ہسٹری آف میڈیسن (نئی دہلی)، یو۔پی ہسٹوریکل ریویو (الٰہ آباد)، انڈین ہسٹوریکل ریویو (آئی۔سی۔ایچ۔آر، نئی دہلی) اور معارف (اعظم گڑھ) ایڈیٹوریل بورڈز



سرورق: سرسید احمد خاں
مصنفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی

Sir Syed Album

Khaliq Ahmad Nizami

سرسید البم: خلیق احمد نظامی

میں شامل رہے۔ آپ نے کئی کتب کو ایڈیٹ بھی کیا۔

موصوف نے بڑی تعداد میں بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں منعقدہ مغربی ایشیا، یورپ اور امریکا میں شرکت کی۔ آپ نے ماہرین تاریخ و تہذیب کے یونسکو اجلاس منعقدہ دوشنبہ ۱۹۷۳ء بعنوان HISTORY AND CIVILIZATION OFCENTRAL ASIA میں شرکت کی۔ جشن بغداد: ۱۹۶۲ء میں عراقی حکومت کی دعوت پر وہاں گئے۔ یونسکو سیمینار برائے MALAY SULTANATE AT KUALALUMPOR اور رشید الدین فضل اللہ تقریبات تہران اور ہمدان میں نمائندگی کی۔ ۱۹۶۴ء میں منعقدہ

ISLAMIC STUDIES SECTION OF THE INTERNATIONAL CONGRESS OF ORIENTALISTS

کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ نظامی صاحب لندن اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز اور کولمبیا یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر تھے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کے روز و شب علم و ادب کے لیے وقف رہے۔ علمی سفر جاری تھا کہ وقت آخر آپہنچا۔ آپ ۵ دسمبر ۱۹۹۷ء مطابق ۴ شعبان ۱۴۱۸ھ بروز جمعہ ظہر و عصر کے درمیان اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ آپ کی وفات سے ایک علمی خلا پیدا ہوا۔ ڈاکٹر نورشید خاور امروہوی نے قطعہ تاریخ وفات کہا۔

تاریخ و معارف میں یکتا تھے خلیق احمد
افسوس صد افسوس اچانک ہوئے رخصت
تاریخ وفات ان کی غم تعمیہ کر کے
"لہ ما فی السموات" پڑھا کر غم "دل رفت"
۷۰۴ + ۷۱۴ = ۱۴۱۸ھ

آپ کی اولاد میں ڈاکٹر احتشام احمد نظامی اور ڈاکٹر وسیم احمد نظامی (دونوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں) مجیب احمد نظامی (ابوظہبی میں بینکر) اور ڈاکٹر فرحان احمد نظامی (ڈائریکٹر اسلامک ریسرچ کونسل "آکسفورڈ یونیورسٹی" برطانیہ) کے علاوہ اولاد اناث میں ڈاکٹر عذرا نظامی ہیں۔ وہ بھی علی گڑھ میں ہی پڑھاتی ہیں۔

مرتبہ احمد خاں منصورات کرگہ

خلیل الرحمٰن داؤدی

محترم خلیل الرحمٰن داؤدی معتبر نقاد اور صاحب بصیرت محقق ہیں۔ آپ نے تحقیق و تنقید کے حوالے سے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ عربی اور فارسی مخطوطات پر بھی ۲۷ سال سے مسلسل کام کر رہے ہیں' اگر یہ کام شائع ہو گیا تو دنیائے اسلام کے اربابِ تحقیق کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہو گا۔

محترم خلیل الرحمٰن داؤدی کا شجرۂ نسب اس طرح ہے۔ خلیل الرحمٰن ابن محمد عطاء السمیع ابن محمد شفیع ابن ہدایت علی ابن فضل علی ابن نور علی ابن رحمت اللہ ابن اللہ رکھا ابن شیخ سعد اللہ ابن امان اللہ ابن بازید ابن مولانائے داؤد ابن شیخ احمد ابن شیخ حمید الدین خوزندی از اولاد محمد بن حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اول۔ آپ نے اپنے مورثِ اعلیٰ مولانائے داؤد کی نسبت سے ہی اپنے نام کے ساتھ داؤدی لگایا ہے۔

آپ کے جدِ امجد اور مورثِ اعلیٰ شیخ حمید الدین خجندی مغل بادشاہ بابر کے زمانے میں اپنے وابستگان اور قبائلان کے ساتھ ایک ہزار سوار لے کر وارد ہندوستان ہوئے تھے اور قصبہ سیکری ضلع مظفر نگر میں اقامت اختیار کی تھی۔ شیخ حمید الدین کے صاحبزادے شیخ احمد اپنے صاحبزادے مولانائے داؤد کے ساتھ سیکری سے ترکِ سکونت کر کے قصبہ لاوڑ ضلع میرٹھ میں اقامت گزیں ہوئے۔ مولانائے داؤد کی نسل لاوڑ سے شروع ہوئی۔ ان کے دو صاحبزادے مولانا یوسف اور مولانائے بازید ہوئے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب مولانا بازید کی اولاد میں سے ہیں۔ اس خاندان میں علمائے دین اور قابل ذکر شعراء وادیب ہوئے ہیں جن میں مولانا عبد الحکیم جوش' مولانا شاہ عبد العلیم صدیقی' مولانا نذیر احمد خجندی' مولوی اسمٰعیل میرٹھی' مولانا شاہ احمد نورانی اور اسلم سیفی بہت مشہور و معروف ہیں۔

محترم خلیل الرحمٰن داؤدی کی ولادت قصبہ لاوڑ میں ۲ مارچ ۱۹۲۳ء کو ہوئی۔ لاوڑ کے واحد پرائمری اسکول سے فارغ ہو کر اپنے چچا ظہور احمد صاحب کے پاس مراد نگر چلے گئے جہاں سے اردو مڈل اور ہندی مڈل کے امتحانات پاس کئے۔ اس کے بعد فیض عام انٹر کالج میرٹھ میں آٹھویں کلاس میں داخل ہوئے۔ وہاں سے میٹرک پاس کر کے میرٹھ کالج میں داخلہ لیا لیکن ایف۔ ایس۔ سی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جا کر پاس کیا اور بی۔ ایس۔ سی بھی وہیں سے کیا۔ سائنس داں بننے کی خواہش رکھتے تھے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسی دوران تقسیمِ ہند عمل میں آئی۔ پاکستان بننے سے قبل پرائیوٹ طور پر علومِ شرقیہ کے امتحانات' الہ آباد بورڈ سے فارسی کا امتحان منشی اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل (آنرز ان پرشین) پاس کر چکے تھے۔ علی گڑھ میں دورانِ تعلیم تحریکِ پاکستان میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو داؤدی صاحب ترکِ سکونت کر کے پاکستان تشریف لائے اور لاہور میں اقامت گزیں ہوئے۔

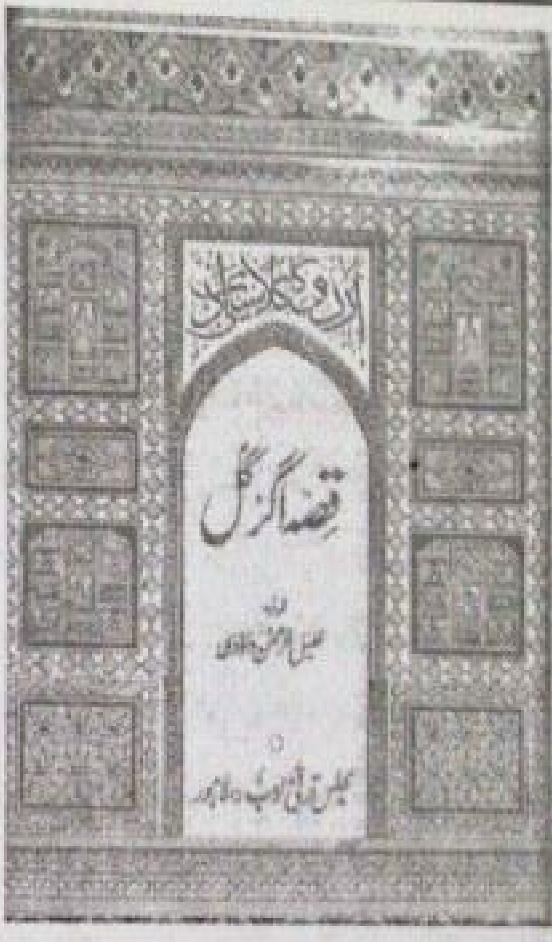
پاکستان آنے کے بعد ابتدا میں فری لانس صحافی رہے۔ مختلف اخبارات امروز' زمیندار' احسان' آفاق' ملت اور مغربی پاکستان میں لکھتے رہے۔ اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان لاہور سے تقاریر اور فیچر نگاری

کا سلسلہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۳ء تک جاری رکھا۔ آپ کی متعدد موضوعات پر بے شمار تقاریر اور لیکچر نشر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء سے مجلس ترقی ادب کے ناظم سید امتیاز علی تاج کے ساتھ مجلس کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگے۔ کچھ عرصے بعد ہی یہ ادارہ علمی و تحقیقی موضوعات پر اہم نادر کتابوں کی اشاعت کا مرکز بن گیا۔ دیگر اسکالرز کے علاوہ داؤدی صاحب نے بھی مجلس کے لئے بیس کتابیں مرتب کیں جن میں سے سولہ کتابیں ناظم مجلس سید امتیاز علی تاج کی حیات میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۷۰ء میں تاج صاحب کے انتقال کے سبب چار کتب شائع ہونے سے رہ گئیں اور ابھی تک زیورِ طبع سے محروم ہیں۔ آپ کی جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں، درج ذیل ہیں :

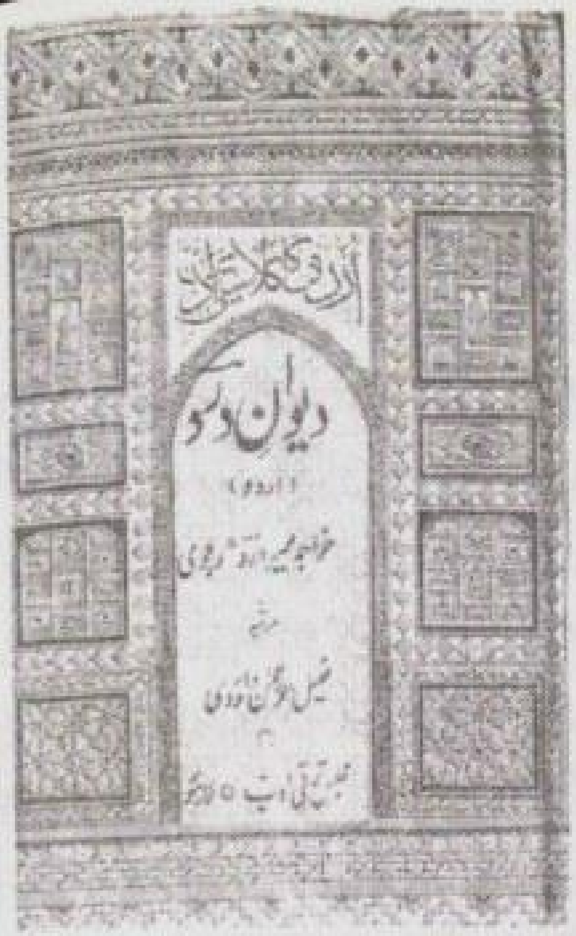
مذہب عشق : ۱۹۶۱ء، دیوانِ درد : ۱۹۶۲ء، قواعد زبانِ اردو : ۱۹۶۲ء، نورتن : ۱۹۶۳ء، بہارِ دانش : ۱۹۶۳ء، سروشِ سخن : ۱۹۶۳ء، یادگارِ غالب : ۱۹۶۳ء، تذکرہ بہارستان ناز : ۱۹۶۵ء، تذکرہ گلستانِ سخن جلد اول : ۱۹۶۶ء، تذکرہ گلستانِ سخن جلد دوم : ۱۹۶۶ء، قصہ اگر گل : ۱۹۶۷ء، اردو کی قدیم منظوم داستانیں : ۱۹۶۷ء، مجموعہ نثرِ غالب اردو : ۱۹۶۷ء، کلیاتِ انشاء جلد اول : ۱۹۶۹ء، رسوم ہند (مقدمہ) : ۱۹۷۱ء، قصصِ ہند (مقدمہ) : ۱۹۷۱ء

ان کے علاوہ غیر مطبوعہ کتب کی تعداد چار ہے جو مجلس ترقی ادب کے پاس ہیں۔ کلیاتِ انشاء جلد دوم مرتبہ ۱۹۶۹ء، قصہ گل و صنوبر، نیم چند کھتری مرتبہ : ۱۹۶۶ء، طلسمِ حیرت مصنفہ جعفر علی شیون لکھنوی مرتبہ : ۱۹۶۶ء اور افسانۂ عجائب مصنفہ رجب علی بیگ سرور لکھنوی مرتبہ : ۱۹۶۶ء

مجلس ترقی ادب سے وابستگی کے زمانے میں داؤدی صاحب کو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا صلاح الدین، سید عابد علی عابد، حمید احمد خاں، سید امتیاز علی تاج، مولانا محمد شفیع، شیخ محمد اکرام اور ممتاز حسن احسن جیسے نابغۂ روزگار نفوس کی ہم نشینی حاصل رہی۔ مجلس سے تعلق منقطع ہونے کے بعد داؤدی صاحب نے خالصتاً فارسی و عربی مخطوطات کی تحقیق کے لئے خود کو وقف کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں "چونکہ طبیعت شروع سے ہی مائل بہ جستجوئے حقائق رہی اس لئے اس میدان میں آنے کے بعد توسنِ تحقیق کی جولانیاں سرمایۂ تحقیق میں بیش بہا اضافوں کی موجب ثابت ہوئیں۔ فی الاصل میری علمی کاوشوں کا حاصل میرا فارسی و عربی مخطوطات کے سلسلے میں وہ تحقیقی کام ہے جس کی اہمیت کا اندازہ کوئی فارسی و عربی کے میدان کا مرد کار ہی لے سکتا ہے۔ میں نے اس طرح ہزاروں مخطوطات پر تحقیقی کام کیا ہے۔ کسی مخطوطے پر تحقیق کرتے ہوئے میں نے دنیا بھر کے ذخیرہ ہائے مخطوطات میں محفوظ خطی نسخوں کی توضیحی فہرستوں اور کتب ہائے حوالہ کو استعمال کیا ہے۔ ایسے بے شمار غیر مطبوعہ اور منحصر بفرد خطی نسخوں کو متعارف کرایا ہے جس سے تمام اہلِ علم ابھی تک بے خبر تھے اس طویل عرصے میں میں نے اتنا کام کیا ہے جو متعدد جلدوں میں مرتب ہو سکتا ہے۔ اگر کسی وقت وہ مرتب ہو کر شائع ہو گیا تو دنیائے اسلام کے اربابِ تحقیق کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہو گا"۔



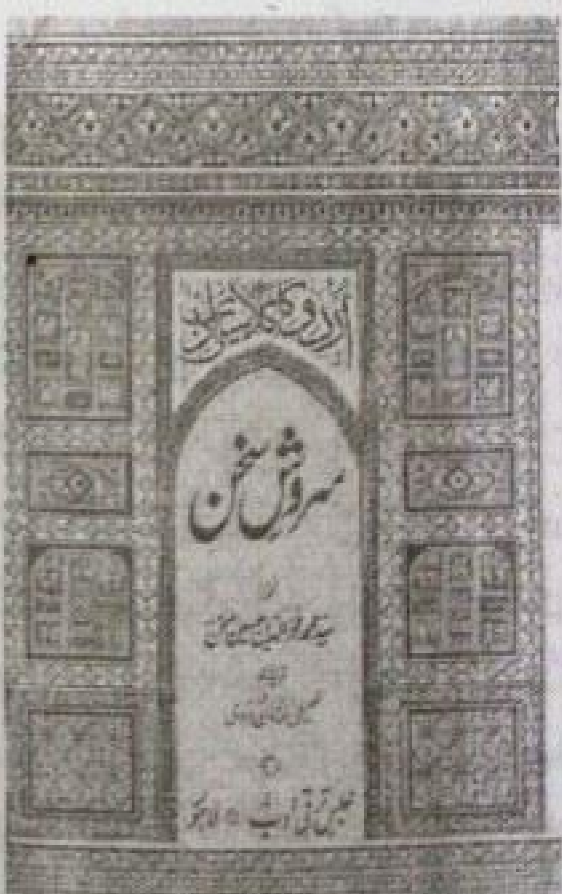
سرِ ورق: قصہ اگر گل
مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی



سرِ ورق: دیوانِ درد (اردو):
خواجہ میر درد دہلوی مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی



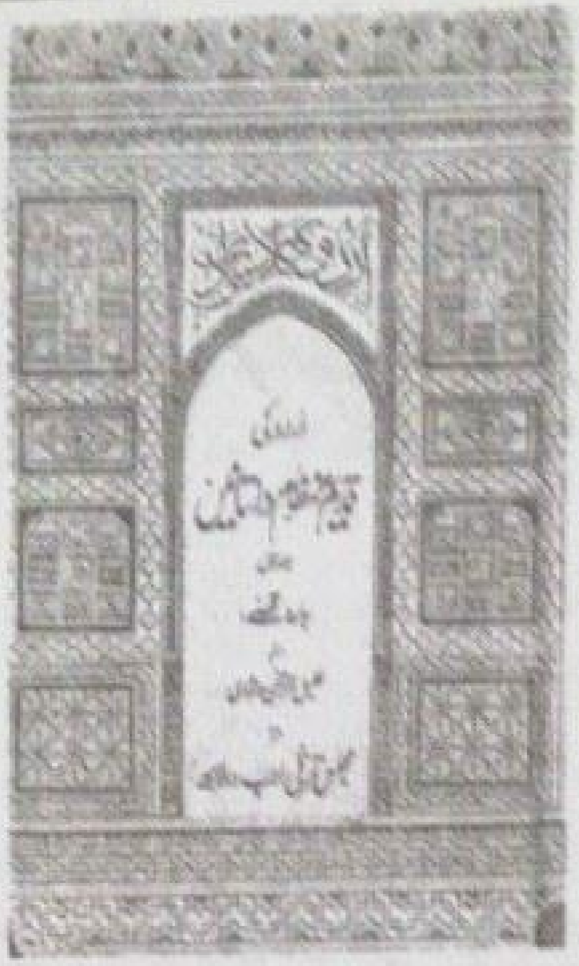
سرِ ورق: مجموعہ نثر غالب اردو
مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی



سرِ ورق: سروشِ سخن: سید محمد فخر الدین حسین سخن
☆ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی



سرورق: بہارِ دانش: مرزا طپش ☆ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی



سرورق: اردو کی قدیم منظوم داستانیں، مرتبہ الرحمٰن خلیل داؤدی

داؤدی صاحب نے تعیین مخطوطات کے رہنما اصول بھی مرتب کیے ہیں۔

محترم خلیل الرحمٰن داؤدی دو بہن بھائی تھے۔ چار سال چھوٹی بہن ام حبیبہ پاکستان نہیں آئیں۔ چند سال پہلے بھارت میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ داؤدی صاحب اپنے خاندان میں سے تنہا پاکستان آئے تھے۔ یہاں ۲۵ اپریل ۱۹۵۶ء کو بلقیس جہاں آرا سے شادی کی۔ یہ رفاقت تقریباً" چالیس سال قائم رہی۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔ آپ کی اولاد میں ایک صاحبزادے شقائق النعمان داؤدی اور دو صاحبزادیاں گل داؤدی اور مسز شمائلہ داؤدی ہیں۔ یہ تینوں اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے اکلوتے فرزند کے ساتھ لاہور میں مقیم ہیں۔



نواب خیراندیش خاں کی یادگار تصویر
[illegible]

نواب خیراندیش خاں

نواب خیراندیش خاں میر محمی بن نواب محبت خاں بن نواب اسد خاں بن نواب دادن خاں۔ محمد خان اصلی نام اور خیراندیش خان شاہی خطاب تھا۔ آپ بڑے مدبر، مخیر، ہنرمند، دانشور اور فیاض امیر تھے۔ آپ کے اسلاف و اخلاف سب نامور گزرے ہیں۔ نواب اسد خاں نہایت تنومند، زور آور، وجیہ و پرغرور تھے۔ نواب محبت خاں کی تعمیر کردہ جامع مسجد پشاور میں موجود ہے جو سنگِ سرخ سے تعمیر کی گئی تھی۔ ان کا مقبرہ میرٹھ میں مزارِ پرانوار مخدوم شاہ ولایت صاحب کے پاس سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ نواب محبت خاں کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ ایک بزرگ نے درود شریف بتایا۔ اس کی برکت سے جمال جہاں آرائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور تولد فرزند صالح کی بشارت ہوئی۔ نواب خیراندیش خاں کی ولادت ہوئی۔ ان کا نام محمد خان رکھا گیا۔ آپ میں ابتدا ہی سے حسب بشارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آثار رشد پیدا تھے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اخلاقِ فاضلہ اور فنونِ عالیہ میں ترقی ہوتی گئی۔ علوم میں فضیلت اور طب میں مہارت حاصل کی، انشا پردازی میں نمایاں ہوئے۔ نواب خیراندیش خاں صاحب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔

نواب صاحب علوم میں کمال حاصل کرنے کے بعد پہلے شاہزادہ دارالشکوہ کے متوسل ہوئے۔ بعد قتل دارالشکوہ ملازمان عالمگیر میں شامل ہوئے۔ پنج ہزاری تک منصب پایا اور شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد میں شش ہزاری منصب پر پہنچے اور خیراندیش خاں کا خطاب پایا۔ شاہ نواز خاں نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ خیراندیش خاں عمل و کارگزاری میں یگانۂ آفاق تھے۔

نواب خیراندیش نے بہت سے آثار اور نشانیاں یادگارِ زمانہ چھوڑیں، جن میں سے اکثر موجود ہیں۔ اپنے وطن میرٹھ میں قلعہ پختہ معہ بازار و مسجد و مکانات تعمیر کرکے اس کا نام "خیرنگر" رکھا۔ "مرکز الخیر" : ۱۱۰۸ھ قلعہ کی اور "خیر المساجد والمعابد" : ۱۱۰۲ھ مسجد کی تعمیر کی تاریخ ہے۔ کمن پور میں حضرت

شاہ بدیع الدین زندہ شاہ مدار کا مقبرہ و دیگر مکانات نواب صاحب ہی کے تعمیر کردہ ہیں۔ ضلع اٹاوہ میں موضع خیر نگر آباد کیا۔ اٹاوہ میں کرہ سیوا کلی آپ کی کنیز کے نام سے آباد ہے۔ اسی شہر میں ایک شفاخانہ قائم کیا تھا جس میں نامور حکماء خدمات انجام دیتے تھے۔ فنِ طب کی کتاب "خیر التجارت" : ۱۰۴۷ھ آپ کی تالیفات میں سے ہے۔

نواب خیر اندیش خاں کو اللہ تعالیٰ نے بلند اقبالی کے ساتھ عمرِ دراز بھی عطا کی تھی۔ آپ نے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ایک سو بیس برس نیک نامی اور کامرانیوں کے ساتھ بسر کر کے عید الفطر کے دن ۱۱۲۲ھ میں جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ تاریخ وفات:

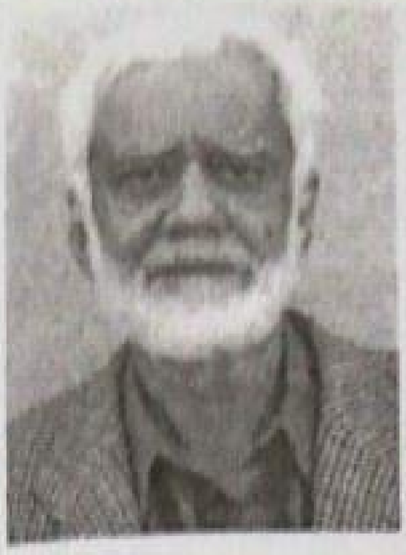
نواب نماز عید در جنت کرد، قدسیاں گفتند رکن الخیر بود، مخیر الامرا

۱۱۲۲ھ　　　۱۱۲۲ھ　　　۱۱۲۲ھ

نواب خیر اندیش خاں کے صاحبزادے محمد فاضل مثل نام خود عامل و فاضل تھے۔ تارکِ دنیا ہو کر طاعت و عبادت میں مصروف رہے۔ بادشاہِ وقت نے ان کو نیک اندیش خاں کا خطاب دیا تھا۔ ان کے صاحبزادے محمد مسیح المخاطب بہ نواب خیر اندیش خاں ثانی امارت و مرتبت اور شجاعت میں اپنے دادا نواب خیر اندیش خاں کی طرح تھے۔ بہت مضبوط جسم کے مالک تھے۔ انہوں نے قلعہ خیر نگر میرٹھ میں شیش محل معہ صحن و باغ و پائیں باغ و حوض و فوارہ وغیرہ تعمیر کیا۔ اس محل کے باغیچہ میں دو پھل عجیب و غریب تھے، جن کو ثمراتِ بہشت کہا جاتا تھا۔ ایک لیموں کاغذی جس کا وزن چودہ چھٹانک ہوتا تھا اور دوسرا فالسہ جس میں ترشی نام کو نہ تھی۔ نواب محمد مسیح نے بریلی میں ایک قلعہ بھی تعمیر کیا تھا، بعد میں اس کا نام نومحلہ مشہور ہوا۔ بریلی کی عید گاہ اور مبارک محل انہیں کے تعمیر کردہ ہیں۔ نواب محمد مسیح کے چار بیٹے نیک اندیش خاں، خیریت اندیش خاں، فضل علی خاں اور احسان علی خاں تھے۔

المشاہیر، ص ۱۵۰ تا ۱۵۹، مطبوعہ ۱۸۹۸ء

مصنف حکیم فیض احمد مارہروی، بہ شکریہ پروفیسر ظفر عمر زبیری



ڈاکٹر سید زاھد علی واسطی

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی کئی حوالوں سے بہت نمایاں ہیں۔ ایک دانشور' محقق' مترجم' مورخ' سیاح اور ادیب کی حیثیت سے ان کا نام محتاجِ تعارف نہیں' رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت اطہار سے ان کا عشق بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آپ کے سفرنامے بھی مشہور ہوئے ہیں اور موصوف نے تاریخ کے گمشدہ اوراق کو دریافت کرنے اور معدوم نقوش کو صفحۂ قرطاس پر اجاگر کرنے میں بھی نہایت عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ ڈاکٹر رئیس الدین احمد نے لکھا ہے "ڈاکٹر واسطی صاحب سلجھی ہوئی ایک متین شخصیت ہیں۔ زیرک سوچ و فہم کے مالک ہیں۔ بزلہ سنجی' ژرف نگاری' پاکیزگی بشرے سے عیاں ہوتی ہے۔ گفتگو کا انداز پذیرانہ اور محققانہ ہے۔ تحریریں شگفتہ' باوقار' سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی سے مالامال ہوتی ہیں"۔

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی کی ولادت سید فصیح الزماں واسطی صاحب کے خوش حال گھر میں ۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ہوئی جن کا شمار تعمیراتی ماہرین میں ہوتا تھا۔ چچا سید اسد علی واسطی مسلم رہنماؤں کی صف میں شامل تھے۔ سید زاہد علی واسطی صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت اہتمام سے ہوئی۔ بچپن کا زمانہ اس لئے اہم رہا کہ اس وقت آزادیٔ ہند اور حصولِ پاکستان کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں۔ اس دور میں واسطی صاحب کو چودھری رحمت علی' قائداعظم' علامہ شبیر احمد عثمانی' شہیدِ ملت لیاقت علی خاں' حسرت موہانی' مولوی عبدالحق اور مسز وجے لکشمی پنڈت جیسی اہم شخصیات سے ملنے کے مواقع میسر آئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اسپیشل ٹرین کے ذریعہ واسطی صاحب نے پاکستان ہجرت کی اور بھاولپور کو مستقر بنایا۔ بھاولپور میں ڈاکٹر صاحب کی ننھیالی عزیزداری تھی۔ والدہ کے متعدد خواہرزاد اعلیٰ عہدوں پر تعینات تھے۔ ایک ماموں ریاست کے کنسوڈین' دوسرے سپرنٹنڈنٹ پولیس' تیسرے سول سرجن' چوتھے تحصیلدار' پانچویں انکم ٹیکس آفیسر اور چھٹے نواب صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری تھے۔ واسطی صاحب نے لکھا ہے "والد صاحب کی جائداد بہت کافی تھی جو ہم میرٹھ چھوڑ آئے تھے اور نہایت

خوش حال تھے مگر اب یہاں مہاجر تھے۔ گو شہر بھاولپور میں ہزاروں مکان ہندوؤں کے خالی پڑے تھے مگر والد کی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ کسی عزیز کے دروازے پر دستک دیتے یا استعداد کے طالب ہوتے۔ دو روز کے بعد ایک مسلمان کا مکان محلہ عام خاص میں قاضی والی مسجد کے سامنے ساٹھ روپے کرائے پر لے کر سکونت اختیار کر لی"۔

بھاولپور آکر واسطی صاحب نے میٹرک کا امتحان دیا اور تین سال تعلیمی تسلسل قائم نہ رہنے کے باوجود فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ اچھا ذہن رکھتے تھے اور تعلیم کے سلسلے میں سنجیدہ بھی تھے' اس لئے حالات حصول علم میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ ایف۔ ایس۔ سی اور ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کراچی سے ریاست بھاولپور کے نواب صادق محمد خاں عباسی کے وظیفہ سے پاس کیا۔ جس کے بعد ۱۹۵۸ء میں ایک دیہی شفاخانہ ترنڈہ محمد پناہ سے عملی زندگی کی ابتدا کی۔ ۱۹۶۱ء میں تحصیل ہسپتال رتوڈیرو ضلع لاڑکانہ میں تعینات ہوئے' وہیں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو سے تعلقات قائم ہوئے۔ بعد میں منٹگمری' ملتان' بھاولپور' مظفر گڑھ اور لاہور میں پوسٹنگ رہی۔ ڈائریکٹر ہیلتھ ملتان کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

واسطی صاحب دینی ذہن رکھتے ہیں اور اسلام کی حقانیت پر ان کا یقین نہایت پختہ ہے۔ ۱۹۷۹ء میں آپ نے حج کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد سے تقریباً ہر سال طوافِ حرم اور دربارِ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خطاط بھی ہیں۔ کئی سال کی محنت کے بعد آپ نے کلامِ ربانی کی کتابت ۱۹۹۰ء میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مکمل کی۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی خواہش پر واسطی صاحب نے یہ کتابت انہیں بھی دکھائی تھی۔

واسطی صاحب کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد کا اہم کردار ہے۔ وہ ایک علم دوست شخص تھے۔ خاندان میں بھی پڑھے لکھے افراد کی کثرت تھی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ میں جب واسطی صاحب زیرِ تعلیم تھے تو لکھنے لکھانے کا شوق ہوا۔ اسکول کی لائبریری میں "الہام" دہلی آتا تھا۔ اس رسالہ کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے تھے۔ یہ مطالعہ ہی کا ذوق تھا کہ آپ نے جیب خرچ سے پیسے بچاکر رسالہ اپنے نام جاری کرایا۔ پھر ذہن رسالے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ ایک مضمون لکھا اور "الہام" کو اشاعت کے لئے ارسال کر دیا جو اس میں چھپ گیا۔ دوسرے مضمون کا عنوان تھا "خونی پل"۔ میرٹھ میں یہ ایک تاریخی پل ہے' جہاں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے حریت پسندوں کا قتلِ عام کیا گیا تھا۔ تاریخی پس منظر میں اس مضمون کی اشاعت کے بعد باقاعدگی سے لکھنا واسطی صاحب کا معمول بن گیا۔ گھر کے افراد اس سے بے خبر تھے۔ ڈاکٹر مقصود زاہدی ماموں زاد بھائی تھے' ان کو کسی طرح خبر ہو گئی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ لکھتے رہو۔ ڈاکٹر مقصود زاہدی جن سے بعد میں واسطی صاحب کی بڑی ہمشیرہ سلطان جہاں منسوب ہوئیں' کی حوصلہ افزائی اور الہام میں مضامین کی اشاعت نے واسطی صاحب کا قلم سے تعلق مستحکم کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بعد میں قلم سے وابستگی اس حد تک بڑھی کہ آج وہ نامور مفکر' عظیم محقق اور ممتاز سیرت نگار

کی حیثیت سے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ آپ کے بارے میں کہا گیا ہے "جب علم کی سرمدی قندیل ہاتھ میں تھام کر توحید و نبوت کی بات کرتے ہیں تو قرآن کا اجمال تفصیل کی دودھیا روشنی میں نہا جاتا ہے۔ ایسی روشنی ملحدوں کو مسلمان اور مسلمانوں کو مومن بناتی ہے"۔

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی ایک کثیر الاسفار شخص بھی ہیں۔ آپ نے نصف سے زیادہ دنیا دیکھ رکھی ہے۔ آپ نے سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ آپ کی سفرنامہ نویسی کی چند خصوصیات وہ ہیں جن کا ہر قاری معترف ہے۔ اول یہ کہ وہ قاری کو قاری نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اپنا ہم سفر بنا لیتے ہیں۔ آپ کے سفرنامے پڑھتے پڑھتے قاری مشاہدات، محسوسات اور کیفیات میں آپ کا ظل بن جاتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ رودادِ سفر اتنی واضح، شفاف، جامع، معلومات افزا اور اثر انگیز ہوتی ہے کہ قاری آپ کی بلاغت، نفاست اور لطافت پر واہ واہ کیے بغیر نہیں رہتا۔ واسطی صاحب کے کئی سفرنامے شائع ہو چکے ہیں جو اپنے اسلوب کی دل آویزی میں آپ اپنا جواب ہیں۔ آپ کی تحریر رواں اور شستہ ہے۔ سید جاوید اقبال مشہدی ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت ملتان نے ۶ مارچ ۱۹۹۵ء کی اشاعت میں ڈاکٹر واسطی صاحب کے اسلوب تحریر اور موضوعات کی جامعیت کے حوالے سے لکھا ہے "ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے ڈاکٹر واسطی میرے پسندیدہ مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ جیسی ان کی شخصیت ہے ایسی ہی ان کی دلکش تحریر ہے اور صفحہ قرطاس پر جب قلم چلتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ مسودہ کسی ماہر خطاط کا شذرہ قلم ہے"۔ واسطی صاحب اب تک دس ہزار سے زائد صفحات لکھ چکے ہیں۔ آپ کی پہلی تصنیف "اُسوۂ حسین" تھی جو ۱۹۸۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد بائیس کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ سید المرسلین ۲۔ اعزازاتِ رسول ۳۔ طبِ نبوی دورِ جدید میں ۴۔ اُسوۂ حسین ۵۔ اُمہات المومنین ۶۔ قرآنی دعائیں ۷۔ دنیا و مافیہا ۸۔ روشنی کا سفر ۹۔ سیدھے راستے کی تلاش ۱۰۔ زندگی تابندگی ۱۱۔ نوائے سروش ۱۲۔ دیکھ لیا ملتان ۱۳۔ بہاولپور کی سرزمین ۱۴۔ جا تیرا امریکہ دیکھ لیا ۱۵۔ صبحِ استنبول شامِ دمشق ۱۶۔ بیتی یادیں

سید زاہد علی واسطی صاحب کی کتب اور علمی خدمات پر معتبر و ممتاز اسکالرز نے اظہار خیال کیا ہے۔ مختلف کتابوں کے حوالے سے جو آراء سامنے آئی ہیں، ان میں سے چند کے مختصر اقتباسات دیکھیے:

ڈاکٹر شمیم حیدر، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور: ڈاکٹر واسطی نے قرآن کو پہلے خود سمجھا ہے اور پھر ASSIMILATION کے بعد ہمیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ قرآنی مضامین پر عبوری کا اعجاز ہے کہ ان کا ابلاغ مکمل ہے اور قاری پر ہر موضوع کے گرد پھیلے ہوئے تصورات واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی، پی۔ ایچ۔ ڈی: امام عالی مقام کی شخصیت کے مظاہر کو صرف کربلا کے دس دن کے

حوالے سے پیش کرنا اپنی جگہ کتنا ہی اہم کام ہو تاہم یہ واقعہ ایک بے حد عظیم بیرت کو تمام و کمال انداز میں سامنے نہیں لاتا۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب "شہید حسین" امام کی اسوۂ حسنہ شمائل و خصائل کا آئینہ خانہ بھی ہے اور ان کے بے مثال کارناموں کے اثرات 'ثمرات اور برکات کا ایک مظہر نامہ بھی ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود' پی۔ ایچ۔ ڈی: "روشنی کا سفر" میں جن خیالات و احساسات کا اظہار کیا گیا ہے ان سے ڈاکٹر واسطی صاحب کے دینی اور اک 'تفسیر معروف اور قرآن فہمی کے علاوہ وسعتِ مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ ان تحریروں میں معارف و بصائر کے خزانے موجود ہیں۔

ڈاکٹر سید شاہد حسین رضوی' پی۔ ایچ۔ ڈی: یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ بھاولپور کے ماضی کی تمدنی' معاشرتی' سیاسی' معاشی اور ادبی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر مصنف کی نظر نہ گئی ہو یا وہ اس کی نظروں سے اوجھل رہا ہو۔ ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی کا یہ کارنامہ جس میں انہوں نے ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے آثار کو قرطاسِ ابیض پر آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا ہے لائق صد تحسین و تکریم ہے۔

ڈاکٹر عاشق محمد خاں درانی' پی۔ ایچ۔ ڈی وائس چانسلر بہاالدین زکریا یونیورسٹی ملتان: ڈاکٹر واسطی صاحب یوں تو ملتان کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ اسلامک ہسٹری میں آپ کا مطالعہ و دلچسپی کسی تعارف کا محتاج نہیں مگر آپ نے ملتان کی تاریخ کے اوراق پر سے دبیز گرد کی تہہ ہٹا کر "دیکھ لیا ملتان" لکھ کر اپنی تاریخ دانی کا لوہا منوا لیا۔

ڈاکٹر مصباح العین خاں' پی۔ ایچ۔ ڈی: ڈاکٹر واسطی صاحب خود چلتے پھرتے معلومات کا خزانہ ہیں۔ تحریر کا انداز ایسا ہے "گویا میں نے جانا یہ بھی میری دل میں ہے"۔

ڈاکٹر رئیس الدین احمد' پی۔ ایچ۔ ڈی: ڈاکٹر واسطی صاحب قلم کے شہ سوار ہیں۔ زیرک سوچ و فہم کے مالک ہیں۔ ان کی تحریروں سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں الفاظ کا وافر ذخیرہ ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ جہاں قلم اٹھایا وہ اس ترتیب سے قلم کی نوک سے ٹپکنے لگتا ہے کہ خود بخود خیالات کو ادب میں پرو تا چلا جاتا ہے اور موضوع کی وسعتوں کو صفحاتِ قرطاس میں مقید کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر مدبر رضوی' پی۔ ایچ۔ ڈی: کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آپ کی وسعتِ نظر' اصابت رائے' قرآن و احادیث میں کس قدر گہری ہے۔ دل کش اور عالمانہ انداز بیان ان کی تحریروں سے عیاں ہے۔

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی صاحب کی شادی یکم جنوری ١٩٧٠ء کو محترمہ فریدہ بیگم بنت سید تفضل حسین صاحب سے ہوئی۔ آپ کی اولاد میں سید حسنین' سید زین العابدین' عالیہ بیگم اور فصیحہ ارم عملی زندگی گزار رہے ہیں۔ ملتان میں مقیم ہیں۔



زیڈ۔ اے۔ نظامی

ظل احمد نظامی

ممتاز ماہر تعمیرات و منصوبہ بندی' قابلِ قدر علم دوست' سرسید احمد خاں کے پیروکار' انتہائی وضعدار و مخلص محترم زیڈ۔ اے۔ نظامی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ملک کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ شب و روز کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جب آپ کچھ نہ کچھ نہ کر رہے ہوں اور اس کچھ نہ کچھ میں اتنا کچھ کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اپنی انہیں ہمہ جہت خدمت و مصروفیت کے حوالے سے آپ کو ملک گیر احترام حاصل ہے۔

آپ کی ولادت ۲۵ مئی ۱۹۳۱ء کو ہوئی۔ ابتدا سے ہی ذہین تھے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ سے ۱۹۴۶ء میں فرسٹ ڈویژن میں انگریزی اور حساب میں امتیازی نمبروں کے ساتھ میٹرک اور ۱۹۴۸ء میں میرٹھ کالج سے سائنس میں انٹر کیا۔ سول انجینئرنگ میں ۱۹۵۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فرسٹ ڈویژن ہی میں بی۔ ایس۔ سی کر کے اپنے مستقبل کا تعین کیا۔ ۶۲۔ ۱۹۶۱ء میں ہالینڈ سے ہاؤسنگ اینڈ ٹاؤن پلاننگ میں پوسٹ گریجویٹ اور لندن یونیورسٹی' برطانیہ سے بڑے شہروں کی منصوبہ بندی پر اسپیشل پوسٹ گریجویٹ کورس کرنے کے بعد برلن یونیورسٹی' جرمن سے سب انٹیگریٹیڈ اربن سٹیلمنٹ میں پوسٹ گریجویٹ کورس کر کے شہری و دیہی منصوبہ بندی کے شعبہ میں معتبر مقام حاصل کیا۔

محترم زیڈ۔ اے نظامی نے ۱۹۵۲ء میں کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۶۷ء تک اسسٹنٹ ایگزیکٹو انجینئر' ایگزیکٹو انجینئر اور سپرنٹنڈنگ انجینئر کی حیثیت سے فرائض انجام دئے۔ ان عہدوں پر رہتے ہوئے آپ نے متعدد منصوبوں پر کام کیا۔ ۱۹۶۷ء میں ڈپٹی چیف ٹاؤن پلانر مقرر کئے گئے اور دو سال بعد چیف ٹاؤن پلانر اور آرچیٹکٹ ادارہ ترقیات کراچی کی حیثیت سے فرائض سنبھالے۔ ۱۹۷۴ء میں اسی ادارے میں ڈائریکٹر ماسٹر پلان بنے اور چودہ سال تک اس عہدے پر بحسن و خوبی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۸ء میں ممبر (میکنیکل) کے۔ ڈی۔ اے ہوئے اور دو سال بعد ۱۹۸۰ء میں ادارہ ترقیات کراچی کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ جلیلہ پر فائز کئے گئے۔ آپ نے ان تمام عہدوں پر رہتے

ہوئے کراچی کی شہری منصوبہ بندی کی۔ فراہمی و نکاسی آب' سڑکوں کی تعمیر و توسیع اور سستے رہائش کے قابلِ عمل منصوبے تجویز کئے۔ اس لئے یہ کہنا بیجانہ ہو گا کہ زیڈ۔ اے۔ نظامی صاحب نے کراچی کو کراچی بنانے میں پورے انہماک' انتھک محنت اور موثر حکمتِ عملی سے کام کیا ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

نظامی صاحب نے برطانیہ' فرانس' مغربی جرمنی' امریکہ' کینیڈا' نیدرلینڈ' اٹلی اور ملائیشیا کے مطالعاتی دورے کئے۔ جاپان' فرانس' ترکی' ایران' تنزانیہ' ہندوستان' کینیا' برطانیہ' جرمنی' میکسیکو' امریکہ' کینیڈا اور ملائیشیا وغیرہ میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی اور یو۔ این۔ سی۔ ایچ۔ ایس کی کانفرنس منعقدہ دہلی : ۱۹۸۸ء میں قومی وفد کی قیادت بھی کی۔ ۱۹۷۰ء میں نظامی صاحب کو حکومت سعودی عرب کی جانب سے مدعو کیا گیا کہ وہ دوران حج ٹرانسپورٹ اور منصوبہ بندی کی مشکلات کو حل کرنے میں رہنمائی فرمائیں۔ یہ ایک بڑا اعزاز ہے کہ حجازِ مقدس کی خدمت کی سعادت آپ کو حاصل ہوئی۔

محترم زیڈ۔ اے۔ نظامی پاکستان انجینئرنگ کونسل اور انسٹی ٹیوٹ آف ہاؤسنگ اینڈ ٹاؤن پلاننگ ہالینڈ کے ممبر ہیں ورلڈ بینک سے بھی متعلق رہے ہیں۔ ادارہ ترقیات کراچی سے سبکدوشی کے بعد بھی آپ نے گوشہ نشینی یا لاتعلقی پسند نہیں کی اور یہ سیماب صفت شخصیت متحرک ہے۔ آپ نے علم کے فروغ کے ذریعے اپنی قوم کی حالت بدلنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ سرسید احمد خاں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جذباتی وابستگی کا ثبوت آپ کی وہ عملی کوششیں ہیں جو آج ثمر بار شجر بن چکی ہیں۔ آپ نے ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ کے فروغ کے لئے "سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی" کی بنیاد رکھی۔ گلشنِ اقبال کراچی میں واقع یہ یونیورسٹی اور اس کے بڑھتے ہوئے آثار استحکام کی علامت ہیں اور یہ سب اس کے چانسلر زیڈ۔ اے۔ نظامی صاحب کی کرشمہ ساز شخصیت کا اعجاز ہے۔

آپ سماجی' ثقافتی' تعلیمی اور ادبی پروگراموں میں چاق و چوبند نظر آتے ہیں بلکہ ایسی تقریبات کا اہتمام بھی دلچسپی کے ساتھ کرتے ہیں۔ موصوف علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ اس ادارے سے وابستہ حضرات کی خدمات سے سب بخوبی واقف ہیں۔ نظامی صاحب میرٹھ سے وابستگی کا اظہار بھی فخر و مسرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ تنظیم احباب میرٹھ کے صدر بھی ہیں۔ بلاشبہ میرٹھ کو اپنے جن شہریوں پر فخر ہو سکتا ہے ان میں نظامی صاحب کا نام بھی نمایاں رہے گا۔

زیڈ۔ اے۔ نظامی صاحب کی اولاد میں پانچ صاحبزادے عرفان احمد نظامی' فرخ احمد نظامی' طارق احمد نظامی' نوید احمد نظامی اور فرقان احمد نظامی کے علاوہ ایک صاحبزادی افشاں امجد ہیں۔



پنڈت سر سیتا رام

سر سیتا رام

پنڈت سر سیتا رام میرٹھ کی ان قابلِ ذکر شخصیات میں نمایاں ہیں جنھوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے مسلسل کام کر کے قدر و منزلت حاصل کی۔ وہ ایک انسان دوست اور ہر دل عزیز شخص تھے۔

سر سیتا رام ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ سنسکرت میں ایم۔ اے ہونے کے سبب سر سیتا رام پنڈت کہلاتے تھے۔ انہیں سر کا خطاب حکومتِ وقت نے دیا تھا۔ وہ ایک دور اندیش سیاست داں اور ملک کے مفادات کا تحفظ کرنے والے مخلص تھے۔ میرٹھ کالج سے ان کی وابستگی گہری تھی۔ ۱۹۱۸ء تک انہوں نے کانگریس کے لئے کام کیا اور ایک رہنما کی حیثیت سے شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ سر سیتا رام نے مہاتما گاندھی کی میرٹھ آمد کے موقع پر رولٹ ایکٹ کے خلاف بیان دیا تھا مگر ۱۹۱۹ء میں انہوں نے کانگریس چھوڑ دی۔ اس کے ایک سال بعد یو۔ پی کونسل کے ممبر چنے گئے اور ۱۹۳۲ء تک یو پی کونسل کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی انتخابات میں پنڈت پیارے لال شرما کے مقابلے میں شکست سے دو چار ہوئے لیکن ان کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ ۱۹۴۲ء میں میرٹھ کالج سے قومی پرچم اتروانے کی انگریز اہلکاروں کی کوشش کی انہوں نے سخت مزاحمت کی۔

سر سیتا رام وطن پرست تھے۔ خدمتِ خلق کے ساتھ تعلیم کا فروغ ان کا مقصد رہا۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی انہیں مقاصد کے حصول کے لئے وقف رکھی۔ اپنے نظریات پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ اسی لئے انہیں مرکزی سطح پر کوئی اہم منصب تو نہ مل سکا مگر ہر مشکل وقت میں وہ رہنمائی کرتے رہے۔

سر سیتا رام نے تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں ہندوستان کے پہلے سفیر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں حاکمانِ وقت اور عوام کا اعتماد حاصل تھا۔ انہوں نے سفیر کی حیثیت سے دونوں ملکوں کے اس مشکل دور میں دانشمندی سے کام کیا۔

پنڈت سر سیتا رام چوراسی سال کی عمر میں ۱۹۷۱ء میں رخصت ہوئے۔ ان کے انتقال پر بڑے پیمانے پر سوگ منایا گیا اور ان کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ آج بھی ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔

میرٹھ ماس، ۲۳۶ تا ۲۳۳

حکیم سیف الدین احمد

میرٹھ کی علمی و ادبی اور سماجی و ثقافتی زندگی میں محترم حکیم سیف الدین احمد کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔ موصوف نے علم و ادب، تہذیب و تمدن اور طب و ثقافت کے شعبوں میں قابلِ قدر خدمات انجام دے کر یہ مقام حاصل کیا ہے۔ موصوف کی ہمہ گیر صلاحیتوں کا اعتراف ہر سطح پر کیا گیا ہے۔

حکیم سیف الدین احمد صاحب کے مورثِ اعلیٰ محمد ادریس خجندی شاہ طہماسپ کے ایما پر ہمایوں بادشاہ کی مدد کے لئے ۱۵۵۵ء میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے نواب مجاہد الملک حاجی محمد ادریس خجندی کے پوتے شیخ محمد برخوردار کو خانی کے خطاب سے نوازا اور میرٹھ کے لساڑی گیٹ کے علاقے میں ستائیس ہزار گز کا قطعہ زمین اپنے محل سرائے کو تعمیر کرنے کے لئے عطا کیا جہاں انہوں نے اپنے خاندان کے لئے مکانات بنوائے اور علاقہ کا نام اپنی قوم کے نام پر بنی اسرائیل رکھا جو اب بنی سرائے کہلاتا ہے۔ اس خاندان کے اکثر افراد ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ مغلیہ سلطنت کے فرامین آج بھی حکیم صاحب کی لائبریری کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

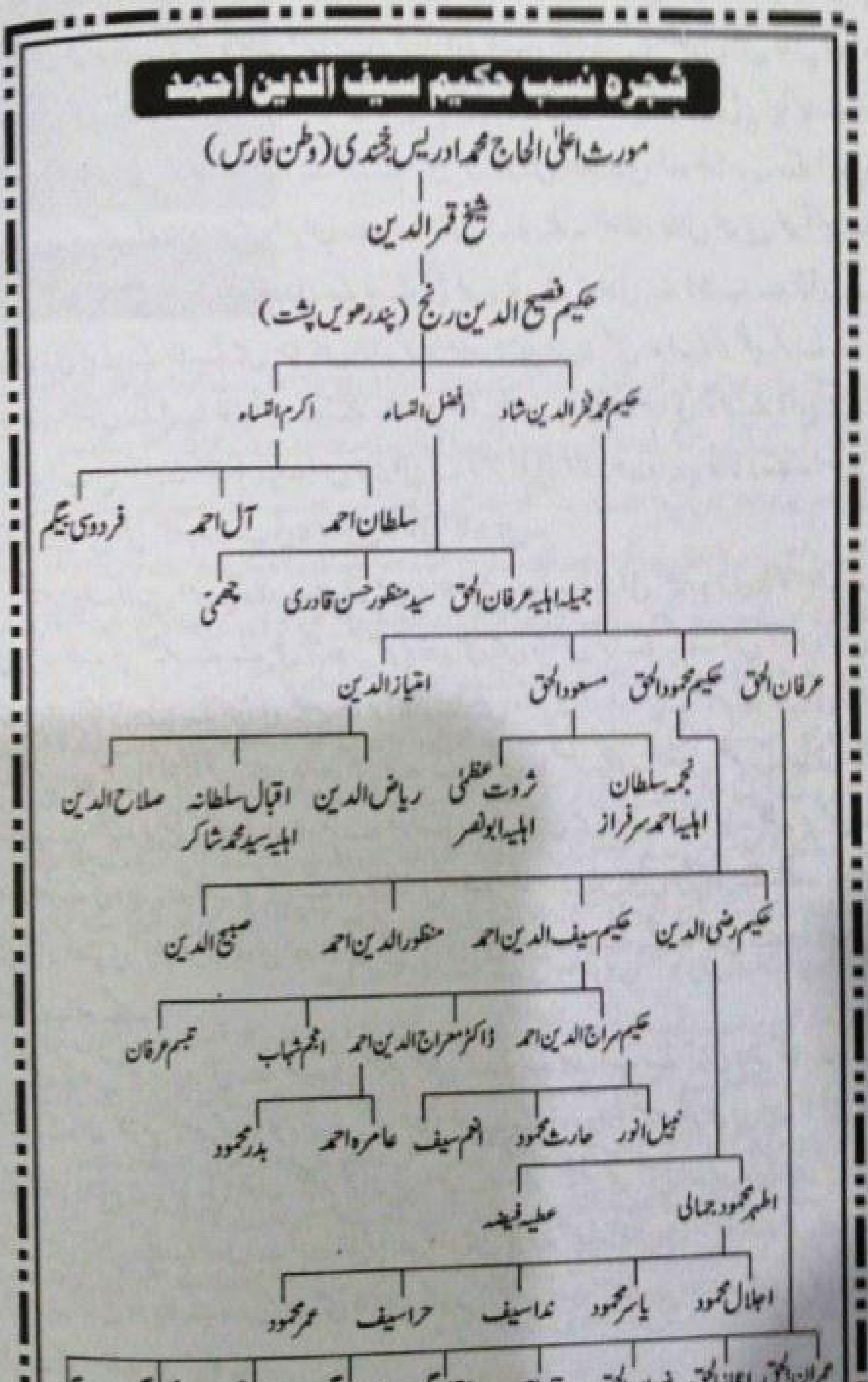
حکیم سیف الدین احمد کی ولادت میرٹھ میں ۷ ۱۹۲ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کا اہتمام وطن میں ہی ہوا۔ طب کی تعلیم کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل کرائے گئے۔ اس ممتاز دانش گاہ کے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ نے ان کی شخصیت کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حکیم صاحب کی طالب علمی کے اس دور میں ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ حصولِ علم کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب نے طلباء یونین کے پلیٹ فارم سے غیر نصابی سرگرمیوں میں خوب حصہ لیا۔ طلبہ یونین کے نائب صدر ہونے کی وجہ سے طلبہ یونین کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان مشاعروں میں مجاز لکھنوی، جگر مراد آبادی اور جوش ملیح آبادی بھی شریک ہوتے تھے۔ یہیں سے وہ جگر مراد آبادی کے قریب ہو گئے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے آبائی پیشہ طبابت اختیار کیا۔ آپ کے والد محترم حکیم محمود الحق میرٹھ کے ممتاز طبیب تھے اور دادا حکیم فخرالدین احمد کا شمار ہندوستان کے ممتاز اطباء میں کیا جاتا تھا۔ حکیم فخرالدین احمد کے والد حکیم محمد فصیح الدین رنج میرٹھی غالب کے تلامذہ میں شامل تھے۔ انہوں نے اردو شاعرات کا اولین تذکرہ "بہارستان ناز" ۱۸۶۴ء میں لکھا۔ یہ تذکرہ کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ رنج میرٹھی کا نعتیہ مجموعہ "گلشنِ نعت" مطبوعہ ۱۸۶۰ء بھی یادگار ہے۔ ان کا کلیات بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔

حکیم سیف الدین احمد صاحب کے خاندان میں طبابت کا پیشہ سب سے پہلے حکیم محمد فصیح الدین رنج میرٹھی کے دادا حکیم محمد شمس الدین نے اختیار کیا تھا جو بعد میں حکیم قمرالدین، حکیم فصیح الدین، حکیم

فخرالدین، حکیم محمود الحق، حکیم سیف الدین احمد اور اب حکیم سراج الدین احمد ابنِ حکیم سیف صاحب
جاری و ساری ہے۔

حکیم سیف الدین احمد صاحب کی علم و ادب کے لئے یادگار خدمات، ہمہ جہت قومی یکجہتی کی کوششوں



اور علمِ طب سے گہری وابستگی کا اعتراف اندرون و بیرون ملک خطابات و اعزازات کی صورت میں کیا جاتا رہا ہے۔ جگر ایوارڈ، قومی ایکتا ایوارڈ اور رواں سال میں "میرٹھ رتن ایوارڈ" آپ کو پیش کئے جا چکے ہیں۔ اس سے پہلے ۱۹۷۱ء میں بھارت کی مرکزی حکومت نے "پدم شری" کے قومی اعزاز سے نوازا تھا۔ حکیم صاحب پہلے حکیم ہیں جنہیں یہ اعزاز دیا گیا ہے۔ آپ ہندوستانی صدور فخرالدین علی احمد، نیلم سنجیوا ریڈی اور گیانی ذیلی سنگھ کے اعزازی معالج بھی رہ چکے ہیں۔ حکیم سیف الدین احمد صاحب آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلے ایسے طبیب ہیں جنہیں مرکزی وزارتِ صحت و خاندانی بہبود میں طبِ



جشنِ غالب کے موقع پر حکیم سیف الدین احمد
کا شائع ہونے والا مقالہ

یونانی کے اعزازی مشیر کے عہدے پر نامزد کیا گیا ہے۔ اپنی سماجی خدمات کی وجہ سے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک اپنے دادا محمد فخرالدین احمد اور اپنے والد حکیم محمود الحق صاحب کی طرح میرٹھ کے میونسپل کمشنر بھی رہ چکے ہیں۔ لینڈ ڈیولپمنٹ بینک میرٹھ کے علاوہ میونسپل بورڈ میرٹھ کی مالیاتی اور تعلیمی کمیٹیوں کے چیئرمین اور حکومت اترپردیش اور مرکزی حکومت کی دو درجن سے زائد کمیٹیوں کے مشیر رہے ہیں یا رکن۔ آپ ملک کے مختلف حصوں میں طبِ یونانی کے حوالے سے منعقد ہونے والی قومی و بین الاقوامی کانفرنسوں میں صدارت یا شرکت بھی کرتے رہے ہیں۔ متعدد تعلیمی اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔ مولانا

محمد اسٹیل میرٹھی کے قائم کردہ اسمٰعیل گرلز انٹر کالج کے منیجر بھی ایک عرصے رہے ہیں۔ ان تمام خدمات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم سیف الدین احمد صاحب نے خود کو قوم و ملک کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

حکیم صاحب کو مولانا ندرت میرٹھی، جگر مراد آبادی اور تسکین قریشی سے گہری محبت و عقیدت رہی۔ مولانا ندرت میرٹھی ایک زمانے تک انھیں کے مکان میں قیام پذیر رہے اور تسکین قریشی نے بھی اپنی زندگی کے پچیس سال سے زائد کا شانۂ رنج میں گزارے۔ ۱۹۶۲ء میں تسکین قریشی نے جگر مراد آبادی کے خطوط کا مجموعہ "انتخاب جگر" شائع کیا تو اس میں حکیم صاحب کے نام جگر مراد آبادی کے متعدد خطوط کو بھی شامل کیا۔ حکیم سیف الدین احمد صاحب نے "مرزا غالب اور میرٹھ" کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی شائع کیا ہے جو مرزا غالب کے میرٹھ سے تعلق کو اجاگر کرتا ہے۔ آپ کا دولت کدہ آج بھی میرٹھ کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے جہاں ہر اتوار کو شعری نشست کا اہتمام کیا جاتا ہے جن میں اکثر بیرونی شعراء بھی شرکت کرتے ہیں۔

محترم سیف الدین احمد کی شادی ۱۹۵۱ء میں رنول کے ممتاز رئیس حاجی بدرالدین انور چشتی کی صاحبزادی نگار فاطمہ سے ہوئی۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹوں میں حکیم سراج الدین احمد اور ڈاکٹر معراج الدین احمد ہیں۔ بیٹیوں میں انجم اہلیہ شہاب صدیقی اور تبسم اہلیہ عرفان ہیں۔

آپ کا ذاتی کتب خانہ ہندوستان کے ان کتب خانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے جس میں نادر نسخوں اور قلمی مخطوطات محفوظ ہیں۔ میرٹھ کی علمی اور ادبی تاریخ کے مطالعے کے لئے میرٹھ کی یہ واحد ایسی لائبریری ہے جہاں چار سو سال پرانی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ خود حکیم صاحب کو اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی پر عبور بھی حاصل ہے۔

حکیم سیف الدین احمد صاحب کی متحرک اور فعال شخصیت کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ حکیم صاحب کی پروقار شخصیت میرٹھ کے ادبی اور ثقافتی منظر پر پوری طرح اثر انداز ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو میرٹھ میں کسی دوسری شخصیت کو حاصل نہیں ہے۔

بہ شکریہ ڈاکٹر راحت ابرار

حضرت شاہ پیرؒ

حضرت شاہ پیر رحمتہ اللہ علیہ میرٹھ میں ایک نامور بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کا تعلق سلسلہ شطاریہ سے تھا۔ حضرت شاہ پیر کے تایا حضرت شمس الدین میرٹھی جن کی درگاہ اندرون شاہ پیر دروازہ میرٹھ میں واقع ہے ایک معروف بزرگ تھے۔ حضرت شاہ پیران کے خلیفہ اول تھے۔ آپ کے دادا حضرت شاہ الہ بخش گنج بخش تھے جن کا مزار مبارک گڑھ مکتیشر ضلع میرٹھ میں ہے۔

شہنشاہ جہانگیر اور ان کی مشہور زمانہ بیگم نور جہاں کو حضرت شاہ پیر سے بڑی عقیدت تھی۔ انہوں نے ہی حضرت شاہ پیر کے مزار کی ایسی نازک، خوبصورت اور حسین عمارت سرخ پتھروں سے سنگِ مرمر کے بیل بوٹوں کے ساتھ تعمیر کرائی ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ مقبرہ فنِ تعمیر کا ایک یادگار شاہکار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی نظیر دہلی و آگرہ کو چھوڑ کر کم از کم شمالی ہند میں نہیں ہے۔

شہنشاہ جہانگیر نے اپنی مشہور زمانہ تزک میں دو مرتبہ حضرت شاہ پیر کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے حضرت شاہ پیر کی تعمیر کردہ مسجد کے لئے ایک مرتبہ چار ہزار روپے اور دوسری مرتبہ ایک ہزار روپے پیش کئے تھے۔ یہ مسجد فنِ تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہے جو اس وقت حضرت کے نام نامی سے منسوب ہے۔

حضرت شاہ پیر کا وصال ۹ رمضان المبارک ۱۰۴۲ھ مطابق ۱۶۳۳ء میں ہوا۔ اس وقت شاہجہاں کا دورِ سلطنت تھا۔ آپ کا مزارِ مبارک زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ سید حبیب الرحمٰن شاہ نے تحریر کیا ہے کہ اب یہ محکمہ آثارِ قدیمہ کی زیرِ نگرانی ہے۔ مگر اپنی زبوں حالی اور اطراف کے منظر نے عمارت کے حسن و جمال کو دیمک لگا رکھی ہے۔

شیخ مدار بخش نے میرٹھ میں مستقل سکونت اختیار کرتے ہی ۱۸۰۷ء میں اس مزار کے جوار میں ایک قطعہ زمین حاصل کر کے اس کا احاطہ بنوالیا تھا۔ یہیں شیخ صاحب کی تدفین ہوئی اور بعد ازاں ان کی اولادوں کو بھی اس احاطہ میں آرام گاہ حاصل ہوئی۔ شیخ صاحب میرٹھ کی مشہور بھیاجی فیملی کے بزرگ تھے۔

حیاتِ بشیر، ص ۱۳

شوکت، ڈاکٹر سید شوکت علی سبزواری

آپ کے جد اعلیٰ مغلیہ عہد میں ایران کے شہر سبزوار سے نقل مکان کر کے ہندوستان آئے تھے اور یہاں ضلع بلند شہر کے قریب ایک پرانی بستی مرزا پور میں بس گئے تھے۔ (یہ ضلع مرزا پور سے مختلف مقام ہے) ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کے دوران اس علاقے کا امن تہس نہس ہو گیا تو سید شوکت علی سبزواری صاحب کے دادا سید نیاز علی نے اپنے بھائی سید افضال علی کے ساتھ اس علاقہ کو خیرباد کہا اور میرٹھ میں رہائش اختیار کر لی۔

شوکت صاحب کے والد سید اسد علی کی مالی حالت کمزور تھی اور وہ کسی وکیل کے ہاں محرر تھے۔ اسی لئے عوام میں "منشی اسد علی" کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی اولاد میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں جن کے نام بہ ترتیب تاریخ ولادت سید حشمت علی، عزیز فاطمہ، سید یوسف علی، اسلام فاطمہ، سید شوکت علی، بلقیس فاطمہ، کلثوم فاطمہ اور صالحہ خاتون تھے۔ مالک رام نے تذکرہ معاصرین میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے تاریخ ولادت ۱۹۰۸ء لکھی ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرٹھ میں ۱۹۰۵ء / ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید اسد علی نے ۱۹۵۳ء میں میرٹھ میں رحلت کی۔

سید اسد علی نے بڑے بیٹے حشمت علی کو اے وی ہائی اسکول میرٹھ صدر میں اور دوسرے بیٹے یوسف علی کو گورنمنٹ ہائی اسکول، میرٹھ شہر میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کیا۔ بدقسمتی ہی کہی جا سکتی ہے کہ حشمت علی کا تعلیمی دور مایوس کن رہا اور اسی دوران عین عالم شباب میں رحلت کر گئے۔ باپ کو اپنے جوان العمر بیٹے کی جدائی کا بہت صدمہ ہوا اور وہ اس وہم کا شکار ہو گئے کہ یہ مجھے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے کی سزا ملی ہے۔ انہوں نے یہ سوچتے ہوئے اپنے منجھلے بیٹے یوسف علی کو اسکول سے اٹھوالیا۔۔ اس کا اثر شوکت علی صاحب پر بھی ہوا۔ خاصی عمر تک پڑھنے سے محروم رہے۔ ایک استانی کے سپرد کئے گئے کہ قرآن پاک پڑھ لیں۔ سبزواری صاحب کو اردو پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ آپ نے اصرار کر کے اپنی استانی کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ بہشتی زیور پڑھا دیں گی لیکن انہوں نے اس سے انکار کیا کہ وہ لکھنے میں مدد کریں گی۔ اس طرح بہشتی زیور پڑھا اور خود ہی حرف شناسی کے بعد لکھنا سیکھ لیا۔ بعد میں ایک مولوی صاحب کے مشورے پر مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ صدر میں عربی، فارسی کی تحصیل کے لئے بھیج دیئے گئے۔ اس زمانے میں مدرسہ کے صدر مدرس مولانا عبدالمومن تھے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے سالے تھے۔ حدیث وفقہ میں ان کی دور دور شہرت تھی۔ دوسرے اساتذہ میں مولانا اختر شاہ عربی اور فارسی میں ممتاز تھے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

شوکت سبزواری صاحب نے ان سب استادوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ آپ کا فارسی اور عربی کا ذوق بہت حد تک مولانا اختر شاہ کی صحبت کا رہین منت تھا۔ مدرسہ امداد الاسلام سے آپ نے

۱۹۲۲ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۲۷ء میں منشی فاضل کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کئے۔ منشی فاضل کے امتحان میں اس سال کے جملہ طلبہ میں اول آئے تھے۔ اسی دوران خاموشی کے ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے اور ۱۹۲۶ میں انگریزی کے دسویں درجہ کی سند بھی امتیازی نمبروں سے حاصل کی۔ منشی فاضل کا امتحان پاس کرلینے کے بعد ۱۹۳۰ء میں مدرسہ عالیہ میرٹھ میں فارسی اور اردو کے مدرس ہوگئے یہاں ۱۹۴۱ء تک رہے۔ اس دوران آپ نے پرائیویٹ طور پر انٹر سے لے کر ایم اے فارسی تک کے امتحان پاس کئے۔ آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۷ء میں ایم اے (فارسی) کے تمام طلبہ میں اول آئے۔ اس کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۹ء میں ایم اے (عربی) کیا اور اسی دوران میرٹھ کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۳۶ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) بھی کرلیا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک کے عرصہ میں اسلامیہ انٹر کالج بریلی کے شعبہ فارسی و اردو سے وابستہ رہے اور پھر میرٹھ کالج کے اسی شعبہ سے متعلق رہے۔ یہاں ۱۹۵۰ء تک خدمات انجام دیں۔

وجاہت حسین عندلیب شادانی ان دنوں مقبول شعراء میں شامل تھے۔ شوکت سبزواری صاحب سے ان کی اس زمانے میں ملاقات ہوئی تھی جب شوکت صاحب اسلامیہ کالج بریلی میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ عندلیب شادانی نے ۱۹۵۰ء میں آپ کو ڈھاکہ آنے کی دعوت دی۔ آپ کا ہجرت کا ارادہ نہیں تھا لیکن بھارت میں اس وقت اردو کے بارے میں سرکاری وغیر سرکاری رویہ ہمدردانہ نہیں تھا اسی لئے اس پیش کش کو قبول کرکے ڈھاکہ پہنچے۔ وہاں صدر شعبہ اردو مقرر ہوگئے۔ ڈھاکہ سے ہی آپ نے اردو لسانیات میں ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے بھارت میں ہی سنسکرت اور ہندی زبانوں پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں مختلف اصحاب شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸ء - ۱۹۸۲ء) پیر حسام الدین راشدی (۱۹۱۱-۱۹۸۲ء) اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی وغیرہ کی تحریک پر حکومت پاکستان نے اردو کا ایک مکمل تاریخی لغت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا اس کے سامنے آکسفورڈ ڈکشنری کا نمونہ تھا۔ اس لئے حکومت نے کراچی میں اردو بورڈ تشکیل دیا اور اردو لغت کی ترتیب وتدوین کا کام اس کے سپرد کردیا۔ شوکت سبزواری صاحب اس بورڈ سے بطور ماہر وابستہ ہوگئے۔ شعبہ لغت کے مدیر اعلیٰ مولوی عبدالحق (۱۸۷۰-۱۹۶۱ء) بنائے گئے ان کی مدد کے لئے تین مدیر مقرر ہوئے یعنی سید ہاشمی فرید آبادی' ڈاکٹر شہیداللہ (۱۸۸۵-۹۶۹) اور ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ انہی ذمہ داریوں کی وجہ سے ڈھاکہ یونیورسٹی سے مستعفی ہوکر مستقلاً" کراچی میں رہائش اختیار کرلی۔ ۱۹۶۱ء میں اس لغت کی ترتیب و تدوین کی ساری ذمہ داری شوکت سبزواری صاحب کے کاندھوں پر آگئی کیونکہ سید ہاشمی لاہور منتقل ہوگئے اور مولوی عبدالحق کا انتقال ہوگیا تھا۔ آپ آخر تک مدیر اعلیٰ کے عہدے پر متمکن رہے۔ اس وقت بھی بورڈ میں ممتاز شخصیات موجود تھیں مگر بقول مالک رام "لیکن واقع یہ ہے کہ اشتقاق اور تخریج کا کام شوکت سبزواری کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں تھی الفاظ کی

تحقیق میں وہ ایسی بندی کی چندی نکالتے تھے کہ ان کے سب ہمکار ان کا لوہا مانتے تھے"۔ آپ کی وفات سے قبل اس لغت کی آٹھ جلدیں مکمل ہو چکی تھیں مگر کوئی ایک بھی آپ کی زندگی میں منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ مرحوم کا یہ کارنامہ تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مولانا ماہر القادری (۱۹۰۶ء-۱۹۷۸ء) نے "فاران" کراچی میں تعزیتی نوٹ میں تحریر کیا ہے "میں کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ بعض الفاظ کی تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تشریح و توضیح سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ لفظ کہاں سے نکلا ہے؟ اس کے مصدر اور ROOT پر ان کی نگاہ رہتی تھی اور اصل مادہ و مصدر کی روشنی میں وہ الفاظ کا کھوج لگاتے تھے۔ خاص طور پر اکرت، اپ بھرنش اور بھاشا میں بڑا درک رکھتے تھے اور اس فن میں تمام اردو اداروں میں کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔" مولانا نے ڈاکٹر سبزواری کے نظریات اور شخصیت کے بارے میں لکھا ہے۔ "مذہب میں ان کا رجحان تجدد کی جانب تھا، خاندانی منصوبہ بندی اور سوشلزم کی تائید میں انہوں نے مضامین بھی لکھے مگر دوسرے آزاد خیالوں کی طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم کو مذہب سے ..... کد ..... نہ تھی، دینی روایات کا احترام کرتے تھے اور دین و اخلاق کے بارے میں کوئی ناگوار لفظ ان کی زبان سے نہیں سنا گیا۔ علماء دیوبند سے خاصے متاثر تھے۔ اخراجات کے معاملے میں محتاط بلکہ جز رس تھے۔ سادہ رہن سہن، معمولی لباس و غذا ------ پاکستان کے بلند پایہ دانشوروں اور محققین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وسیع المطالعہ ادیب اور انشا پرداز تھے"۔ مرحوم اکثر جمعہ کی نماز دارالعلوم کورنگی میں آکر ادا کرتے تھے

میں نے فروری ۱۹۶۰ء "بحر" کی تقطیع کے الفاظ کی ترتیب سے شروع کی تھی
جو برسوں مکمل ہوگئی۔ شروع شروع میں اکثر الفاظ اصل الفاظ کا
اشتقاق بھی لکھ کرتا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اشتقاق لکھنے میں
وقت صرف ہو جاتا ہے اور لفظوں کی مقررہ تعداد پوری نہیں ہوتی
تو اشتقاق لکھنا ترک کر دیا۔ اب میں ان الفاظ کا اشتقاق
لکھ رہا ہوں۔ الحمد للہ تحریر کر رہا ہوں۔

شوکت سبزواری
۲۱ مئی ۱۹۶۶ء

عکس تحریر: ڈاکٹر شوکت سبزواری

جہاں مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیعؒ موجود ہوتے تھے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری اور شعرگوئی سے کیا۔ ہمایوں تخلص پسند کیا۔ اس زمانے کے ادبی رسائل میں کلام چھپتا بھی تھا۔ بعض عربی مضامین اور افسانوں کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔ آپ کی پہلی سنجیدہ تصنیف "فلسفہ کلام غالب" شائع ہوئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ کا مطالعہ کتنا وسیع ہے اور نکتہ آفرینی کا کیسا ملکہ حاصل ہے۔ "اردو زبان کا ارتقاء" ۱۹۵۶ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوئی۔ یہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے۔ لسانیات سے متعلق تین کتابیں "داستانِ زبانِ اردو"۔ "لسانی مسائل" اور اردو لسانیات بھی شائع ہوئیں۔ آخر الذکر کتاب پر ۱۹۶۶ء میں "داؤد ادبی انعام" دیا گیا۔ ایک اور کتاب "غالب فکر و فن" مضامین کا مجموعہ ہے۔ تنقیدی مضامین جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے تھے انہیں دو جلدوں "معیار ادب" اور "نئی پرانی قدریں" میں یکجا کردیا گیا ہے۔ اب بھی بہت سے مضامین منتشر حالت میں ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب کا انتقال ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء کو صبح کے وقت کراچی میں ہوا۔ تدفین اسی شام قبرستان الطاف نگر میں ہوئی۔ آپ کی شادی ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر سید مبارک علی کی بڑی صاحبزادی ہاجرہ بیگم سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی رشتے میں ان کے ماموں ہوتے تھے۔ ہاجرہ بیگم کے بطن سے دو بیٹیاں حمیدہ اور ریحانہ اور تین بیٹے عارف اختر' راشد اظہر اور طارق انور ہیں۔ آپ نے اپنی ڈھاکہ ملازمت کے زمانے میں اپنی بیگم کو طلاق دیدی تھی اور اس کے بعد انہیں کی چھوٹی بہن سلطان بیگم سے نکاح کرلیا تھا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے زبان و ادب کی گرانقدر ہمہ گیر خدمات انجام دیں۔ تاریخ میں آپ کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا اور لسانیات میں آپ کے نام کے بغیر کوئی تاریخ مکمل نہ ہوسکے گی۔

سیٹھ شیتل پرشاد جین

سیٹھ شیتل پرشاد جین کے جد سیٹھ رادھا کرشن جی نے تقریباً ۲۰۰ سال پہلے اورنگ آباد کے نامساعد حالات سے سخت پریشان ہو کر ترک سکونت کی اور بہاولپور میں رہائش اختیار کرتے ہوئے مقیم ہوئے۔ جلد ہی شہر کے معززین و معتبر شہریوں کی صف میں انھیں ایک نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ ان کے بڑے بیٹے رام سہائے مل کی پیدائش بہاولپور میں ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ انھیں کے نام سے رادھا کرشن نے اپنی رہائش گاہ کا نام "رام سہائے محل" رکھا، جو عوام میں "سیٹھوں کے محل" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ وہی محل ہے جہاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانے میں ایک ہزار سے زائد افراد نے پناہ لی تھی۔ رام سہائے مل زیادہ عرصہ وہاں نہیں رہے اور میرٹھ چلے آئے۔ یہاں انھوں نے صدر کے علاقے میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت میرٹھ کا یہ علاقہ کم آبادی تھا۔ اب اس خاندان کی ساتویں نسل یہاں آباد ہے۔

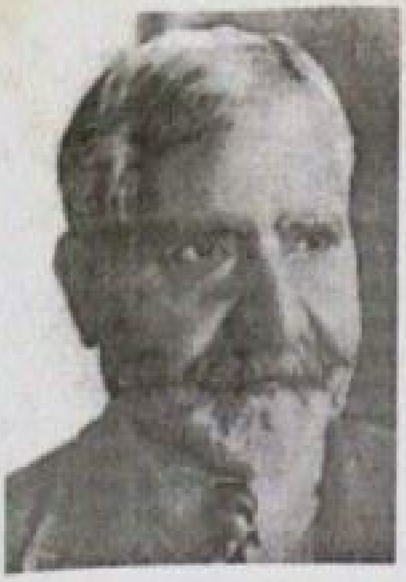
سیٹھ شیتل پرشاد ابن سیٹھ نیک چند ابن سیٹھ [illegible] ابن سیٹھ [illegible] سہائے ابن سیٹھ رام سہائے مل ابن سیٹھ رادھا کرشن اپنی خاندانی روایات، اخلاق اور تہذیب کے امین رہے۔ وہ اپنے والد نیک چند جی کے صحیح جانشین تھے۔ نوجوانی میں انھوں نے اپنی والدہ [illegible] سے مدد کر لی تھی۔ مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ ایک دور اندیش شخص تھے اور وقت کے تقاضوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ملکی و غیر ملکی معاملات میں سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے پہلا سفر [illegible] کے ہمراہ کیا۔ ملک کے مختلف علاقوں کے علاوہ افغانستان کا بھی دورہ کیا۔ وہ صرف کاروباری شخص ہی نہ تھے بلکہ مختلف ممالک کے حالات، تاریخ اور تہذیب و تمدن سے بھی واقف تھے۔ وہ میرٹھ اور کلکتہ میں قائم مختلف سماجی اور مذہبی تنظیموں سے وابستہ رہے اور مختلف عہدوں پر [illegible] بھی رہے۔ تعلیم کے فروغ میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے مالی اشتراک سے کئی اداروں نے استحکام حاصل کیا۔ فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا جس کو میرٹھ میں اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ فلم بینی بھی مشاغل میں شامل تھی۔

سیٹھ شیتل پرشاد کی اہلیہ شریمتی کرشنا دیوی نے اپنے شوہر کی مصروفیات میں بہترین معاونت کی۔ وہ ایک باشعور خاتون تھیں۔ سیٹھ شیتل پرشاد کے سات بیٹے سلطان چند، ملتان چند، دھن پال، شری پال، کمل [illegible] چند، [illegible] چند اور [illegible] چند کے علاوہ دو بیٹیاں ہیں۔ ان کے ساتوں بیٹے اعلیٰ تعلیم سے آراستہ اور [illegible] شرافت کا نمونہ ہیں۔

۱۹۶۰ء میں سیٹھ شیتل پرشاد جین اپنے والد کے ساتھ کلکتہ میں کاروباری سلسلے میں مصروف تھے اس وقت سیٹھ شیتل پرشاد کے بڑے بیٹے سلطان چند نے میرٹھ میں کاروبار سنبھالا اور اپنی تعلیم مکمل کرتے ہوئے ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۶۸ء میں [illegible] کمپنی میں پہلے جنرل منیجر مقرر ہوئے۔ ان کے بھائی دھن پال

بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے کمپنی سے منسلک ہوئے۔ ان بھائیوں نے ذہانت و صلاحیت سے اپنے خاندانی وقار اور کاروبار میں اضافہ کیا۔ یہ معزز و ممتاز خاندان "سارو گھرانہ" کے نام سے معروف ہے۔

میرا شترمانس



ڈاکٹر سر ضیاء الدین

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ان اکابرینِ ملت میں شامل ہیں جن کے ذکر کے بغیر برصغیر کی علمی تاریخ مکمل نہیں ہوگی۔ وہ ۱۳ فروری ۱۸۷۳ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ معین الدین نے محکمۂ مال میں ایک معمولی آسامی پر ملازمت کا آغاز کیا تھا مگر اپنی خداداد صلاحیت کی بناء پر تحصیلداری کے عہدے تک ترقی کی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی ابتدائی تعلیم والد کی سرپرستی میں میرٹھ کے ایک مدرسہ میں ہوئی۔ پہلے کلام مجید ختم کیا' اس کے بعد فارسی' اردو' انگریزی اور حساب کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ میں داخل کیے گئے۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۸۹ء میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے متعلقہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان چوتھی پوزیشن کے ساتھ درجہ اول میں پاس کیا۔ ایم۔ سی کالج الہ آباد میں سائنس کی تعلیم کے لئے پہنچے' جس کے بانی مولانا سمیع اللہ خان تھے۔ ایف' اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج میں بی۔ اے آنرز کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے اور ریاضی کو بطور اختیاری مضمون لیا۔ ۱۸۹۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کے امتحان میں اول درجہ میں کامیاب ہوئے۔ یونیورسٹی میں تیسرا اور سائنس کے طلباء میں اول نمبر ہونے کی وجہ سے ایم۔ اے۔ او کالج کی طرف سے اسٹریچی میڈل دیا گیا۔ نامزدگی کے باوجود ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ قبول کرنے کی بجائے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کو سرسید تحریک سے گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے تعلیمی میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ منطق کا مضمون بھی پڑھایا۔ ۱۸۹۷ء میں سول انجینئرنگ کلاس کا دوبارہ اجراء کیا۔ درس و تدریس اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت جاری رکھتے ہوئے اپنا تعلیمی سلسلہ بھی قائم رکھا۔ ۱۸۹۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی اور ۱۸۹۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم۔ اے کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا۔ ۱۹۰۱ء میں ڈی۔ ایس۔ سی کا امتحان دیا اور اس میں بھی اول درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب پہلے مسلمان تھے جن کے حصہ میں یہ امتیازی و غیر معمولی کامیابی حصہ میں آئی۔ ۱۹۰۱ء میں ٹرنٹی کالج' کیمرج میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں آنرز کی ڈگری

حاصل کی۔ اس امتحان کے بعد ہی وہ لندن کی انجمن ریاضی (MATHEMATICAL SOICIETY OF LONDON) کے ممبر بنائے گئے۔ بعد ازاں رائل اسٹرونومیکل سوسائٹی (ROYAL ASTRONOMICAL SOCIETY) کے فیلو منتخب کیے گئے۔ ۱۹۰۴ء میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے سر آئزک نیوٹن اسٹوڈینٹ شپ حاصل کی۔ وہ اولین ہندوستانی تھے جنہیں یہ اعلیٰ قدر و منزلت کا وظیفہ عطا کیا گیا۔ انہوں نے گوٹنجن یونیورسٹی (GOTTINGEN UNIVERSITY) جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں پیرس گئے اور وہاں ایک میقات تعلیم حاصل کی جس کے بعد کچھ عرصہ اٹلی کی بولوگنا یونیورسٹی (BOLOGNA UNIVERSITY) میں جیامیٹری کی تعلیم حاصل کی۔ یورپ میں دورانِ قیام انہوں نے فرانسیسی، جرمنی، عربی اور اطالوی زبانیں سیکھیں۔ اس دوران یورپ میں ہر اعلیٰ ملازمت کی پیشکش رد کرتے ہوئے مصر گئے اور چند ہفتے جامعہ ازہر میں قیام کیا۔ علم ہیئت کے استاد کے درس میں شریک ہوئے اور ۱۱ دسمبر ۱۹۰۶ء کو علی گڑھ واپس پہنچے جہاں ان کا یادگار استقبال کیا گیا۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے لندن میں ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم کی۔ سر سید ورکس کمیٹی کا قیام بھی انہیں کا مرہونِ منت ہے۔ ۱۹۱۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے سیڈر کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پہلے پرووائس چانسلر مقرر ہوئے۔ نا مساعد حالات میں یونیورسٹی کی خدمت کرتے رہے اور جب یونیورسٹی کی اندرونی سیاست کی وجہ سے کام کرنا ممکن نہیں رہا تو انہوں نے ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء کو ایک مختصر خط کے ذریعے مطلع کیا کہ چھ ماہ بھی کی منظور کی جائے اور اکتوبر سے ان کو فارغ کردیا جائے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور پھر بعد میں انہوں نے ۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء کو استعفیٰ دے دیا اور ۲۶ مئی کو یورپ روانہ ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں یونیورسٹی کورٹ نے ان کا انتخاب بحیثیت وائس چانسلر کیا۔ سہ سالہ مدت پوری ہونے کے بعد سر شاہ سلیمان (۱۸۸۶ء۔ ۱۹۴۱ء) ان کے جانشین منتخب ہوئے۔ ان کی غیر متوقع وفات کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین احمد دوبارہ وائس چانسلر ہوئے اور پھر اپریل ۱۹۴۴ء میں تیسری مرتبہ بلا مقابلہ ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب ۲۰ اپریل ۱۹۴۷ء کو دیرینہ خدمات کے حوالے سے ڈیکٹر کے اعزاز سے نوازے گئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ۱۹۱۹ء میں صوبائی مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں ان کا دوبارہ انتخاب عمل میں آیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ بلا مقابلہ مرکزی قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ رکنیت کی ابتداء آزاد ممبر کی حیثیت سے ہوئی تھی مگر بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ اسمبلی کے سیکریٹری مقرر ہوئے اور اس حیثیت میں سات آٹھ سال کام کرتے رہے۔ پاکستان کے زبردست حامی تھے۔ مختلف سرکاری کمیٹیوں کے ممبر کے علاوہ ایسٹ انڈین ریلوے کمپنیز کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے بھی ممبر رہے۔ انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے مفادات اور ان کے مسائل کی طرف توجہ مرکوز رکھی اور تمام عمر مسلمانوں کے حقوق کے لئے ہر آئینی جدوجہد

کی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کو ۱۹۱۸ء میں سی۔ آئی۔ ای اور ۱۹۳۸ء میں نائٹ ہڈ کا خطاب ملا۔ یہ خطابات انہوں نے مسلم لیگ کے ۱۹۴۶ء کے فیصلے کے مطابق بلا تامل واپس کر دیئے۔ ۱۹۴۷ء میں پھر یورپ کا سفر کیا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں جب کہ وہ ہوائی جہاز سے پیرس سے لندن آرہے تھے۔ اچانک فالج کا حملہ ہوا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اس جوہر قابل نے ۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ میت کو ہندوستان لایا گیا اور ۴ جنوری ۱۹۴۸ء کو سرسیدؒ کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔ برصغیر کے ممتاز دانشوروں نے ان کی وفات کو ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔ سچ ہے کہ وہ فنا فی العلی گڑھ تھے اور یہ میرٹھ کے لئے بھی ایک بڑا اعزاز ہے۔

ماخذ : فکر و نظر، نامورانِ علی گڑھ، حصہ دوم۔ ص ۱۳۹۔ ۱۳۶۳

ظ۔انصاری



ظ۔انصاری

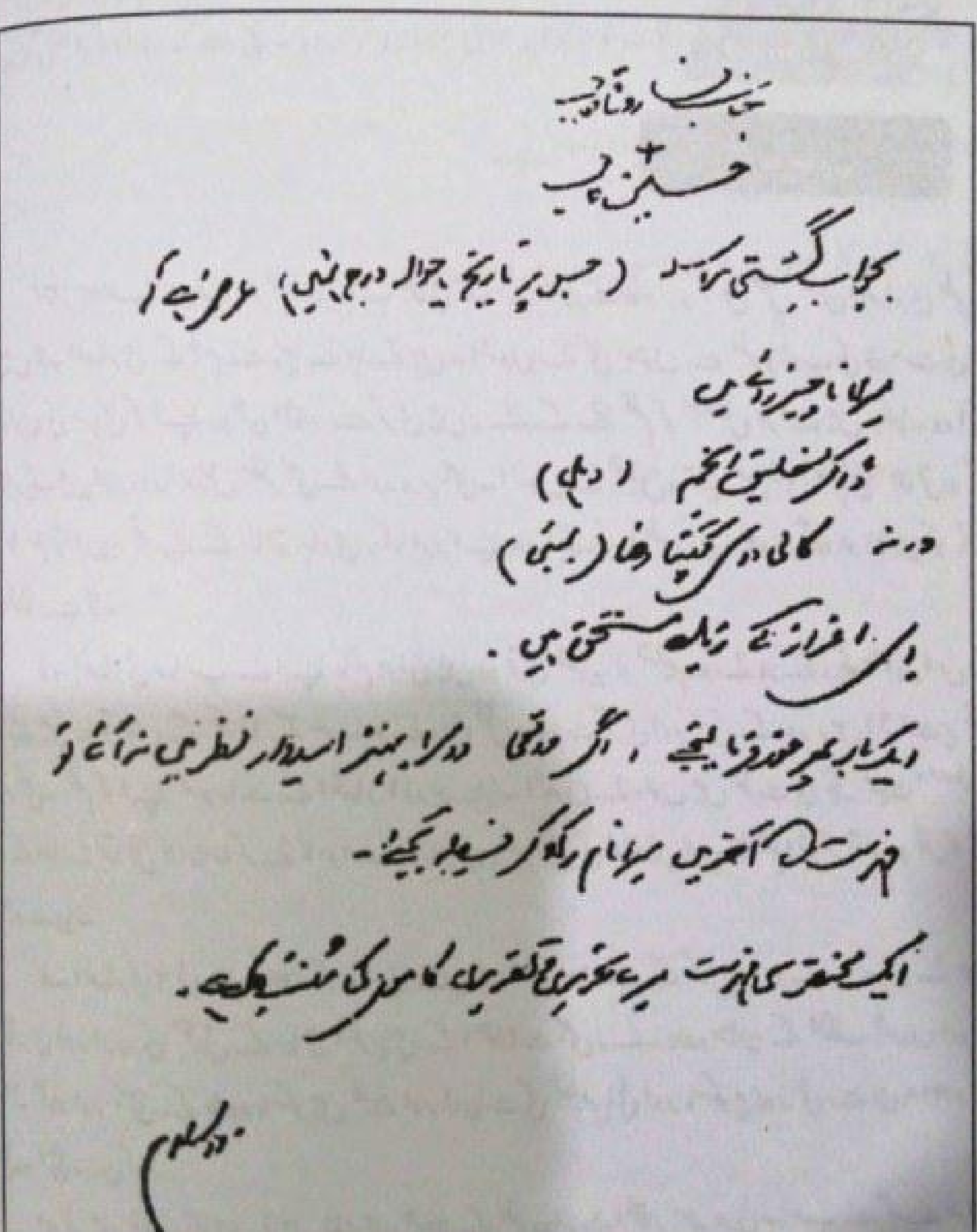
ممتاز مصنف، معروف مترجم، بے باک صحافی، صاحبِ بصیرت نقاد اور فلسفی ظلِ حسن انصاری علمی دنیا میں ظ۔ انصاری کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے کئی جہتوں سے علم و ادب کی خدمت کی اور دلوں کی سردی کو اپنے روشن افکار سے گرمی میں بدلنے کے لئے قلم کو مستقل حرکت میں رکھا۔ وہ ایک باریک بیں اور دور اندیش مفکر بھی تھے اور مدیر بھی۔ انہوں نے تحقیق و تنقید میں بھی کام کیا، تلاش و جستجو کا سفر توازن و تجزیے کے ساتھ جاری رکھا اور اپنے بعد ایک ایسا علمی ذخیرہ چھوڑ گئے جو ذہنوں کو تازگی بخشتا رہے گا۔

ظ۔ انصاری صاحب نے اپنے عالمِ جوانی میں دو قومی نظریہ کو تسلیم ہوتے ہوئے دیکھا، اور اس کے نتیجے میں دو قوموں کے ٹکراؤ کے سبب ہونے والی قتل و غارت گری اور اس کے دور رس اثرات پر نظر رکھی۔ قلم کو اپنے محسوسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے دلوں میں نفرت کی جگہ محبت، مصلحت کے بجائے حقائق کا سامنا کرنے کا حوصلہ اور مایوسی و غیر یقینی کی فضا میں امید کا علم اٹھا کر شعور و فکر کا عملی ثبوت دیا۔

ظ۔ انصاری ۶ فروری ۱۹۲۵ء کو سہارنپور میں محمد حسن صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو کی تکمیل کے ساتھ انگریزی کے امتحانات بھی دیے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میرٹھ، الٰہ آباد اور بمبئی کے علاوہ ماسکو میں فلسفے اور ادبیات کی تعلیم پائی اور ماسکو یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں پی۔ایچ۔ڈی کیا۔

میرٹھ میں قیام کے زمانے میں خاندانِ شیفتہ کے علمی وارث افتخار احمد عدنی صاحب سے گہرے مراسم رہے۔ عدنی صاحب نے ان سے استفادہ بھی کیا۔ انہوں نے اپنی تصنیف "اک محشرِ خیال" مطبوعہ ۱۹۸۷ء کا انتساب ظ۔ انصاری کے نام کیا ہے۔ افتخار احمد عدنی صاحب نے اپنی ایک اور اہم کتاب "غالب شناسی کے کرشمے" مطبوعہ ۱۹۹۵ء میں "پس نوشت:" کے عنوان سے تحریر کیا ہے: "تقریباً بیس سال

گزرنے کے بعد جب نیپال کی ایک تقریب کے اختتام پر ظ۔ انصاری مجھ سے آ کے ملے تو ملاقات میکا دخضر والے مصرعے کا مفہوم میری سمجھ میں آیا۔ کئی دن تو اس طویل جدائی کے حالات کا جائزہ لینے میں صرف ہوئے۔ ہم دونوں نے کچھ منصوبے بنائے۔ میں نے یہ ذمہ داری لی کہ روسی ادب کے جو شاہکار انہوں نے ترجمہ کئے ہیں اور جن کو وہ ترجمہ کرنا چاہتے ہیں' ان سب کی اشاعت کا میں یہاں بندوبست کروں گا اور وہ ہندوستان واپسی پر تصوف کی روایت اور شاعری پر اور بابا ذہین شاہ تاجی صاحب کے کلام میں اس


جناب روشن صاحب
تسلیم
بجواب گشتی مراسلہ (جس پر تاریخ درج نہیں) عرض ہے کہ
میرا نام غیر ضروری ہے
ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی)
وشو ناتھ گلی دھر گھتیا وطا (بمبئی)
یہ اعزاز کے زیادہ مستحق ہیں۔
ایک بار پھر غور فرما لیجیے، اگر مدعا دوسرا بہتر امیدوار نظر میں نہ آئے تو
فہرست کے آخر میں میرا نام رکھ کر فیصلہ کیجیے۔
ایک مختصر سی فہرست میرے تحریری و تقریری کاموں کی منسلک ہے۔
مخلص

عکس تحریر: ظ-انصاری

روایت کی ندرت پر کچھ مضامین لکھیں گے۔ اس سلسلے میں وہ بابا صاحب کی سب کتابیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ خانقاہِ تاجیہ میں سماع کی محفلوں میں شرکت کا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے خسرو کی زندگی کا مطالعہ موسیقی کے حوالے سے شروع کیا اور صرف ایک ڈیڑھ سال میں اس کام کو اس طرح مکمل کیا کہ اپنے تبصرے کے ساتھ قول سے لے کر ہندی اور فارسی کی تمام مشہور چیزوں پر مشتمل خسرو کے کلام کو مختلف قوالوں کی آواز میں صدا بندی سے محفوظ کر دیا۔ قبل اس کے کہ ہمارے منصوبوں کی تکمیل کے سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوتی' ان کے انتقال کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا"۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے ۳۸ علمی اور ادبی کتابوں کے ترجمے کئے یا ترجموں کو ایڈٹ کیا۔ انہوں نے حضرت امیر خسرو کے زمانے اور کارناموں پر انگریزی اور اردو میں ایک ایک کتاب ترتیب دی۔ غالب پر بھی انصاری صاحب نے وقیع کام کیا ہے۔ غالب سے متعلق ان کی کتاب "غالب شناسی" دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ان کی تصنیف "اقبال کی تلاش" کو اقبالیات میں ایک علمی اضافہ تسلیم کیا گیا ہے۔ حضرت امیر خسرو پر ظ۔ انصاری صاحب کے کام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ امیر خسرو پر ڈھائی گھنٹے کے دو کیسٹ ان کا بڑا کارنامہ ہے' جس میں پانچ ملکوں کی موسیقی اور اساتذہ کی آواز میں کلامِ خسرو اور حیاتِ خسرو کو اس کے تاریخی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی ایک کتاب "خسرو کا ذہنی سفر" انجمن ترقی اردو



شاہد ندیم کی مرتبہ کتاب انتخابِ مضامین
ظ۔ انصاری

ہند نے پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شائع کی تھی۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر انجمن نے دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں دہلی سے شائع کیا ہے۔ اپنی اس کاوش پر گفتگو کرتے ہوئے ظ۔ انصاری صاحب نے تحریر کیا ہے" دراصل یہ ایک پورا مقالہ ہے۔ یہاں امیر خسرو کی زندگی اور ان کے کلام پر کم سے کم لفظوں میں کہیں دھیمی اور کہیں اتنی تیز روشنی ڈالی گئی ہے جس میں خسرو کے قدو قامت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے گا۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے "دیباچہ" میں تحریر کرتے ہیں "یوں دیکھئے تو امیر خسرو کے جسمانی اور ذہنی سفر کی داستان' ان کے ہاں رد و قبول کا عمل' اختیار اور ان کا مطالعہ ہمارے لئے اور بھی بامعنی ہو جاتا ہے' ان کی تحریریں شعری و نثری ادبیات کے علاوہ سماجی اتھل پتھل' سیاسی عروج و زوال' تہذیبی آداب و اطوار' گویا تاریخ کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ ہم تک پہنچاتی ہیں اور ہمارے تاریخی شعور پر سان رکھنے کے کام آتی ہیں"۔

محترم ظ۔ انصاری کے تحریر کردہ منتخب اداریوں کا مجموعہ "کانوں کی زبان" ۱۹۸۷ء میں بزم غالب کامٹی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اردو صحافت میں اداریوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو اتنے وسیع دائرے کو رنگا رنگی اور تبدیلی فکر و نظر کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ کتاب میں "ورقے چند" کے عنوان سے شامل اپنی تحریر میں ظ۔ انصاری صاحب نے مدیر کی ذمہ داریوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ " کانوں کی زبان" کے مرتب ڈاکٹر نظیر رشیدی اور محمد حفظ الرحمٰن ہیں۔ ظ۔ انصاری صاحب کے یہ اداریے ثابت کرتے ہیں کہ انہیں سیاسی' معاشی' اقتصادی' تاریخی' لسانی' فکری' علمی اور فنی شعبوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے استدلال اور معقولیت سے ہٹ کر کبھی اپنا نکتہ نظر پیش نہیں کیا۔ ان کتب کے علاوہ ان کی تصانیف میں ورق ورق' جارج برنارڈ شاہ' پشکن' کمیونسٹ اور مذہب' زبان و بیان' چیخوف' دستوئفسکی اور کتاب شناسی شامل ہیں۔

محترم ظ۔ انصاری نے فارسی' انگریزی اور روسی زبانوں کی تخلیقات کے ترجمے کئے۔ انہوں نے ہاؤس آف انسائیکلوپیڈیا' ماسکو سے پچاس ہزار الفاظ کے دو لغات اردو اور فارسی میں شائع کرائے۔ یورپ اور ایشیاء کے ممالک کے سفر کئے۔ روس بھی کئی بار گئے۔ پروگریس اکاڈمی آف سائنسیز روس نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ پیش کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے بھی ۱۹۷۸ء میں غالب ایوارڈ سے نوازا۔

کانوں کی زبان' خسرو کا ذہنی سفر' اک محشر خیال' غالب شناسی کے کرشمے۔

مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ

حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کی دینی، علمی، تدریسی، اصلاحی اور تالیفی خدمات بڑی اہمیت کی حامل ہیں جن سے عوام و خواص دونوں ہی برابر استفادہ کرتے رہتے ہیں لیکن مولانا مرحوم کے حالات سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے "ارشادالملوک" کے مقدمہ کے ساتھ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کے مختصر حالات لکھ کر اس کمی کو پورا کیا ہے۔ آپ نے یہ حالات "الجواہر الزواہر" ترجمہ "البصائر" سے اَخذ فرمائے ہیں اور اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا ہے۔ حضرت مولانا زکریا کے تحریر کردہ حالات "تذکرۃ الخلیل" میں الحاج حافظ فریدالدین احمد الوجیہ خلف خان بہادر الحاج وجیہہ الدین احمد میرٹھی نے اپنے "حرفِ آغاز" میں نقل کئے ہیں۔

مولانا عاشق الٰہی بِن یار الٰہی بن رحم الٰہی بنِ فضل الٰہی کی ولادت ۵ رجب ۱۲۹۸ھ مطابق ۳ جون ۱۸۸۱ء یوم جمعہ کو ہوئی۔ چار سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا اور چھ سال کی عمر میں قرآن پاک ناظرہ اور کچھ کتابیں پڑھ لی تھیں۔ ۱۳۰۵ھ میں عربی شروع کی۔ اس کے بعد انگریزی اسکول میں دو سال تعلیم پائی۔ تیرہ سال کی عمر میں مدرسہ قومی، میرٹھ میں داخل ہوئے اور ابتدا سے میزان وغیرہ پڑھی۔ ۱۳۱۲ھ میں مشکوٰۃ شریف کا آغاز ہوا جبکہ عربی شروع کئے ہوئے صرف دس ماہ ہوئے تھے۔ دو سال میں جملہ کتب صحاح و دینیات ختم ہو گئیں اور حضرت مولانا میر حسن امروہوی نے دستار بندی فرمائی۔ اس وقت مولانا کی عمر سولہ سال کی تھی۔ ۱۳۱۵ھ میں مولوی فاضل کی تعلیم کے لئے لاہور تشریف لے گئے اور وہاں اعلیٰ درجہ میں کامیابی حاصل کی اور اس کے ایک سال بعد گنگوہ میں حضرت قطبِ عالم گنگوہیؒ سے بیعت کی۔ ۱۳۱۷ھ میں ندوۃ العلماء کی طلب پر ندوہ تشریف لے گئے اور دارالعلوم ندوہ کی مدرسی قبول کی مگر چند ماہ بعد یہ تعلق ختم ہو گیا۔ ۱۳۱۸ھ میں "خیرالمطابع" کے نام سے مطبع کھولا اور ساتھ ہی مفید کتابوں کے تراجم میں مشغول ہو گئے، اور سب سے پہلے قرآنِ مجید کا سلیس اردو ترجمہ کیا۔ ۱۳۱۹ھ میں بصورت حمائل شریف اس کی طباعت عمل میں آئی اور اس کے ساتھ ہی اپنی تالیف "الاسلام" طبع کرائی۔ آپ کی کتب میں تذکرۃ الرشید: ۱۳۲۶ھ، رسالہ ارشادالملوک ترجمہ امدادالسلوک: ۱۳۳۳ھ، جمع الفوائد: ۱۳۴۲ھ، تذکرۃ الخلیل اور قصہ حضرت یوسف علیہ السلام مطبوعہ عزیز المطابع، میرٹھ کے علاوہ اور بھی متعدد تصانیف و تراجم مشہور و معروف ہیں۔

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے حضرت گنگوہیؒ کے وصال کے بعد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے رجوع کیا اور حضرت سے خلافت اور اجازت بیعتِ سلوک ملی۔ "تذکرۃ الخلیل" مرشدِ ثانی ہی کی سوانح ہے جبکہ "تذکرۃ الرشید" مرشدِ اول کے حالات پر مشتمل ہے۔ "تذکرۃ الخلیل" میں مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا محمود الحسن، شاہ عبدالرحیم رائے پوری، مولانا صدیق احمد انبیٹھوی اور مولانا محمد یحییٰ

کاندھلوی کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔

۱۳۴۴ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے مستقل قیام کے لئے مدینہ منورہ جانے کا ارادہ فرمایا تو تین حضرات کا مدرسہ مظاہر العلوم کی سرپرستی کے لئے انتخاب فرمایا۔ یہ تین حضرات مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی اور الحاج شیخ رشید احمد میرٹھی تھے۔ یہ تینوں حضرات آخر دم تک مظاہر العلوم، سہارنپور کے سرپرست رہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے مدرسہ کے دفتری امور سے لے کر درس و تدریس تک کے تمام شعبوں کی مسلسل نگرانی فرمائی۔ آپ سال میں کئی کئی بار میرٹھ سے سہارنپور تشریف لے جاتے تھے۔

۱۳۱۵ھ میں مولانا کی پہلی شادی ہوئی تھی۔ جن کے بطن سے تین لڑکے ڈاکٹر محمود الٰہی، مولوی حافظ مسعود الٰہی اور حافظ مقبول الٰہی اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ ۲۲ محرم ۱۳۳۳ھ میں اہلیہ کا انتقال ہوا تو اسی سال ربیع الاول میں دوسرا نکاح ہوا۔

۱۳۲۸ھ میں مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری حج کے لئے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ نے بھی دفعتہ" تیسرے حج کا ارادہ کرلیا۔ اسی سفر میں شام، مصر اور فلسطین بھی گئے۔ مجموعی طور پر آپ نے چھ حج کئے۔ بھرپور عملی زندگی کا کارواں چل رہا تھا کہ علیل ہوگئے اور یکم شعبان



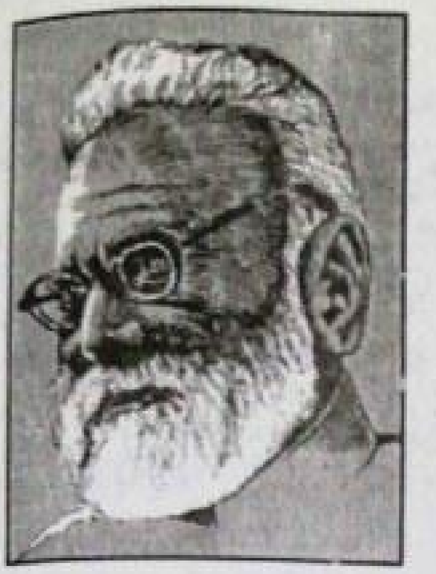
ابو رحمت حسن قادری میرٹھی کی عزیز المطابع میرٹھ سے طبع ہونے والی کتاب کا سرورق

۱۳۶۰ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء دو شنبہ کی صبح چھ بجے وصال فرما گئے۔ چار بجے شام کو میرٹھ میں ہی اپنے مکان کے قریب خاندانی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ مولانا محمد زکریا فرماتے ہیں کہ مولانا عاشق الٰہی "انتہائی ذکی، انتہائی مدبر، ظریف، خوش مزاج تھے لیکن منکرات پر بہت زیادہ غصہ آجاتا تھا جو بسا اوقات حد کمال ہی تک پہنچ جاتا"۔ آپ نے مزید لکھا ہے "حضرت میرٹھی نور اللہ مرقدہ کی تصانیف بھی متعدد ہیں جو عام فہم ہونے کے علاوہ بہت زیادہ دینی حیثیت سے مفید ہیں مگر افسوس کہ وہ سب نایاب ہو گئیں"۔

ماخذ : تذکرۃ الخلیل، بہ شکریہ مولانا عبداللہ مکی۔



سرورق: قصۂ یوسف ☆ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی



مولوی عبدالحق

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۸۷۰ء میں اپنے آبائی وطن ہاپوڑ (ضلع میرٹھ' اترپردیش' بھارت) کے قریب ایک موضع سراوہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ علی حسین پنجاب کے محکمۂ مال گزاری سے منسلک تھے۔ اسی تعلق سے مولوی عبدالحق کا لڑکپن وسط پنجاب میں بسر ہوا' وہیں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ پھر انہیں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ہائی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں سے درجہ بدرجہ ترقی کر کے ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کا امتحان دیا۔ شروع میں آپ کا خاص مضمون ریاضی تھا' مگر بی۔ اے میں فلسفہ لیا اور بعد میں بہت دن تک "فلاسفر" کے لقب سے یاد کئے جاتے رہے۔ بزرگانِ علی گڑھ میں آپ کو سرسید اور مولانا الطاف حسین حالی سے بڑی عقیدت تھی۔ یہ حضرات بھی آپ کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ بی۔ اے میں کامیابی کے بعد مولوی صاحب بمبئی گئے اور کچھ عرصہ تک وہاں نواب محسن الملک (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۰۷ء) کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ وہیں سے کرنل افسر جنگ آپ کو حیدر آباد (دکن) لائے اور مدرسہ آصفیہ کا صدر مدرس مقرر کیا۔ افسر جنگ اپنی انگریزی خط و کتابت میں بھی ان سے مدد لیتے تھے۔ مولوی صاحب نے ۱۸۹۶ء میں اردو ماہ نامہ "افسر" انہیں کے نام پر جاری کیا تھا مگر تین سال بعد یہ تعلق ترک کر دیا اور محکمہ امورِ عامہ (ہوم ڈیپارٹمنٹ) میں مترجم مقرر ہو گئے۔ جہاں آپ تیرہ سال سے زیادہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں سررشتہ تعلیم کے صدر مہتمم (انسپکٹر آف اسکولز) صوبہ اورنگ آباد مقرر ہوئے۔ اسی سال کے آخر میں ایجوکیشنل کانفرنس' علی گڑھ نے آپ کو اپنے شعبہ ترقی اردو کا سیکرٹری منتخب کیا' جس کی بنا ۱۹۰۳ء میں ڈالی گئی تھی' قبل ازیں مولانا شبلی نعمانی' پھر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بھی اس کے سیکرٹری رہے تھے۔

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کی تاسیس میں مولوی عبدالحق کی سعئی و تحریک کا کافی دخل تھا۔ اس کی درسی کتابیں اردو میں تیار کرنے کے لئے سب سے پہلے سررشتہ تالیف و ترجمہ آپ کی زیرِ نگرانی قائم کیا گیا (اواخر ۱۹۱۶ء)۔ چند سال بعد اورنگ آباد میں عثمانیہ کالج بنا اور اس کے پہلے صدر بھی مولوی صاحب مقرر

ہوئے۔ بیس برس سے زیادہ سرکاری خدمات انجام دینے کے بعد آپ نے ۱۹۳۰ء میں پنشن لی، مگر حکومت نے دوبارہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کا صدر بنا دیا اور پوری تنخواہ اور پنشن کے علاوہ بارہ ہزار سالانہ اردو کی ایک بڑی لغت لکھنے کے لئے منظور کئے۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۲۴ء سے ایک مستقل ادارہ بن گئی تھی اور اس کے علمی کاموں میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اب اردو لغت کی تیاری کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ ان مشاغل سے مولوی صاحب کو بالکل فرصت نہ ملتی تھی، لیکن جب گاندھی جی نے ایک نیا لسانی مرکز قائم کیا اور اس کے جلسے (اپریل ۱۹۳۶ء) میں مولوی صاحب کو بھی بلایا تو انہیں معلوم ہوا کہ کانگریس والے نہ صرف اردو زبان بلکہ اس کے رسم الخط سے بھی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں، مولوی صاحب کو بڑی تشویش ہوئی۔ آپ نے ایک خاص کانفرنس اکتوبر ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں منعقد کرائی جس میں اردو کے حفظ و بقا کی تجویزیں سوچی گئیں۔ عملاً" پوری تحریک کا محور انجمن ترقی اردو بلکہ مولوی عبدالحق مان لئے گئے اور قرار پایا کہ انجمن کا صدر دفتر دہلی میں منتقل کیا جائے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے قرارداد کے مطابق جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری سے استعفادے دیا اور اورنگ آباد کی سکونت چھوڑ دی۔ اپنا اور انجمن کا سارا سامان لے کر ۱۹۳۸ء میں دہلی چلے آئے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی میں صدر دفتر قائم کیا اور خود بھی ۱۹۴۷ء تک یہیں رہے۔ آزادی ہند کے خوفناک فسادات میں دفتر انجمن کو بلوائیوں نے تاراج کیا، مولوی صاحب کا ذاتی سازو سامان لوٹ لیا۔ بہت سے قیمتی کاغذات، مکاتیب، دستاویزیں، یادداشتیں برباد کر دیں، کتاب خانے کا بڑا حصہ حکومت نے ضبط کر لیا اور بینکوں میں جمع رقوم روک دی گئیں۔ اسی بے سروسامانی کی حالت میں ۱۹۴۸ء میں کراچی آئے اور پورے اخلاص کے ساتھ از سرِنو انجمن کا پورا کارخانہ جما لیا۔ نئی کتابیں اور معیاری مجلّے پھر شائع ہونے لگے۔ دو کتب خانے (عام و خاص) قائم کئے۔ اردو ٹائپ اور لیتھو کا مطبع بن گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کام ہوا کہ اردو کالج قائم کیا جس میں تمام فنون کی تعلیم کا ذریعہ اردو ہے۔ اب یہ کالج وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام چل رہا ہے۔

۱۹۵۸ء میں حکومت نے ترقی اردو بورڈ قائم کیا اور اسے سب سے اہم کام یہ تفویض کیا گیا کہ زبانِ اردو کی ایک جامع لغت جدید اصول تحقیق کے مطابق تیار کرے۔ مولوی عبدالحق اس کے صدر مدیر بنائے گئے۔ اسی زمانے میں آپ نے "اردو یونیورسٹی" کی پرانی تجویز کو تازہ کیا اور اہلِ وطن کو بار بار اس کی ضرورت پر توجہ دلائی۔ اس تجویز کی تائید و تبلیغ کے ارادے سے لاہور میں ۱۹۵۹ء میں ایک بڑی اردو کانفرنس منعقد ہوئی، جس کی صدارت مولوی صاحب نے فرمائی۔ ۱۹۶۰ء میں مولوی صاحب آنکھ بنوانے کے سلسلے میں زیرِ علاج رہے۔ ۱۹۶۱ء کی گرمیوں میں آنتوں کی دیرینہ شکایت نے غلبہ کیا اور ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو سرطان جگر کے عارضے سے کراچی میں وفات پائی۔ شمسی حساب سے آپ نے ۹۲ سال چند ماہ کی عمر پائی۔ انجمن ترقی اردو کراچی کی عمارت کے احاطے میں دفن کئے گئے۔ "غفراللہ لہ" ہجری تاریخ وفات

ہے۔

تجرد و سادگی کے اعتبار سے مولوی عبدالحق صاحب راہبانہ قسم کی زندگی بسر کرتے رہے اور دولت، شہرت، جاہ و حشم سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ پاکستان آنے کے بعد ریاست حیدر آباد نے آپ کی پنشن بند کر دی۔ حکومت پاکستان نے ۱۹۵۱ء میں پانچ سو روپے وظیفہ مقرر کیا، اس کا بھی زیادہ تر حصہ انجمن ہی کے کاموں میں صرف کرتے تھے۔ مسلسل چالیس برس تک زبان کے فروغ و ترقی کے لئے جیسی بے غرض اور والہانہ سعی آپ کرتے رہے، اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ آپ نے آٹھ نو برس تک ہندوستان کے گوشے گوشے میں دورے کئے۔ جہاں اردو کا چلن نہ تھا وہاں اسے رواج دیا اور جہاں موجود تھی وہاں اسے مزید قوت پہنچائی۔ انجمن ترقی اردو کی صدہا شاخیں مختلف مقامات میں قائم کیں۔ مکتب، مدرسے اور کتب خانے قائم کئے اور اردو کی حمایت میں بڑے بڑے اجتماعات منعقد کرائے۔

علمی کاموں کی طرح مولوی صاحب کے قلم کی روانی بھی عمر کے ساتھ بڑھتی رہی۔ صرف خطوں ہی کا اندازہ ایک لاکھ سے زائد ہے۔ ان میں سے اکثر پر مغز و دلچسپ اور شگفتہ انشا کا نمونہ ہیں۔ کتب و رسائل پر آپ کی تنقیدات اور تبصروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ علمی کاموں کا مختصر حاصل ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام :

(دو جلد، ج اول آگرہ : ۱۹۱۰ء، جلد دوم لاہور ۱۹۱۱ء)

یہ کتاب اصل میں مولوی چراغ علی نے انگریزی میں لکھی تھی، مگر زیادہ تر مولوی صاحب کے اردو ترجمے (اور مقدمے) کی بدولت اس کا نام باقی رہ سکا ہے۔

۲۔ قواعدِ اردو :

اسے مولوی عبدالحق صاحب نے بڑی محنت اور عالمانہ بصیرت سے نئے طرز پر تالیف کیا۔ کتاب نہایت مقبول اور اکثر مدارس میں داخل نصاب ہوئی۔ بعد میں مولوی صاحب نے تاریخ صرف و نحو پر ایک مقدمے اور مختلف اضافوں کے ساتھ طباعت کی اجازت دی۔ اردو میں ایسی مفید و مفصل کتاب صرف و نحو پر نہیں لکھی گئی۔ ۳۶۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

۳۔ مقدماتِ عبدالحق :

حیدر آباد کے دور میں بہت سی علمی اور ادبی کتابوں پر مولوی صاحب نے مقدمے لکھے جو نہایت پسند کئے گئے۔ ان کا ایک مجموعہ دو جلدوں میں حیدر آباد سے شائع کیا (۱۹۳۱ء)۔ اس کے بعد یہ مقدمے اضافوں کے ساتھ ایک ضخیم جلد میں شائع ہوئے۔

۴۔ تنقیداتِ عبدالحق :

(دو جلد ۱۹۳۲ء) اردو کی نئی تنقید نگاری میں مولوی عبدالحق بلند درجہ رکھتے ہیں۔ جب سے رسالہ "اردو" آپ کی ادارت میں جاری ہوا (۱۹۲۱ء) بے شمار تنقیدیں آپ کے قلم سے نکلیں۔ یہ مجموعہ کل کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ تاہم اس سے تنقید میں آپ کی وسعتِ نظر اور تحریر کی دلکشی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۵۔ ادبی تبصرے :

مختلف کتابوں پر مولوی عبدالحق صاحب کے تبصروں کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے جو لکھنؤ سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔

۶۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیہ کرام کا حصہ :

یہ مقالہ پہلے اردو میں پھر علیحدہ کتابی شکل میں چھاپا گیا۔ یہ قدیم اردو پر بہت مفصل و مستند رسالہ ہے۔
چند اور مقالے بھی جو اولاً "اردو" میں باقاعدہ شائع ہوئے تھے اور بعد میں کتابی شکل میں چھپے قابلِ ذکر ہیں یعنی :

۷۔ مرحوم دہلی کالج (۱۹۴۵ء)

۸۔ مرہٹی پر فارسی زبان کے اثرات (۱۹۳۳ء)

۹۔ سرسید احمد خاں، حالات و افکار (۱۹۵۹ء)

۱۰۔ چند ہم عصر :

شخصی خاکوں پر مشتمل یہ دلچسپ کتاب ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن متعدد اضافوں کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں مولوی صاحب کے اسلوبِ نگارش کے بہترین نمونے ہیں۔

۱۱۔ خطباتِ عبدالحق :

مولوی صاحب کے بیان کی قوت و تاثیر کا غالباً سب سے اچھا نمونہ آپ کے تحریری خطبات ہیں جو لسانی معلومات سے لبریز اور حشو و زوائد سے بالکل خالی ہیں۔ پہلے یہ دو جلدوں میں چھپے تھے (جلد اول ۱۹۴۴ء، جلد دوم ۱۹۴۲ء) بعد ازاں مزید اضافوں کے ساتھ ایک جلد میں شائع ہوئے (۱۹۶۴ء)۔

۱۲۔ اردوئے معلّٰی :

مولوی صاحب کے خطوط کا مجموعہ ہے جسے عبدالحق جوبلی کمیٹی لاہور نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔

۱۳۔ مکتوب بابائے اردو :

بنام حکیم محمد امام امامی (کراچی ۱۹۶۰ء)

ماحول کو انسان کے بنانے میں بہت کچھ دخل ہے۔ جب
حالات بدل جاتے ہیں تو ماحول بھی بدل جاتا ہے۔ اس
برِ عظیم میں دفعتہً ایسے انقلاب رونما ہوئے کہ لوگوں
کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ابھی تھوڑا بہت امن اور اطمینان
نصیب ہوا ہے تو حکومت اور دوسرے اداروں نے حالات اور
تغیرات کی روشنی میں اصلاح اور ترقی کی طرف قدم
بڑھا رہے ہیں۔ میاں بشیر احمد کی طرح ہمایوں کی وضع
داری بھی مشہور ہے۔ اس نے کبھی اپنی وضع نہ چھوڑی۔
لیکن ایک ہی ڈگر پر چلتے چلتے وہ کچھ تھکا سا معلوم ہوتا ہے
اور اس کے بشرے سے ماندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔
مگر نئے اور غیر متوقع حالات نے اس میں چستی ہی نہیں پیدا کی
بلکہ ایک نئی توانائی اور نیا ولولہ پیدا کیا ہے۔ ہمایوں تقریباً
ستائیس سال سے اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے اور اس کی
خدمت مقبول ہوئی۔ اب وہ ادبی کوشش کے ساتھ ساتھ
قومی تعمیر کے موضوع کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہ بہت
مبارک خیال ہے اور اس کی شدید ضرورت ہے کہ موجودہ حالات
میں اہلِ فکر سنجیدگی اور غور کے ساتھ اس موضوع کے
مختلف پہلوؤں پر بحث کریں اور اپنی تحقیق و فکر اور
اپنے تجربوں کے نتائج سے اُن لوگوں کی رہنمائی کریں جو قومی
ترقی کے مختلف شعبوں میں کچھ کرنے کے لیے بےتاب ہیں

میں میاں صاحب کو اس نیک ارادے پر دل سے
مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس سے ہمایوں
کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوگا۔ عاقل مند وہی ہے
جو نئے حالات کے رخ کو پہچان کر اُن کے مطابق اپنے میں
کام کرنے کی اہلیت پیدا کرے۔

عبد الحق

۱۴۔ مکتوباتِ عبدالحق :

۱۵۔ بچوں کے خطوط (دو جلدیں، حیدر آباد دکن ۱۹۴۳ء)

مولوی عبدالحق صاحب کا اردو زبان پر ایک یادگار احسان یہ ہے کہ قدیم اردو یا دکھنی کے بیسیوں مخطوطات کو گوشۂ گمنامی سے نکالا، ان کی دشوار تحریروں کو پڑھا اور ان کی اہمیت پہلی بار اہلِ علم پر واضح ہوئی۔ ان عظیم تحقیقات نے اردو زبان کی عمر کئی صدی بڑھا دی اور اس کی تاریخ کی صورت ہی بدل ڈالی۔ ان مخطوطات پر آپ کے فاضلانہ مقالات رسالہ اردو میں چھپتے رہے اور بعض ان دکھنی کتابوں میں شامل ہیں، جنہیں مولوی صاحب نے کمال دیدہ ریزی سے تصحیح اور فرہنگ الفاظ کے ساتھ طبع کرایا مثلاً" شفیق اورنگ آبادی: چمنستانِ شعراء، اورنگ آباد ۱۹۲۸ء، فائق: مخزنِ شعراء، اورنگ آباد ۱۹۳۳ء، تمنا اورنگ آبادی: گلِ عجائب، اورنگ آباد ۱۹۳۲ء نصرتی: گلشنِ عشق، کراچی ۱۹۵۲ء، ملا وجہی: سب رس، کراچی ۱۹۵۲ء، وجہی مصنف: قطب مشتری، کراچی ۱۹۵۳ء

۱۶۔ نصرتی، ملک الشعراء :

(دہلی ۱۹۴۴ء) جس میں اس قدیم شاعر کی تصانیف اور فن پر محققانہ اور ناقدانہ بحث کی گئی ہے۔

اسی طرح شعرائے اردو کے متعدد تذکرے، قدیم دواوین اور قصے مولوی صاحب کی تلاش و تصحیح سے چھپ کر شائع ہوئے۔ مثلاً" مصحفی : تذکرہ ہندی : اورنگ آباد ۱۹۲۲ء، ریاض الفصحاء : اورنگ آباد ۱۹۳۴ء، عقدِ ثریا : اورنگ آباد ۱۹۳۴ء، میر : ذکرِ میر، اورنگ آباد ۱۹۲۸ء، نکات الشعراء : اورنگ آباد ۱۹۳۵ء، انتخاب کلامِ میر (بار ششم، کراچی ۱۹۵۰ء) قائم چاند پوری : مخزن نکات، اورنگ آباد ۱۹۲۹ء، گردیزی : تاریخ ریختہ گویان، اورنگ آباد ۱۹۳۳ء، انشا : دریائے لطافت، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء، کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کراچی ۱۹۵۵ء، تاباں : دیوان، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء، میرامن : باغ و بہار (بار دوم، دہلی ۱۹۴۴ء)، انتخابِ داغ : دہلی ۱۹۳۶ء، میر اثر : خواب و خیال (بار دوم، کراچی ۱۹۵۰ء)۔ ان کتابوں پر مولوی صاحب نے فاضلانہ مقدمات بھی لکھے۔

مولوی عبدالحق صاحب کی مختصر کتابوں اور رسائل میں مندرجہ ذیل بھی قابلِ ذکر ہیں :

۱۷۔ اردو صرف و نحو : اورنگ آباد، ۱۹۳۴ء

۱۸۔ اردو زبان و ادب میں اصطلاحات کا مسئلہ : کراچی، ۱۹۴۹ء

۱۹۔ سر آغا خاں کی اردو نوازی : کراچی، ۱۹۵۱ء

۲۰۔ پاکستان میں اردو کا المیہ : کراچی ۱۹۵۸ء

۲۱۔ اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم سائنس : کراچی ۱۹۵۹ء

۲۲۔ قدیم اردو : کراچی‘ ۱۹۶۱ء

۲۳۔ اردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا : کراچی ۱۹۶۰ء

ان کتابوں کے علاوہ بہت سے مضامین ہیں جو مختلف رسائل‘ مثلاً ” اردو‘ ہماری زبان‘ قومی زبان‘ دکن ریویو‘ پنجاب ریویو‘ معلم نسواں‘ مجلہ عثمانیہ وغیرہ میں شائع ہوئے اور تاحال کسی مطبوعہ مجموعے میں



وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی

جگہ نہیں پا سکے۔ ان کے علاوہ انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹیں بھی ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۶ء تک مولوی صاحب نے مرتب کر کے شائع کرائی ہیں۔ شہاب الدین ثاقب نے مولوی عبدالحق کی تصانیف و تالیفات کی تعداد ۶۸ بتائی ہے۔

انشا پرداز‘ محقق‘ نقاد اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے تو مولوی عبدالحق کا نام سبھی جانتے ہیں لیکن شاعری آپ کی شناخت کا ذریعہ نہ بن سکی اس کا سبب یہ ہے کہ اقلیم سخن میں آپ کی بساط چند شعروں اور دو نظموں تک محدود ہے۔ بابائے اردو کبھی کبھی ہلکے ہلکے مزاحیہ اشعار کہہ لیتے تھے۔ اختر انصاری‘ مدیر ” نئی قدریں“ حیدر آباد‘ سندھ کی شان میں آپ نے یہ اشعار کہے تھے :

رَ انصاری اکبرآبادی — دین و دنیا کی تجھ سے آبادی
حیدرآباد میں ترے دم سے — گونجتی ہے صدائے آزادی
تو نے وہ وہ اصول لکھے ہیں — پڑھ کر حیراں ہیں حیدرآبادی
ی قدروں میں لکھ کے شعر اپنے — غزل اپنی اثر سے ٹکرا دی
عقر و خواجہ و حکیم اسرار — مانتے سب ہیں تیری استادی

اسی طرح مولوی صاحب کی ایک نظم "ہجو برج" بھی ہے جس کا ذکر ماہنامہ صبا' حیدرآباد نومبر ۱۹۶۳ء' قومی زبان' اگست ۱۹۲۴ء اور اگست ۱۹۸۰ء کے شماروں میں ملتا ہے۔ نظم یہ ہے:

ہمارے اک محبوب رسیا ، برج کے — دوانے ہیں شب روز اس کے پیچھے
نہ گھر کی کچھ خبر ہے اور نہ در کی — ، برج سے دل لگی آٹھوں پہر کی
اگر آئے کبھی گھر میں تو ایسے — مسافر آ' سرا میں اترا جیسے
ترستے ہی رہے صورت کو بچے — نہیں یہ چھوٹے منہ سے بات کرتے
رہی بیوی سو ہے وہ کون کتیا — لگائے منھ اسے کوئی بھلا کیا
بہت دن وہ دیکھا کی تماشا — کیا صبر اور کبھی ان کو نہ ٹوکا
چھلک ہی تو پڑا پیمانۂ صبر — کہاں تک کر سکے دل پر کوئی جبر
لگی کہنے کہ اے حضرت سلامت — ذرا آئینے میں دیکھو تو صورت
رخِ زیبا پہ زردی چھا رہی ہے — جوانی کی کلی مرجھا رہی ہے
تمہارے آج کل اچھے نہیں طَور — کبھی اس پر کیا بھی آپ نے غور
نہیں بختی ہماری اور ، برج کی — تو سمجھا کیا ہے لونڈی مجھ کوئی کی
نہ مانو گر برا تم کو کہوں میں — اب اس گھر میں رہے وہ یار ہوں میں
نہیں منظور اس کے ساتھ رہنا — چلی جاؤں گی گر مانا نہ کہنا
کہا شوہر نے سن الو کی پٹھی — پڑھائی ہے یہ کس نے تجھ کو پٹی
برج کو چھوڑ دوں ممکن نہیں یہ — یہ رشتہ توڑ دوں ممکن نہیں یہ
برج ہے جان میری آن میری — برج سے ہے یہ ساری شان میری
برج کا راج ہے سارے جہاں میں — برج کا غلغلہ ہے لامکاں میں
برج سے منزل فرحت چراغاں — برج ہے زندگی کا سازوساماں
برج ایمان و دیں ابنِ آذر — برج سرمایۂ عقبیٰ سراسر
برج پر میں فدا ہوں جان و دل سے — بنا ہوں میں اسی کے آب و گل سے
تمہیں جانا ہو بسم اللہ جاؤ — نہ یہ منحوس چہرہ پھر دکھاؤ

وہ یوں روتی ہوئی تب گھر سے نکلی کہ جیسے خانماں برباد پگلی
خدا کی مار ایسے کھیل پر ہو کہ جس سے یوں تباہ برباد گھر ہو
زن و فرزند سے جس نے چھڑایا کیا دم بھر میں گھر بھر کا صفایا
نہ کھانا ہے نہ پینا ہے نہ سونا برج ہے اور فرح منزل کا کونا
نہ یاروں سے رہی افسوس یاری اگر کچھ ہے تو بس اک چار یاری
بسنت میں مبتلا ساری خدائی دہائی دوستو' یارو دہائی

بابائے اردو کے جو دو اشعار خاص طور سے مشہور ہیں' وہ یہ ہیں۔

نہ فکرِ معیشت نہ عشقِ بتاں ہے مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری

دلوں پہ قبضہ خیالات پر حکومت ہے اب اس سے بڑھ کے تمہیں اختیار کیا ہو گا

شہاب الدین ثاقب نے ان دونوں اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "پہلا شعر مولوی صاحب کی پرخلوص زندگی اور نصب العین سے ان کی گہری وابستگی کا ترجمان ہے۔ دوسرا شعر غزل کی داخلیت' شدت اثر اور حسنِ بیان کی عمدہ مثال ہے"۔

پاک و ہند کی کئی جامعات میں مولوی عبدالحق مرحوم پر تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے شہاب الدین ثاقب کو ان کے تحقیقی مقالے "بابائے اردو مولوی عبدالحق: حیات اور علمی خدمات" پر ایم فل کی ڈگری دی ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۸۵ء میں انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کیا ہے۔ ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ انجمن کا ماہوار رسالہ "قومی زبان" ہر سال "بابائے اردو نمبر" شائع کر رہا ہے۔ سہ ماہی "اردو" نے بھی ایک ضخیم "بابائے اردو نمبر" چھاپا ہے۔ توقع ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور بابائے اردو کی شخصیت کے مختلف گوشے سامنے آتے رہیں گے۔

ماخذ: بابائے اردو مولوی عبدالحق: حیات اور علمی خدمات

جہنم میں اُردو کی حمایت

جب بابائے اُردو مولوی عبدالحق اورنگ آباد سے انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی لے آئے تو ایک صاحب مولانا سے ملاقات کرنے گئے اور ان سے کہا "اگر پانی پت میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کوئی جلسہ کیا جائے تو کیا آپ تشریف لے آئیں گے؟؟" مولوی صاحب فرمانے لگے "اگر جہنم میں بھی اُردو کی حمایت اور نصرت میں کوئی جلسہ منعقد ہو تو میں وہاں بھی خوشی سے جانے کو تیار ہوں"۔

(گلہائے خنداں، ص ۲۷۲)

مولانا عبدالعلیؒ

میرٹھ سے کوئی چھ میل کے فاصلے پر واقع بستی "شیخ پور" حضرت مولانا عبدالعلیؒ کا آبائی وطن تھا۔ مولانا عبدالحئیؒ نے عبداللہ پور ضلع میرٹھ لکھا ہے۔ آپ کے والد شیخ نصیب علی صاحب کے حجتہ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ سے گہرے مراسم تھے۔ حضرت مولانا نانوتوی جس زمانے (۱۲۹۰ھ) میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں کتابوں کی تصحیح کیا کرتے تھے' ان کا جمعہ کا دن شیخ نصیب علی صاحب کے ہاں شیخ پور میں گزرتا تھا۔ شیخ صاحب جمعرات کی شام کو بہلی میں بٹھا کر حضرت نانوتوی کو اپنے ہاں شیخ پور لاتے تھے۔ ان ہی ایام میں میرٹھ میں مولانا عبدالعلی نے موصوف سے علوم وفنون کی تحصیل و تکمیل کی تھی۔

آپ ۱۲۹۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تدریس پہ مامور ہوئے اور ۱۲۹۷ھ تک وہاں پڑھاتے رہے۔ آپ کے بارے میں مولانا عبدالحلیم چشتی لکھتے ہیں کہ "موصوف حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی' مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے تلمیذ' جید عالم اور دارالعلوم کے صف اول کے مدرسین میں سے تھے۔ مولانا عبدالعلی نہایت سادہ' متواضع' ملنسار' مہمان نواز اور خوشحال بزرگ تھے"۔ ۱۳۱۲ھ میں آپ مدرسہ حسین بخش دہلی سے وابستہ ہوئے اور بطور صدر مدرس تادم آخر اسی مدرسہ سے تعلق قائم رکھا۔ مولانا قاری طیب صاحب نے مدرسہ کا نام مدرسہ عبدالرب دہلی لکھا ہے۔

مولانا عبدالعلیؒ سے اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء نے تکمیل کی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ' مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا مفتی کفایت اللہؒ جیسے جید علماء آپ کے تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں کہ "میں نے مولانا سے مقامات حریری' سبعہ معلقہ اور کچھ نسائی پڑھی ہے۔ بے لوث اور بے تعلق ہیں' کسی سے کچھ مطلب نہیں۔ خود بھی مدرسہ میں چندہ دیتے ہیں' مقدار چندہ کی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ مولانا کے پاس بیٹھنے سے ایک خاص کیفیت معلوم ہوتی ہے"۔ مولانا عبدالعلیؒ کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم شیخ الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ دہلی کے محدث شمار ہوتے تھے۔ آپ نے سینکڑوں شاگرد چھوڑے۔ تقویٰ' طہارت اور استقامت میں آپ خود ہی اپنی مثال تھے۔ آخری سانس تک جماعت کی نماز اور صف اولی ترک نہیں ہوئی تھی"۔ مولانا عبدالحئیؒ فرماتے ہیں کہ "شیخ العالم الفقیہ، عبدالعلی بن نصیب علی حنفی میرٹھی مشہور علماء میں سے تھے۔

حضرت مولانا عبدالعلی کا انتقال دہلی میں ۱۳ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ / ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو ہوا اور مہندیوں کے قبرستان میں خانوادہ ولی اللہ دہلوی کے پائیں میں سپرد خاک کئے گئے۔

مشاہیر دارالعلوم دیوبند' مشاہیر علماء دیوبند: جلد اول' معارف اعظم گڑھ : ستمبر ۱۹۶۷ء

مولانا شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی

مبلغ اسلام حضرت مولانا شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی ابنِ حضرت مولانا محمد عبدالحکیم صدیقی میرٹھ میں ۱۵ر رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ مطابق ۳ر اپریل ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد عظیم المرتبت درویش صفت عالم دین اور بلند پایہ شاعر تھے۔ جوش تخلص کرتے تھے۔ شاہ عبدالعلیم صدیقی نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ چار سال دس ماہ کی عمر میں کلام پاک پڑھ لیا۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم والد گرامی سے حاصل کی بعد ازاں جامعہ قومیہ میرٹھ میں داخل ہوئے اور سولہ سال کی عمر میں درسِ نظامی کی سند حاصل کی۔

مولانا کو چونکہ شروع ہی سے تبلیغ اسلام کا شوق تھا اس لئے علومِ جدیدہ حاصل کرنے کے لئے اثاوہ ہائی اسکول سے میٹرک اور ۱۹۱۷ء میں میرٹھ سے بی۔ اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ کالج کی چھٹیوں کے دوران بریلی میں حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاںؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اکتساب فیض کرتے رہے۔

میرٹھ میں دورانِ تعلیم آپ کو آل برما ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس میں آپ کا پڑھا گیا خطبہ برما اور سیلون میں مقبول ہوا اور برما کے احباب سے دینی نشرواشاعت پر جو گفتگو ہوئی وہ مستقبل کے تبلیغی مشن کے لئے بنیاد ثابت ہوئی۔

مولانا نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے خوب جوہر دکھائے۔ مولانا شاہ احمد رضا خاںؒ (۱۸۵۶ـ۱۹۲۱ء) کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے اور خلافت و اجازت سے سرفراز ہو کر انہی کے ایما و ارشاد پر اپنی زندگی تبلیغ دین اور خدمتِ اسلام کے لئے وقف کر دی۔ آپ کے مرشد آپ کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپ کو بھی اپنی مرشد سے کمال عقیدت تھی۔ حرمین کی زیارت سے واپسی پر آپ نے ایک طویل قصیدہ مدحیہ اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

تمہاری شان میں جو کچھ کہوں اس سے سوا تم ہو
قسیمِ جامِ عرفاں اے شہِ احمد رضا تم ہو

غریقِ بحرِ الفت، مست جامِ بادہ، وحدت
محبِ خاص، منظورِ حبیبِ کبریا تم ہو

جو مرکز ہے شریعت کا مدار اہلِ طریقت کا
جو محور ہے حقیقت کا وہ قطب الاولیا تم ہو

عرب میں جا کے ان آنکھوں نے دیکھا جس کی صورت کو
عجم کے واسطے لاریب وہ قبلہ نما تم ہو

علیم خستہ اک ادنیٰ گدا ہے آستانہ کا
کرم فرمانے والے حال پر اس کے شہا تم ہو

اس کلام کو سماعت فرمانے کے بعد مولانا احمد رضا خاںؒ نے فرمایا "مولانا آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں؟ آپ اس دیارِ پاک سے تشریف لا رہے ہیں' یہ عمامہ تو آپ کے قدموں کے بھی لائق نہیں' البتہ میرے کپڑوں میں سب سے بیش قیمت ایک جبہ ہے' وہ حاضر کئے دیتا ہوں۔"

مولانا صدیقی نے ۱۹۵۱ء میں عالمی دورہ کیا۔ یورپ' افریقہ' مشرقِ وسطیٰ کے تقریباً" تمام ممالک کے متعدد سفر کئے اور لوگوں کو دعوتِ اسلام پہنچائی۔ آپ کی تبلیغی کوششوں سے بورنیو کی شہزادی' مارشیس کے فرانسیسی گورنرز' اور ٹرینی ڈاڈ کی ایک خاتون وزیر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۳۵ء میں جارج برناڈشا سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ آپ کی گفتگو سے برناڈشا بہت متاثر ہوا۔ آپ نے مختلف ممالک میں مساجد بھی تعمیر کرائیں۔

دنیا کے مشاہیر سے آپ کے مراسم تھے اور یہ سب آپ کی خدمات کے معترف تھے۔ تحریکِ پاکستان میں بھی مولانا نے حصہ لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہے۔ چند تصانیف یہ ہیں۔ ذکرِ حبیب' کتابِ تصوف' بہارِ شباب' احکامِ رمضان' اسلام کے اصول' اسلام اور اشتراکیت' مسائل انسانی کا حل' اسلام میں عورت کے حقوق' مرزائی حقیقت کا اظہار وغیرہ۔

چالیس سال تک دنیا بھر میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دے کر ۲۲ ذوالحج ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۵۴ء کو مدینہ منورہ میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جنت البقیع میں جگہ ملی۔ مولانا شاہ احمد نورانی آپ کے صاحبزادے اور ممتاز اسکالر ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن انصاری قادریؒ آپ کے محبوب خلیفہ اور داماد ہیں۔

مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب "حجازِ مقدس کے اردو شاعر" میں مولانا کا کلام شائع کیا ہے۔ درج ذیل کلام اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

حمد

ذرے ذرے میں تو ہی تو ہر گل میں شجر میں تیری بو
کوئل کرتی ہے کو' کو' کو بلبل ہے چہکتی ہو' ہو' ہو
اللہ' اللہ' اللہ' اللہ'
تو ہی تو تھا جب کچھ ہی نہ تھا جب کچھ رہے تو ہی تو ہوگا

ہر کون میں کون ہے تیرے سوا / تیرا ہی جلوہ ہے ہر سو
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

ہر شان میں تو ہر آن میں تو / ہر آن ہے اک نئی شان میں تو
اے جانِ جہاں، ہر جان میں تو / ہے تو ہی تو ہر سو، ہر کو
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

حکمت تیری ہے، حکیم ہے تو / سب حادث اور قدیم ہے تو
ہاں جانِ عبدِ علیم ہے تو / یاہو، یاہو، یاہو، یاہو
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

غزل

کسی کی یاد یوں شام و سحر ہے / کہ ہر تارِ نظر اک ابرِ تر ہے
رہینِ منتِ قاصد بنوں کیوں / مری آہِ رسا کیا بے اثر ہے
تصور میں کسی کے محو رہنا / ہمارا مشغلہ شام و سحر ہے
خودی ہی اک تجلی ہے خدا کی / بتوں کے حسن میں جو جلوہ گر ہے
یہ اک سجدہ نہ کرنے کی ہے شامت / کہ یوں سجدہ کناں تو دربدر ہے
سمائے کس طرح کوئی نظر میں / جمالِ یار جب پیشِ نظر ہے
یہ طرزِ دل ربائی کس سے سیکھا / اِدھر رخ ہے اُدھر ترچھی نظر ہے
علیم اور یہ تغزل، جذبۂ عشق / یہ تیرے سوزِ پنہاں کا اثر ہے

ماخذ : تذکرہ اکابر اہلِ سنت، ص ۲۳۶ تا ۲۴۲ ـــ حیاتِ اعلیٰ حضرت، جلد اول، ص ۵۱، ۵۲
ماہنامہ ضیائے حرم بھیرہ نومبر ۱۹۷۱ء ترجمانِ اہلسنت کراچی، اگست ستمبر ۱۹۷۲ء

مولوی عبدالغفور

مولوی عبدالغفور صاحب کا تعلق انچولی ضلع میرٹھ کے ایک معزز و معروف دینی خاندان سے تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۸۴۵ء میں گورکھپور میں ہوئی جہاں آپ کے والد مولوی عبدالوہاب صاحب پولیس کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ ان کا دربارِ دہلی اور دربارِ اودھ سے گہرا تعلق رہا۔

مولوی عبدالغفور صاحب کی ابتدائی تعلیم گورکھپور ہی میں ہوئی۔ جب آپ چھ برس کے تھے کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ ۱۸۶۷ء میں فارغ التحصیل ہوئے اور اگلے ہی سال سرسید احمد خان کے مشورہ پر آپ نے سول سروس کا امتحان پاس کیا جس کے بعد ۱۸۷۱ء میں آپ بجنور کے حاکم علاقہ مقرر ہوئے۔

مولوی عبدالغفور صاحب نہایت ذہین، ایماندار اور محنتی تھے۔ آپ کو ہندوستان کے سب سے بڑے صوبہ یو۔پی کے بعض نہایت حساس اور اہم اضلاع میں تعینات کیا گیا۔ مراد آباد، بریلی، پیلی بھیت، بدایوں، اٹاوہ اور آگرہ وغیرہ میں آپ نے اہم انتظامی اصلاحات نافذ کیں جو بہت کامیاب رہیں۔ آپ کی خداداد دور اندیشی، معاملہ فہمی اور سیاسی بصیرت سے حکومتِ وقت بہت متاثر ہوئی اور آپ کو پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کردیا گیا جہاں آپ نے اک عرصے کے تعطل میں پڑے ہوئے معاملات کو نہایت احسن طریقے سے حل کیا۔ حکومتِ ہند نے مولوی صاحب کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ریاست رامپور کا مدار المہام مقرر کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۰۹ء کے آخر میں آپ نے نہایت اعتماد کے ساتھ یہ فرائض سنبھالے۔ اس وقت ریاست رامپور ہر شعبہ میں ناکام ہوچکی تھی اور ریاست کے تمام شعبے انحطاط پزیر تھے۔ قانون کا احترام اور انتظامی نظم وضبط مفقود تھا۔ ان پریشان کن حالات میں مولوی صاحب نے ریاست کے تمام امور کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور ایک تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا۔ کمیشن کی رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد حکومتِ ہند نے تمام سفارشات منظور کرلیں اور مولوی صاحب کو وسیع اختیارات دے دیئے گئے۔ مولوی عبدالغفور نے بہترین حکمتِ عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عملی اقدامات کیئے اور راستے کی رکاوٹ کو دور کیا۔ جس کے نتیجے میں حالات معمول پر آنے لگے۔ ان اقدامات سے موقع پرست عناصر کے مفادات کو سخت دھچکا لگا اور انہوں نے سازشوں کا جال بچھادیا۔ جب تمام چالیں ناکام ہوگئیں تو ان عناصر نے مولوی صاحب کے نہایت با اعتماد ساتھی منصب علی صاحب کو قتل کردیا۔ اس صدمہ سے مولوی صاحب اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ تقریباً چھ ماہ تک بالکل بات چیت نہیں کی اور دماغی کیفیت ایسی بگڑی کہ بمشکل جان بچی۔ آپ اپنے منصب سے مستعفی ہوگئے اور پھر کبھی رامپور نہ گئے۔

۱۹۰۶ء میں حکومتِ ہند نے کسی اہم کام کے لئے آپ کو یونان بھیجا۔ وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ انتقال کے بعد ہندوستانی سفارت خانہ نے ایتھنز میں آپ کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقے سے کرائی۔ سرفراز حسین عابدی نے لکھا ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق فرمایا کرتے تھے کہ مولوی عبدالغفور کو نواب رامپور کے ایجنٹوں نے زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔

مدار المہام مولوی عبدالغفور مرحوم نے اردو زبان و ادب کی بھی بھرپور خدمت کی۔ اردو کی ترویج و ترقی کے لئے آپ ہمیشہ کوشاں رہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے بحیثیت سیکریٹری دسمبر ۱۹۰۳ء میں بمبئی میں منعقدہ سالانہ کانفرنس میں جو رپورٹ پیش کی اس میں ملک کی جن قد آور شخصیات کی کانفرنس میں شمولیت کا ذکر ہے ان میں مولوی صاحب کا نام بھی شامل ہے۔ آپ نے دارالمصنفین ندوہ اعظم گڑھ کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ آپ اس کے بانی ارکان میں شامل تھے۔

صدائے انجولی کراچی مجلہ خصوصی جون ۱۹۸۸ء ص ۱۶ تا ۱۹۔



حاجی حافظ شیخ عبدالکریم

خان بہادر حاجی حافظ شیخ عبدالکریمؒ

شیخ مدار بخش صاحب رئیس میرٹھ کے فرزندِ سوم خان بہادر حاجی حافظ شیخ عبدالکریم صاحب کی ولادت میرٹھ میں ہوئی اور تعلیم و تربیت کا اہتمام بھی وطن میں ہوا۔ آپ اپنے برادر محترم شیخ الٰہی بخش کے دست راست اور ہر معاملہ میں ممد و معاون رہے۔ اس خاندان کی ترقی میں ان دونوں بھائیوں کی جدوجہد کا بڑا دخل رہا۔

شیخ مدار صاحب نے ابتدا ہی سے اپنے اس فرزند کی طرف خصوصی توجہ دی۔ آپ کو حضرت مولانا شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ جس زمانے میں مولانا دہلی میں حضرت مولانا فخر صاحبؒ کے قائم کردہ مدرسہ میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ روزانہ میرٹھ سے گھوڑ سواری پر حضرت مولاناؒ سے سبق پڑھنے دلی جایا کرتے تھے۔ میرٹھ سے دہلی تک راستے میں تین مقامات پر گھوڑے تبدیل کئے جاتے تھے۔ بعد میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کی خدمت میں رہ کر اکثر کتابوں کی تکمیل کی۔ آپ نے کلام پاک بھی حفظ کیا تھا اور پھر قرأت کی تکمیل قاری قادر بخش صاحب دہلوی سے فرمائی۔ آپ کلامِ ربانی ہر سال رمضان المبارک کے مہینہ میں تراویح میں سناتے تھے۔ ریاضت و عبادت، ذکراللہ اور یادِ الٰہی آپ کی زندگی کا محبوب مشغلہ رہا۔ عابد و زاہد اور شب بیدار تھے۔ صورت درویشی کا مظہر تھی۔ مال و دولت کی فراوانی اور عزت و حرمت کے باوجود آپ کا دل معرفتِ الٰہی سے منور تھا۔

شیخ عبدالکریم صاحب کی طبیعت میں فقیرانہ مزاج کا بڑا دخل تھا۔ غرباء و مساکین کی امداد کی طرف خصوصی توجہ رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی دریا دلی سے حجازِ مقدس کے لوگوں کی کافی مدد کی۔ دورانِ حج حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مہاجر مدنیؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ مصطفےٰ خاں شیفتہ، حضرت قاری رحیم بیگ اور حاجی ممتاز علی خاں میرٹھی صاحبان آپ کے پیر بھائی تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کے چھوٹے بیٹے ڈیوک آف کناٹ آپ کو چچا کہتے تھے۔ ڈیوک ۱۸۸۳ء میں برطانوی فوج کے کمانڈر کے عہدہ پر مامور ہو کر میرٹھ آئے تھے۔

شیخ صاحب نے میرٹھ میں مفادِ عامہ کے شعبوں کی بڑی مدد کی۔ آپ نے ٹاؤن ہال میرٹھ کے لیے نہ صرف قطعہ زمین عطا فرمایا بلکہ اس منصوبے کے تمام اخراجات بھی خود برداشت کیے۔ ٹاؤن ہال کی شاندار اور جاذبِ نظر عمارت پر درج ذیل عبارت کندہ ہے:

TOWN HALL

BUILT IN HONOUR OF

MAJOR JOURNAL H.R.H. THE DUKE OF CONNAUGHT

K.G.K.P K.T.G C.S.I.C.B

A.D.C

WHO COMMANDED THE

MEERUT DIVISION

1883-1885

AT THE COST OF

HAFIZ SHEIKH ABDUL KARIM#KHAN#BAHADUR

RAIS AND LAND OWNER

MEERUT.



فیملی گروپ خان بہادر حافظ عبدالکریم

میرٹھ کالج کے قیام کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ۲۲ فروری ۱۸۹۲ء کو عمائدین شہر کی ایک میٹنگ ٹاؤن ہال میں طلب کی گئی۔ جس میں شریک چونتیس معززین نے مجوزہ اسکیم سے پورا پورا اتفاق کیا۔ شیخ صاحب نے اس منصوبے کے لئے گرانقدر عطیات دئے۔ آپ کا نام میرٹھ کالج کے بنیادی اراکین میں سرفہرست ہے۔ مدرسہ اسلامی عربی اندر کوٹ میرٹھ کی عمارت کی توسیع بھی آپ نے کرائی۔ شیخ صاحب لیڈی ڈفرن ہسپتال میرٹھ، آگرہ اور الہ آباد کے بنیادی اراکین میں تھے۔ میرٹھ کے مشہور تعلیمی ادارے فیض عام انٹر کالج کی بھی آپ نے ہر طرح سرپرستی فرمائی۔ فیض عام انٹر کالج کی پہلی مجلس منتظمہ کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ ان تعلیمی و سماجی اداروں کے علاوہ محمڈن کالج علی گڑھ، سرسید میموریل فنڈ، رمزے ہسپتال فنڈ، یادگار قیصرِ ہند فنڈ میں گرانقدر عطیات، پولس لائن میرٹھ کے لئے قطعہ آراضی کا عطیہ، زمانہ قحط میں متاثرین عرب و عراق کی کثیر مالی امداد، میڈیکل کالج لکھنؤ، الہ آباد یونیورسٹی اور طبیہ کالج دہلی کی عمارات کی تعمیر میں حصہ، ان سب خدمات کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ خان بہادر موصوف نے پوری دردمندی کے ساتھ اہلِ وطن اور مسلمانانِ ہند کی مدد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آپ کا ایک تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ اپنے نبیرگان حاجی شیخ نظام الدین و حاجی شیخ علاؤ الدین صاحبان کی شادی کی خوشی میں کُل قیدیان دیوانی جو جیل خانہ میرٹھ میں قرضہ جات ادا نہ کرنے کے سبب مقید تھے، ان کے قرضوں کو ادا کرکے ان سب کو رہا کرا دیا۔ آپ کی اس منفرد خدمت کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

آپ کے خاص احباب میں نواب احمد اللہ خاں، حکیم مقرب حسین خاں، حکیم محمد فخر الدین، حکیم بلدیو سہائے اور پنڈت موتی لال نہرو قابلِ ذکر ہیں۔

خان بہادر حاجی حافظ شیخ عبد الکریم صاحب نے تقریباً ۹۳ سال کی عمر میں ۹ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ مطابق ۷ نومبر ۱۹۰۵ء کو انتقال فرمایا۔ اس سانحہ عظیم پر میرٹھ کا ہر شخص بلا امتیاز اشکبار تھا۔ تمام شہری ادارے، بازار اور تعلیمی ادارے بند کر دئے گئے۔ ہزاروں افراد نے جنازے میں شرکت کی۔ راستہ میں کئی جگہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ہندو اور مسلمان مستورات نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو جنازے کے نیچے سے گزارا۔ آپ کی تدفین خاندانی احاطہ قبرستان میں والد ماجد کے بائیں جانب ہوئی۔ ہزاروں تعزیتی پیغامات آپ کی ہر دل عزیزی کا مظہر ہیں۔ آپ کے ورثاء میں تین فرزند شیخ غلام محی الدین، شیخ وحید الدین اور شیخ بشیر الدین صاحبان کے علاوہ تین بیٹیاں تھیں۔

ماخذ : حیاتِ بشیر

ڈاکٹر عترت حسین زبیری

ڈاکٹر عترت حسین زبیری بقول جناب شاہ بلیغ الدین "جامعہ عثمانیہ کے واحد فرزند ہیں جنہیں پوپ نے دعوت دے کر بلایا اور وٹیکن (VATICAN) ائرپورٹ پر خود ان کا استقبال کر کے اپنا مہمانِ خاص بنایا۔ انگریزی ادب میں آج بھی ان کی حیثیت مسلم ہے۔"

نواب وقار الملک کے حیدر آباد آنے کے بعد زبیری خاندان کے بہت سے افراد حیدر آباد پہنچے۔ انہیں میں پروفیسر ابنِ حسن زبیری بھی تھے جو جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ تاریخ میں ریڈر رہے۔ یہیں سے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپی وظیفہ ملا۔ وہ جامعہ عثمانیہ سے بے انتہا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین بھی بلدۃ الجامعہ کے قبرستان میں ہوئی۔ اس قبرستان میں وہی سب سے پہلے دفن ہوئے تھے۔

ڈاکٹر عترت حسین زبیری مارہرہ کے مشہور زبیری خاندان کے فرد اور ابن حسن زبیری کے چھوٹے بھائی تھے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی جان الٰہی تھا۔ چار بھائی تھے۔ ڈاکٹر ابن حسن جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر رہے اور ۲۷ برس کی عمر میں انتقال کیا' ابن حسین زبیری پھر عترت حسین زبیری اور سب سے چھوٹے مسرت حسین زبیری جو تقسیمِ ہند کے وقت وہ واحد آئی۔ سی۔ ایس تھے جو سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر عترت حسین زبیری کی ولادت ۱۹۱۰ء میں قاہرہ میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم کا آغاز اناوہ سے ہوا۔ پھر میرٹھ میں رہائش ہوئی اور فیض عام ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ ایف۔ اے میں داخلے کے لئے عثمانیہ یونیورسٹی چلے گئے جہاں ان کے بڑے بھائی پروفیسر حسن زبیری یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے۔ وہاں مسرت منزل میں رہنے لگے۔ پروفیسر ابن حسن زبیری اس ہوسٹل کے موودب (WARDEN) تھے۔ آپ کی کالج کی چار سالہ تعلیم یہیں ہوئی۔ بھائی کی وجہ سے آپ کو اساتذہ کی محبتیں بھی میسر آئیں اور انہی کی وجہ سے دار الترجمہ سے بھی آپ کا تعلق پیدا ہوا' جہاں اس دور کے قابل اسکالرز علامہ عبداللہ العمادی (م ۱۹۴۷ء)' سید علی حیدر نظم طباطبائی (۱۸۵۲ء...۱۹۳۳ء)' مولانا عبدالماجد دریا آبادی (۱۸۹۲ء...۱۹۷۷ء)' مولانا البارى ندوی' پروفیسر ہادی رسوا اور مولانا وحید الدین سلیم سے استفادے کا موقع ملا اور پروفیسر اسپیٹ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف جیسے انگریزی پڑھانے والے اساتذہ ملے۔

۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر عترت حسین صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کیا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے میں ایک سے ایک ذہین طالب علم جامعہ عثمانیہ میں موجود تھا۔ ان میں سے بیشتر نے جامعہ عثمانیہ کا نام روشن کیا اور خود بھی علمی دنیا میں معتبر ٹھہرے۔ ان میں ڈاکٹر رضی الدین' ڈاکٹر حمید اللہ' ڈاکٹر بشارت علی' پروفیسر عزیز احمد' پروفیسر فضل حق اور بیرسٹر اکبر علی خان شامل ہیں۔ عترت حسین صاحب امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرتے ہوئے انگریزی ادب میں جامعہ میں اول آئے۔ حیدر آباد کی

حکومت نے آپ کو انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے لئے وظیفہ دیا۔ موصوف الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر امرناتھ جھا کے شاگرد خاص بن گئے۔ ایم۔اے میں امتیازی نمبروں میں کامیابی کے ساتھ ہی پروفیسر امرناتھ جھا نے حکومت حیدر آباد سے سفارش کی کہ آپ کو انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کے لئے انگلستان بھیجا جائے۔ ان کی سفارش پر حکومت حیدر آباد نے وظیفہ جاری کیا۔ آپ نے ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں کے آپ کے استاد اور نگران کار مشہور مستشرق پروفیسر گریرسن نے آپ کے مقالے کی بہت تعریف کی اور آپ کی اجازت سے امریکہ میں اپنی توسیعی تقریروں کے لئے اس مقالے کے مواد سے بڑا استفادہ کیا۔ آپ کے مقالے کا عنوان "سترہویں صدی کے انگریزی ادب میں تصوف" تھا۔ اسی زمانے میں آپ نے انگریزی شاعر جان ڈانئے (JOHN DONNE) کی شاعری پر ایک اعلیٰ پائے کی کتاب لکھی جس کے نتیجے میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے آپ کو فیلو شپ دی۔ عترت صاحب نے مکاتیب جان ڈانئے مرتب کئے اور سترہویں صدی کے چار ممتاز شعراء پر ایک کتاب لکھی۔ ان کی اشاعت سے انگریزی ادب کی دنیا میں آپ کا ایک خاص مقام ہو گیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے اس کام کی وجہ سے آپ کو انگریزی ادب کے مستند محققین کی فہرست میں شامل کیا۔ اس اعزاز کی وجہ سے آپ کو مشہور CARNAIGE اسکالر شپ ملا۔ یہ عظیم اسکالر شپ حاصل کرنے والے آپ پہلے ایشیائی ہیں۔ تصوف پر آپ کے مقالے کو پوپ نے دیکھا تو ملاقات کی خواہش کی اور آپ کو (VATICAN) محل میں اپنا مہمان بنایا۔

ڈاکٹر عترت حسین زبیری ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبہ ادبیات انگریزی کے پروفیسر اور صدر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء میں راجشاہی یونیورسٹی کے قیام کے بعد اس کے پہلے وائس چانسلر بنائے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں وفاقی حکومت کے مشیر تعلیم ہوئے۔ اس زمانے میں دیگر امور کے علاوہ آپ نے اردو ڈکشنری بورڈ قائم کیا۔ یونیسکو میں بارہا پاکستان کی نمائندگی کی۔ ۱۹۵۹ء میں محکمہ جاتی سازشوں سے تنگ آکر یہ عہدہ چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر زبیری صاحب کو دنیا کی سات بڑی یونیورسٹیوں سے پیش کش ہوئی۔ آپ نے امریکہ کی آیووا یونیورسٹی سے تعلق پسند کیا اور بطور پروفیسر منسلک ہو گئے۔ پھر کینیڈا چلے گئے۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر ہاپکنس (HOPKINS) کہتے ہیں "وہ ایک نابغہ روزگار تھے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب کی روح کو پا لیا تھا۔"

آپ کا انتقال دسمبر ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ امریکہ سے لاش کراچی لائی گئی۔ والدہ کی قبر کے پاس کلفٹن میں حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار کے احاطے میں آپ کی تدفین ہوئی۔ آپ کی وفات کے بعد IOWA یونیورسٹی نے آپ کی یاد منانے کے لئے ایک تقریب کی تھی جس میں بیگم سعیدہ عترت کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر عترت حسین زبیری کی شادی سعیدہ بیگم سے ہوئی تھی۔ یہ سر سید احمد خان کی نواسی کی بیٹی تھیں۔ محترمہ کے والد ادریس صاحب کا آگرہ میں کاروبار تھا۔ ان سے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں یادگار ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]



مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری

ڈاکٹر مولانا محمد فضل الرحمٰن انصاری

مبلغ اسلام مولانا ڈاکٹر حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری القادری کی ذاتِ گرامی سے سب ہی واقف ہیں آپ ایک بلند پایہ انشا پرداز، شعلہ بیان مقرر اور اسلام کے حقیقی سفیر تھے۔ تحریر و تقریر میں سائنس اور فلسفہ سے استشہاد و استدلال آپ کے مطالعے کی وسعت اور ذہانت کا ثبوت ہے۔ آپ نے غیر مسلم اقوام کے سامنے انہیں کی زبانوں میں اسلامی تعلیمات کو موثر اور جدید انداز میں پیش کر کے اسلام کی حقانیت سے روشناس کرایا۔

مولانا فضل الرحمٰن انصاری لباس اور وضع قطع میں اپنے خسر مولانا شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی سے بہت زیادہ مشابہ تھے۔ وہی نیچی عبا اور اسی طرح عمامہ کی ساخت اور ویسا ہی کشش رنگ۔ جسم چھریرا، قد مناسب اور چہرہ پر کشش۔ علم و فضل، ذہانت اور جذب و سوزان کے بشرے سے نمایاں تھا۔ لباس، مکان اور رہن سہن صاف ستھرا معاش اور روزگار کی طرف سے بے فکری اور اطمینان آپ کو نہ صرف اردو بلکہ فارسی، عربی، انگریزی کے علاوہ دنیا کی کئی دوسری زبانوں میں تحریر و تقریر پر عبور حاصل تھا۔ مولانا انصاری نے اپنی سحر انگیز علمی روحانی شخصیت سے تعلیم یافتہ طبقہ کو بہت متاثر کیا۔

مولانا محمد فضل الرحمٰن انصاری کی ولادت ۱۴ شعبان المعظم ۱۳۳۲ھ / ۱۴ اگست ۱۹۱۴ء کو جمعہ کے دن مظفر نگر (یو۔پی بھارت) میں مولانا محمد خلیل انصاری کے یہاں ہوئی۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ آپ کے بزرگوں میں حضرت خواجہ عبداللہ انصاری (ہرات) اور سلسلہ عالیہ چشتیہ کے حضرت مولانا کریم بخش انصاری المعروف میاں جی (مظفر نگر) اپنے دور کی مشہور شخصیات تھیں۔

مولانا انصاری نے ۱۹۱۹ء میں قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا اور ۱۹۲۱ء میں آپ نے مدرسہ اسلامیہ مظفر نگر سے حفظِ قرآن کی سند لی، اسی سال آپ کے والدِ گرامی اپنے خاندان سمیت مظفر نگر سے میرٹھ آ گئے۔ میرٹھ میں مولانا انصاری نے مدرسہ اسلامیہ میں درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۱۹۲۲ء تک آپ مدرسہ کے طالب علم رہے۔ اس کے بعد ذاتی کوششوں سے تعلیم جاری رکھی اور جدید علوم کی تعلیم

کے لئے میرٹھ کالج میں داخلہ لے لیا۔
دورانِ تعلیم مولانا انصاری نے مضامین بھی لکھنا شروع کر دیے تھے۔ یہ مضامین انگریزی میگزین مسلم اسٹینڈرڈ سیلون اور رئیل اسلام سنگاپور میں شائع ہونے لگے۔
۱۹۳۲ء میں جب مولانا ایف۔ ایس۔ سی کے طالب علم تھے' ایک روز کالج سے واپس آ رہے تھے کہ دیکھا ' ایک بزرگ حضرت مخدوم کی مسجد سے باہر آ رہے ہیں اور بہت سے لوگ ان سے عقیدت و احترام سے مل رہے ہیں۔ دوستوں نے بتایا کہ یہ بہت بڑے مبلغ اسلام اور عالمِ دین مولانا عبدالعلیم صدیقی ہیں جو جدید تعلیم سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا جواب اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نہایت اچھے طریقے سے دیتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا انصاری ' علامہ صدیقی کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ مولانا صدیقی بھی محبت کرنے لگے اور اپنا کافی کام آپ کے سپرد کر دیا۔ اسی سال مولانا انصاری کی پہلی تصنیف THE BEACH LIGHT منظرِ عام پر آئی یہ کتاب ہانگ کانگ کے ایک پادری کے اسلام پر الزامات کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں مولانا نے میرٹھ کالج سے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا اور اسی سال مدرسہ اسلامیہ میرٹھ سے فارغ التحصیل ہو کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لے لیا۔
مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے تعلیم میں پوری دلچسپی لی۔ آپ نے ۱۹۳۵ء میں بی۔ ایس۔ ای کے امتحان میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور دوسرا گولڈ میڈل فلسفہ میں اٹھانوے فیصد نمبر حاصل کرنے پر ملا۔ برصغیر میں اتنے نمبر حاصل کرنے کا یہ ریکارڈ اب تک برقرار ہے۔
آپ نے ۱۹۳۶ء میں علامہ سید سلیمان اشرف بہاری صدر شعبہ علوم اسلامیہ ' مسلم یونیورسٹی کی سرکردگی میں قرآن و حدیث کے علاوہ علم الکلام اور تصوف کی کتب کا مطالعہ کیا اور اسی سال آپ کا نکاح علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی کی بڑی صاحبزادی امت السبوح سے ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں آپ نے عربی فارسی اور انگریزی کے علاوہ جرمن زبانیں سیکھنا شروع کیں۔ اسی سال کے آخر میں آپ نے سنگاپور میں غیر مسلموں کی کاروائیاں روکنے کے لئے تبلیغی سفر کیا اور وہاں سے اپنی ادارت میں پہلا اسلامی رسالہ ماہنامہ "دی جینوئن اسلام" انگریزی میں جاری کیا۔ ملائشیا کی تنظیموں کو یکجا اور مشرقِ بعید کی اسلامی انجمنوں کو منظم کیا۔
۱۹۳۹ء میں مولانا انصاری برلن (جرمنی) کی الیزینڈر فون ھمبلٹ اسٹفٹنگ یونیورسٹی میں ریسرچ فیلو منتخب ہوئے مگر دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے جرمنی نہ جا سکے اور بیچولر آف تھیالوجی کا کورس پسند کیا۔ ۱۹۴۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے علوم دینیہ کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا نے میٹا فزکس ' ایتھکس ' سیکالوجی ' ہسٹری آف فلاسفی میں ایم۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور فلاسفیکل سوسائٹی آف علی گڑھ یونیورسٹی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی نگرانی میں آپ نے اسلامک مورل اور میٹا فزیکل فلاسفی میں ڈاکٹریٹ کے لئے ریسرچ شروع کر دی۔ اسی سال آپ کو آفتاب ہاسٹل کا وارڈن بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۵ء تک آپ ہاسٹل کے وارڈن رہے۔ قائد اعظم کے ارشاد

پر ۱۹۴۳ء میں ایجوکیشن پلاننگ کمیٹی کی رکنیت قبول کی اور دو سال کمیٹی کے رکن رہے۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک مولانا انصاری پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اہم تحقیقی کام کرتے رہے۔ جب یہ تحقیق مکمل ہو گئی تو ان دنوں ہندوستان میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ آپ کے گھر والے کراچی چلے آئے۔ اس منتقلی میں ان کے پاس سے مولانا کا گراں قدر مقالہ گم ہو گیا۔ اس مقالے کی دوسری نقل علامہ کی ذاتی لائبریری میں تھی جو لوٹ لی گئی۔ اس طرح دونوں مسودے ضائع ہو گئے۔ آپ نے سیاسیات میں بھی ایم۔ اے کیا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی نے اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان ہجرت کی۔ مولانا انصاری یہاں بھی ان کے پرائیویٹ سیکریٹری رہے۔ اسی سال آپ کا سوانحی خاکہ "بائیو گرافیکل انسائیکلوپیڈیا" میں شامل کیا گیا۔ مولانا ۱۹۴۸ء میں سندھ انفارمیشن کے مدیر رہے۔

علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی نے ۱۹۴۹ء میں مولانا انصاری کو سلسلہ عالیہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، شاذلیہ میں بیعت کیا اور اپنے عالمی تبلیغی دورے میں ساتھ رکھا۔ اس سفر میں سری لنکا، ملائیشیا، انڈونیشیا، فلپائن، جاپان، کینیڈا، امریکہ، ٹرینیڈاڈ، ٹوبیگو، بمبئی، سرینام، برطانیہ، فرانس، اٹلی، مصر، شام، عراق اور سعودی عرب شامل رہے۔ ۱۹۵۲ء میں مولانا انصاری جمعیت الفلاح کراچی کے ترجمان "وائس آف اسلام" کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں لبنان میں منعقدہ ورلڈ کنونشن آف مسلم اینڈ کرسچینز میں شرکت کی۔ اسی سال علامہ صدیقی مدینہ منورہ میں وصال فرما گئے۔ ۳۰ نوری ۱۹۵۵ء کو حلقہ علیمیہ قادریہ کراچی نے مولانا کو علامہ صدیقی کا جانشین منتخب کیا۔ اس کے دو سال بعد آپ نے دنیا کے سترہ ممالک کا تبلیغی دورہ کیا۔ دوران سفر آپ نے سرینام میں نئی تعمیر شدہ جامع مسجد کا نماز جمعہ پڑھا کر افتتاح کیا۔ اس مسجد کا سنگ بنیاد علامہ صدیقی نے رکھا تھا۔

مولانا فضل الرحمٰن انصاری نے دنیا بھر میں اسلامی تبلیغی تحریک کو موثر انداز میں چلانے کی ضرورت کے تحت ۲۸ اگست ۱۹۵۱ء کو ایک تنظیم "ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشن" بنائی۔ اس تنظیم کے مقاصد میں اسلامی فکر کو اپنانا، اسلامی تعلیمات کو عالمی سطح پر پھیلانا، کارکنوں کی تربیت، فلاحی مراکز کا قیام، تحقیقی اداروں کو قائم کرنا، رسائل و جرائد کی اشاعت کا اہتمام، عالمی اجتماعات منعقد کرنا اور سب سے بڑھ کر ہر حالت میں اسلام کے اتحاد کے لئے کام کرنا ہے۔ آپ نے ۱۹۵۹ء میں مختلف ممالک کے طلباء کے لئے اسلام کے موضوع پر انگریزی میں مختصر اسباق کا اہتمام کیا۔ ان کورسز کے لئے جو ادارہ قائم ہوا اس کا نام "علیمیہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز" رکھا گیا۔ اس ادارے نے جولائی ۱۹۶۴ء سے منظم طور پر کام کرنا شروع کیا۔ مولانا اسی سال نیویارک میں ورلڈ پارلیمنٹ آف ریلیجن کے اجلاس میں شریک ہوئے۔

مولانا انصاری سینٹ جوزف کالج، سینٹ پیٹرک، اور کالج آف ہوم اکنامکس کے علاوہ کراچی یونیورسٹی

میں لیکچرار بھی رہے۔ ۱۹۶۳ء میں ان مصروفیات کے ساتھ مولانا نے متعدد ممالک کا دورہ کیا اور کراچی سے اردو اور گجراتی زبانوں میں ماہنامہ "منزل" جاری کیا۔ ۱۹۶۹ء میں آپ نے دنیا کا پانچواں دورہ کیا۔ اپنے اس سفر میں مولانا مشرق و جنوب کے ستر ہ ممالک گئے۔ ۱۹۷۰ء میں مولانا انصاری نے جنوبی افریقہ کا یادگار تبلیغی دورہ کیا۔ یہاں آپ نے وائٹ اسٹیلن بش یونیورسٹی' کیپ ٹاؤن میں بھی خطاب کیا۔ یہ جنوبی افریقہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ مولانا پہلے کالے شخص ہیں جنھوں نے وہاں نسلی امتیاز کے باوجود خطاب کیا اور سننے والوں پر اسلام کی عظمت کے گہرے نقوش چھوڑے۔ مولانا ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۹۷۳ء میں بحرِ ہند کے جزیرے سائیکلس کا دورہ کیا۔ اسی سال آپ نے انگریزی میں ایک معرکتہ الآرا کتاب "دی قرآنک فاؤنڈیشن اینڈ اسٹرکچر آف مسلم سوسائٹی" لکھی۔ یہ تاریخ ساز کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد نو سو صفحات سے زیادہ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر اشتیاق فرماتے ہیں۔ "اسلام کو سمجھنے کے لئے اب تک جو بہترین کوششیں کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے"۔ ممتاز دانشور اے کے بروہی فرماتے ہیں "علامہ اقبال کے انگریزی خطبات تشکیل جدید الٰہیات کے بعد اگر کوئی دوسری کتاب میری نظر میں آتی ہے' وہ یہ کتاب ہے"۔

۱۹۷۴ء میں مولانا فضل الرحمٰن دل اور پھیپھڑوں کی بیماری کی وجہ سے ۳ مئی ۱۹۷۴ء کو امراضِ قلب کے ہسپتال میں داخل کرائے گئے۔ ذیابیطس کی بھی شکایت پہلے سے تھی۔ ۳ جولائی کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ مولانا کے دونوں گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد احباب آپ کو گھر لے آئے تاکہ ہومیو پیتھک علاج سے کوشش کی جائے مگر وقتِ آخر آپہنچا تھا۔ ۱۱ جمادی الاول/ ۳ جون ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء پیر کے دن صبح سوا دس بجے آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ نمازِ جنازہ مولانا سید محمد کریم الجیلانی نے پڑھائی۔ تدفین المرکز الاسلامی شمالی ناظم آباد کراچی کے احاطہ میں ہوئی۔ آپ نے ایک فرزند مصطفیٰ فاضل انصاری (ایم۔ بی۔ اے جامعہ کراچی) اور چار صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔ آپ کی اہلیہ امت السبوح بھی ۲۰۰۰ء میں انتقال کر گئیں۔ ان کی تدفین بھی اسلامی مرکز کے احاطہ میں ہوئی۔ مولانا کا قطعۂ تاریخ حضرت راغب مراد آبادی نے کہا۔

تبلیغ سے بلند کی اسلام کی شان   تعلیم کی شمعیں بھی جلائیں ہر آن
پوچھے کوئی محرمانِ علمِ دیں سے   جو لالہ گرِ علمِ دیں تھے فضل الرحمٰن

حضرت صابر براری کا قطعۂ تاریخِ وصال یہ ہے:

جانشینِ علیم صدیقی   اہلِ حق میں خدا کی نعمت تھے
تھے وہ ماہر کئی زبانوں کے   فلسفی صاحبِ ذہانت تھے
ہے ہر اک کی زباں پہ یہ صابر   فضل الرحمٰن نیک سیرت تھے

مولانا انصاری کے کردار کی پختگی اور علمی صلاحیتوں کو ان کی زندگی میں ہی سراہا گیا۔ چند مضامین سے

اقتباسات دیکھئے:

ڈاکٹر سر ضیاء الدین: مولانا انصاری انگریزی، عربی بولنے اور لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ کردار کے معاملے میں ایک بہترین انسان ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر اسلامی ثقافت اور مغربی علوم کو یکجا کیا ہوا ہے۔

پروفیسر عبدالعزیز المیمانی: میں نے اپنی زندگی میں ان جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جو کہ ان کی برابری کر سکے۔ شرافت، کردار کی پختگی، علم کی محبت، اسلامی مسائل میں وقیع النظر، کسی کام کو کرنے کی صلاحیت اور ان جیسا حوصلہ پن میں نے کسی میں نہیں دیکھا۔ اپنی کم عمری کے باوجود انہوں نے اپنے سے زیادہ تجربہ کاروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

مولانا کے انتقال کے بعد انگریزی منظومات بھی کہی گئیں، جن میں شعراء نے اپنے قلبی جذبات کا اظہار کیا۔ صرف عبداللہ ایچ دیدات کی نظم دیکھئے:

DR. M. FAZL-UR- RAHMAN ANSARI

BY: ABDULLAH H. DEEDAT

FEW SONS OF ISLAM TRUE,
HAVE WALKED THE GLOBLE OF LATE :
AND ONE OF THEM WERE YOU,
SO SIMPLE, HUMBLE. BUT GREAT.
YOU TRAVELLED FROM PLACE TO PLACE
AND ALLAH'S NAME EXTOLL'D.
YOU CRAVED ONLY FOR HIS GRACE,
YOU WERE HIS SOLDIER SO BOLD
YOU CONCERN FOR MUSLIMS ALL
WAS SO DEEP AND TRUE.
"DECLINE NOT, NOR FOR FALL ! "
YOU URGED THEM THROUGH AND THROUGH.
YOU FED US QUR'ANIC LORE,
WE DRANK OF THE PROPHET'S WAY,
DEEP KNOWLEDGE YOU HAD IN STORE.
TO KEEP US IN ISLAMIC SWAY.
YOU HAVE LEFT US, DEAREST ONE
OUR HEARTS ARE HEAVY AND SAD.

YOUR DUTY YOU'VE TRULY DONE;
WITH YOU ALLAH IS GLAD
IF YOU THE YOUTH HAD FOUND
A GLANT IN EVERY FIELD.
YOU SHOWED THE DEEN SO SOUND,
AND TAUGHT THEM NOT TO YIELD,
WE SAY 'FORWELL' TO YOU
ON YOUR WAY TO GOD ON HIGH;
TO LIVE YOUR LIFE ANEW
WHAT FOR THEN SHOULD WE CRY?

مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری کی انگریزی/اردو تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآنِ حکیم کا عمرانی فلسفہ: مطبوعہ المرکز الاسلامی، عالمی جمعیت تبلیغ اسلام، کراچی

۲۔ اسلام اور مارکس ازم: مطبوعہ عالمی جمعیت تبلیغ اسلام، کراچی

3. THE BEACAN LIGHT : 1932
4. THE CHRISTIAN WORLD IN REVOLUTION : 1933
5. MUHAMMAD : THE GLORY OF THE AGES : 1935
6. ISLAM IN EUROPE AND AMERICA : 1935
7. MUSLIMS AND COMMUNISM : 1938
8. HUMANITY REBORN : 1938
9. ISLAM : 1938
10. TREND'S IN CHRISTIANITY : 1938
11. OUR FUTURE EDUCATIONAL PROGRAMME : 1944
12. ETHICS OF THE QUR'AN : 1946
13. MEANING OF PRAYER : 1946
14. ISLAMIC MORAL AND METAPHSICAL PHILOSPHY.
15. COMMUNIST CHALLENGE TO ISLAM : 1951
16. ISLAM VERSUS MARXIM : 1954
17. ISLAM AND CHRISTIANITY IN THE MODERN WORLD : 1944
18. WHAT IS ISLAM? : 1953
19. FOUNDATIONS OF FAITH.

20. BEYOND DEATH.
21. THE QUR'AN FOUNDATIONS AND STRUCTURE OF MUSLIM SOCIETY : 1973
22. WHICH RELIGION.
23. ISLAM AND WESTERN CIVILISATION.
24. PHILOSOPHY OF WORSHIP IN ISLAM.
25. THROUGH SCIENCE AND PHILOSOPHY TO RELIGION

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مولانا سید فخرالدین احمد

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخرالدین احمد کے آباؤاجداد میں سید قطب اور سید عالم اپنے دوسرے دو بھائیوں کے ساتھ شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے دہلی آئے تھے۔ یہ حضرات اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ شاہجہاں نے ان کے درس وتدریس کے لئے ہاپوڑ میں ایک مدرسہ تعمیر کرادیا تھا۔ سید عالم کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے حضرت امام حسین پر منتہی ہوتا ہے۔

مولانا سید فخرالدین احمد کا وطن مالوف ہاپوڑ ضلع میرٹھ ہے۔ مولانا موصوف کی جو سند خصوصی طلباء کو دی جاتی تھی اس میں یہ عبارت درج ہوتی تھی کہ مولانا مسلکاً دیوبندی ہیں اور وطناً پہلے ہاپوڑی پھر مراد آبادی ہیں۔ ۱۳۰۷ھ یعنی ۱۸۸۹ء میں آپ کی ولادت اجمیر میں ہوئی، جہاں آپ کے دادا سید عبدالکریم محکمہ پولس میں تھانہ دار تھے۔ چار سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ قرآن مجید والدہ ماجدہ سے پڑھا۔ فارسی کی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی۔ عمر کے بارہویں سال اپنے خاندان کے بزرگ اور عالم مولانا خالد سے عربی صرف ونحو شروع کی۔ اسی دوران آپ کے والد کو اپنے آبائی مدرسے کے احیاء کا خیال پیدا ہوا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہوگیا تھا چند سال اس مدرسہ میں تعلیم پانے کے بعد آپ کو گلاؤٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں بھیج دیا گیا۔ وہاں آپ نے مولانا ماجد علی سے مختلف کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں دارالعلوم تشریف لے گئے۔ حضرت شیخ الہند نے امتحان داخلہ لیا، جس میں امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ آپ فرماتے ہیں "میرا امتحان داخلہ حضرت شیخ الہند نے لیا تھا اور میں نے ہدایہ وغیرہ میں امتحان دیا تھا جو میری پڑھی ہوئی کتابیں تھیں۔ حضرت شیخ الہند نے مشکوٰۃ شریف وغیرہ میں داخل فرمالیا تھا اور وہاں مشکوٰۃ شریف وغیرہ سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم حاصل کی تھی"۔ مولانا نے حضرت شیخ الہند کی ہدایت کے مطابق ایک سال کے بجائے دو سالوں میں دورہ حدیث کی تکمیل کی تھی۔ آپ نے حضرت شیخ الہند کے ہاں بخاری شریف، ترمذی شریف اور ابو داؤد شریف مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری کے ہاں مسلم شریف اور علامہ انور شاہ کشمیری کے ہاں ہدایہ اور موطاء پڑھیں۔ آپ دارالعلوم کے زمانہ طالب علمی ہی میں طلباء کو معقولات کی کتابیں پڑھانے لگے تھے۔

آپ ۱۹۱۰ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوگئے۔ آپ نے یہ خدمت بلامعاوضہ انجام دی۔ اس زمانے میں مراد آباد کے مدرسہ شاہی کے مہتمم نے حضرت شیخ الہند اور مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا حافظ احمد صاحب سے ایک مدرس کی درخواست کی تو دونوں بزرگوں نے مولانا فخرالدین احمد صاحب کا انتخاب فرمایا۔ اگرچہ آپ دارالعلوم میں ہی تعلیم دینا چاہتے تھے مگر اکابر دارالعلوم کے انتخاب کے مطابق شوال ۱۳۲۹ھ میں آپ مدرسہ شاہی مراد آباد پہنچے جہاں تقریباً ۴۸ سال قیام رہا۔ تقریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں لاتعداد طلباء حدیث نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔

مولانا سید فخرالدین احمد ممتاز علماء حضرت شیخ الہند اور علامہ انور شاہ کشمیری کے خاص تلامذہ میں سے تھے اس لئے آپ کے درسِ حدیث میں دونوں جلیل القدر استادوں کے رنگ کی آمیزش پائی جاتی تھی۔ چنانچہ آپ کا درسِ بخاری نہایت مبسوط اور مفصل ہوتا تھا جس میں حدیث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی۔ سید محبوب علی رضوی نے لکھا ہے "آپ فقہاء کے مذاہب کو بیان کرنے کے بعد احناف کے فقہی مسلک کی تائید و ترجیح کی وضاحت میں ایسے پرزور دلائل پیش فرماتے تھے جس کے بعد سامع کے ذہن میں کوئی ادنیٰ خلجان باقی نہیں رہتا تھا۔ آپ اپنے درس میں صحیح بخاری کی مختلف شروع کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کے علوم و معارف بھی جابجا پیش فرماتے تھے۔ درسِ حدیث میں آپ کی تقریر مبسوط اور مفصل ہونے کے علاوہ سہل اور دل نشین ہوتی تھی۔ اس لئے کم استعداد کے طلباء کو بھی استفادے کا پورا پورا موقع مل جاتا تھا اندازِ بیان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہوتا تھا جس میں آپ کے جمالِ ظاہری کی تمام خصوصیات بدرجہ اُتم پائی جاتی تھیں۔ آپ کے درسِ بخاری کو شہرت تام اور قبول حاصل تھا۔ بلاشبہ اپنے دور میں وہ یگانہ روزگار عالم اور درسِ حدیث کے بے مثل استاد تھے اور طلباء ان سے تلمذ پر فخر محسوس کرتے تھے۔ مولانا بدرالاسلام نے لکھا ہے کہ میں نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریرات میں دیکھا ہے کہ "ہم نے اپنی سیاحت میں حضرت شیخ الہند اور ان کے اکابر سے زیادہ عقل مند فقہاء اسلامی ممالک میں نہیں دیکھے"۔

۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا مدنی کی وفات کے بعد دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے دارالعلوم دیوبند کے لئے آپ کا انتخاب کیا۔ حضرت مولانا مدنی نے مرضِ وفات میں باصرار آپ کو مراد آباد سے بلا کر اپنی جگہ صحیح بخاری کے درس کے لئے مامور کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ حضرت مولانا کی گرفتاری اور رخصت کے زمانے میں آپ دارالعلوم میں صحیح بخاری کا درس دے چکے تھے۔ مولانا فخرالدین احمد صاحب کی عمر کے آخری پندرہ سال دیوبند میں تدریس بخاری شریف میں گزرے۔ ۱۹۷۰ء میں پونے تین سو کے قریب طلباء آپ کے درسِ حدیث میں شریک تھے۔ کم و بیش دورہ حدیث کے طلباء کی یہی تعداد ہر سال رہتی تھی۔ حضرت شیخ الاسلام دارالعلوم میں شیخ الحدیث بھی تھے اور صدر مدرس بھی لیکن آپ کی وفات کے بعد عہدوں کی تقسیم ہوگئی۔ مولانا فخرالدین احمد صاحب تو شیخ الحدیث ہوگئے تھے اور علامہ بلیاوی صدر مدرس۔ علامہ بلیاوی کی وفات کے بعد مولانا فخرالدین احمد صدر مدرس بھی ہوئے۔

تعلیمی مشاغل کے علاوہ ملکی سیاست سے بھی آپ کا تحریکِ خلافت کے زمانے سے تعلق رہا۔ اس کے نتیجے میں قید و بند کا بھی سامنا کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی کی جمیعت علماء ہند کی صدارت کے زمانے دو مرتبہ نائب صدر رہے۔ بعد ازاں مسندِ صدارت پر فائز ہوئے اور تادمِ واپسیں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ مراد آباد کے جیل میں مولانا نے صرف بیس یوم میں قرآن پاک بھی حفظ کرلیا تھا۔

آخر عمر میں جب صحت جواب دے گئی تو بغرض علاج و تبدیلی آب و ہوا آپ کو مراد آباد لے جایا گیا مگر وقت موعود آچکا تھا۔ مراد آباد میں کچھ عرصہ بیمار رہ کر ۲۰ صفر ۱۳۹۲ھ مطابق ۵ اپریل ۱۹۷۲ء کو نصف شب کے بعد آپ نے انتقال فرمایا۔ اطلاع ملنے پر دارالعلوم اور ملک کے دوسرے حصوں سے بہت سے حضرات مراد آباد پہنچے۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ بعد دوپہر علم و فضل کا یہ آفتاب جہان تاب سرزمینِ مراد آباد میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

آپ کی وفات کے وقت آپ کی اہلیہ اور دو صاحبزادے مولانا اختر اسلام اور حکیم معین الدین اور پانچ صاحبزادیاں بقیدِ حیات تھیں۔

مولانا فخرالدین احمد کے اوقات زیادہ تر تعلیم اور انتظامات پر صرف ہوئے۔ طلبہ کی تربیت پر ہمیشہ توجہ مرکوز رکھی اس لئے تصنیف و تالیف کے لئے زیادہ وقت نہ نکال سکے۔ صرف چند کتب کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ "اول القول الفصیح فیمایتعلق نبضد ابواب الصحیح" آپ کی اہم عربی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں بخاری شریف کے ابواب کا آپس میں ربط بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ ایک اور کتاب اربعین چہل حدیث بھی شائع ہوئی۔ ایضاح البخاری بھی آپ کی تصنیف کردہ ہے۔ یہ بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ کئی کتب کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا کہ وہ شائع ہوئیں یا نہیں۔

تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد دوم ص ۲۱۴ تا ۲۱۵

ماہنامہ بنیات کراچی جمادی الثانیہ ۹۲ ۱۳ھ

قدرت نقوی

ممتاز ماہرِ لسانیات' معتبر نقاد' مشہور محقق اور قابلِ ذکر شاعر سید شجاعت علی نقوی اپنے ادبی نام قدرت نقوی کے حوالے سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ کی ولادت سید حسن نقوی ابن سید شجاع علی نقوی کے گھر ۱۰ نومبر ۱۹۲۵ء کو عبداللہ پور ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد منصبیہ عربی کالج' میرٹھ میں تعلیم حاصل کر کے فارسی کا اعلیٰ امتحان "کامل" الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا۔ مختلف زبانوں سے دلچسپی شروع سے ہی تھی اس لئے اپنی ذاتی کوششوں سے انگریزی' ہندی اور سنسکرت زبانوں میں دسترس حاصل کی' ان کے علاوہ دیگر بولیاں لسانیات کے سلسلے میں شنید سے حاصل کر کے ان کے اصول اور خصوصیات ذہن نشیں کیں۔

قدرت نقوی صاحب ۷ ،۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے اور ملتان میں رہائش اختیار کی۔ وہاں سے ۱۹۶۹ء میں کراچی آ گئے۔ یہاں اردو بورڈ سے منسلک ہو گئے۔ اس ادارے سے ۹ نومبر ۱۹۸۵ء میں سبکدوشی حاصل کی۔ اس وقت اٹھارویں گریڈ میں تھے۔ لسانیات میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے بعد آپ کا نام آتا ہے۔

سید قدرت نقوی صاحب نے زمانہ طالب علمی میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور دس بارہ سال کی عمر سے ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں "آئینہ" میرٹھ میں آپ کی پہلی تخلیق چھپی۔ یہ افسانہ تھا۔ آپ نے نظم و نثر میں یادگار خدمات انجام دی ہیں۔ غالب پر بھی آپ کا کام کافی وقیع ہے۔ غالب سے متعلق آپ کی چھ کتب گلِ رعنا' غالب آگہی' ہنگامہ دل آشوب' غالب کون ہے' نسخۂ شیرانی و دیگر مقالات اور عظمتِ غالب شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب رقعات و اشعار زیر ترتیب ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ غالب پر جو کام ہونا چاہئے' اس کا آدھا بھی ابھی تک نہیں ہوا ہے۔

قدرت نقوی صاحب کے تحقیقی کام کی نوعیت ہمہ جہت ہے۔ آپ کی تحقیق کا اصل موضوع لسانیات ہے۔ آپ نے تحقیق کے بعض ایسے موضوعات پر کام کیا ہے جن پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ تحقیق و تنقید' لسانیات اور فنِ شاعری پر آپ کی قابلِ قدر تصانیف موجود ہیں' جن میں لسانیات سے متعلق رانی کیتکی' لسانی مقالات جلد اول و دوم منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جلد سوم اور مطالعہ عبدالحق زیرِ طبع ہیں۔ قواعد سے متعلق کتب اساسِ اردو' نسیم اردو گرامر' کراؤن اردو گرامر (تین جلدیں)' ذخیرہ مصادر' اردو قواعد (حواشی) اور فنِ عروض سے متعلق کتب عروضی مقالات جلد اول و دوم شائع ہو گئی ہیں۔ بحرالفصاحت تین جلدوں میں زیرِ طبع ہے۔ سوانح نگاری میں بھی قدرت نقوی صاحب کی جن کتابوں نے علمی حلقوں میں پذیرائی حاصل کی ان میں ولی کامل' سیرت النبی' کربلا اور اولیائے اسلام نمایاں ہیں۔ لغت' علمِ بیان و علمِ معانی اور دیگر موضوعات پر آپ کی تصانیف ہندی اردو لغت' اطرافِ لغت' اصطلاحات معانی و بیان' بحرالفصاحت حصہ چہارم و پنجم' سب رس (ملا وجہی) اور "مسلم لیگ: قائد

اعظم اور اردو" ہیں جن میں سے کئی طباعت کے مرحلے میں ہیں۔ آپ کی یہ تمام کتب انجمن ترقی اردو کراچی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور اور مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کی ہیں۔ بھارت میں تخلیق کار پبلشرز نے بھی ایک کتاب چھاپی ہے۔ قدرت نقوی صاحب کے علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور لسانی مقالات و مضامین کی تعداد بھی ڈھائی سو سے زائد ہے۔ مختلف حضرات کی لکھی ہوئی پانچ کتابیں ایسی ہیں جو کلیتہً قدرت نقوی صاحب کے مقالات پر مشتمل ہیں۔ پچاس سے زائد کتابوں کے مسودے اور زیرِ ترتیب کتب زیرِ قلم ہیں جن کی اشاعت جلد متوقع ہے۔ مختلف مصنفین کی بارہ کتب میں آپ کے مقالات اور برصغیر کے تیس سے زائد رسائل میں آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ دہلی سے چھپنے والی کتاب "گھٹتے بڑھتے سائے" کا انتساب بھی قدرت نقوی کے نام ہے۔

قدرت نقوی صاحب شاعر کی حیثیت سے بھی نمایاں ہیں۔ آپ نے اردو، فارسی اور ہندی کی تقریباً تمام اصناف میں اپنی فکرِ رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔ قصائد، سلام اور غزل کے علاوہ اصلی وزن میں تقریباً پانچ سو دوہے لکھے ہیں۔ "پنج کھنیہ" دوہے آپ کی اختراع ہے۔ اسی طرح "پاک ہائیکو" بھی ہے۔ ہائیکو جاپانی صنف سخن ہے جو اردو میں بھی مقبول ہوئی ہے۔ آپ نے دو سو کے قریب ہائیکو بھی لکھے ہیں۔ واضح رہے کہ "پنج کھنیہ" اور "پاک ہائیکو" (اختراع صنف) ادب میں اضافہ ہیں۔ قصائد، حمد و نعت، منقبت، غزلیات اور دوہوں کے مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔ قدرت نقوی صاحب کے سرمایۂ سخن میں فارسی کلام بھی خاصی بڑی تعداد میں موجود ہے جسے یکجا کیا جا رہا ہے۔ آپ کے کلام میں زبان و بیان کی ہنرمندیاں بھی ہیں اور داخلی و خارجی احساسات و مشاہدات کا عکس بھی۔ سبک لفظیات اور حسنِ ترنم بحریں بھی قاری کو متوجہ کرتی ہیں۔ شعریات میں یہ اسلوب آپ کی فنی دسترس کا آئینہ دار ہے۔

قدرت نقوی صاحب کی شادی ۷ ۱۹۴۲ء میں میرٹھ میں سید صغیر حسین زیدی (سب انسپکٹر پولیس) کی صاحبزادی سیدہ خاتون سے ہوئی۔ دو بیٹے شرافت علی نقوی اور شباہت علی نقوی ہیں۔ اول الذکر شاعر بھی ہیں اور پروڈیوسر بھی۔ سات بیٹیاں ہیں اور سب اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہیں۔ مسلسل بیماری اور کمزوری کے باوجود اب بھی قلم سے وابستگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ کراچی میں مقیم ہیں۔ نمونہ کلام:

حمد خدائے ذوالجلال

چند اشعار

تابشِ نورِ ازل، جذبۂ اظہارِ جمال ۔۔۔ محوِ آرائشِ جلوہ، پئے اسرارِ کمال

وصف در وصف نہاں راز، حقیقت تمثال ۔۔۔ لطف در لطف عیاں جلوہ بصد رنگِ جمال

تابِ انساں، بہ درِ ناز، جبیں سائی محال ۔۔۔ نور، یک شعلۂ جوالہ، بہر سو قتال

لطف ہے حد، بے مخلوق، رہے شانِ کمال — آن در آن، نزولِ نعم و مال منال
ہر نعماتِ عموی، کہ نہ قدغن نہ سوال — از فلک تا بہ زمیں، لطفِ عمیم و افضال
واحد ہے چوں و چرا، دورز تکرارِ مقال — ہر اوصاف، بشر، عاجز و واماندہ، قال
عقل واماندہ، یہ اسرارِ خدائے متعال — یک وسیلہ، بنے عرفان، یہ ذکر و اشغال
بارشِ نورِ الٰہی یہ کہیں گاہِ خیال — لمعۂ شوق، یہ اذہانِ سلیم و اقبال
بارشِ عقلِ بشر، کشفِ رموزِ اشکال — معرفت، بادۂ پرکیف و صفا، حسن مآل

غزل

وسعتِ جنوں نے چاک کیے پیرہن تمام — حدِ شعور، اصل حقیقت برہنگی
زلفِ رسا، کمندِ افکارِ دلِ جہاں — رخسارِ غازہ، حسن کو تمکینِ بے خودی
بادہ، اظہارِ حقیقت ہے بندگی — انکارِ سجدہ، ذات کا عرفان و آگہی
حد فرد تیزیٔ تجلی و تیرگی — حد جنوں میں رہتی ہے ہر وقت روشنی
ہے دست بستہ سامنے میرے یہ کائنات — بخشوں جسے میں چاہوں ہمیشہ کی زندگی

گیت کا ہر بول تیکھا چاہیے — راگ کی تانوں میں کوندا چاہیے
ہوت آنکھوں میں نکھرتا روپ ہے — ابھرے جوبن کو سہارا چاہیے
مد بھری آنکھوں میں تیھے کی دھنک — چھب نرالی اس کی دیکھا چاہیے
اس کے منڈپ میں بیٹھا ہوں اداس — جگمگاتا روپ کوندا چاہیے
پی کے قدرت سے پوچھو تم کبھی — موہنی چھب والا تم سا چاہیے
کلی آنکھ سانجھ سویرے — جھیل کنول برکھا ڈیرے
آشا من کی آگ میں بھن کر — روپ نکھارے، روپ بکھیرے
جیسی کرنی ویسی بھرنی — سکھ میں رچے سانجھ گھیرے
کل جگ باسی سارے کھاگی — راج رچے ہیں باگ بکھیرے
سانجھ سکارے روپ نکھارے — من ہرنی قدرت من ہیرے

دوہے

الفت ہی کام ہے اپنا، نام اپنا درویش — دھن دولت کے بیوپارو، موت بھی ہے در پیش
کوکل کو، کے بگیا میں، من میں اٹھے ہوک — برہا ساون آگئی، دیوے انگ انگ پھونک

سندر ناری لجباری' گان سے گاہے گات — من میں ڈولیں آشائیں' منہ سے نکلے نا بات
لاج کی سرخی گالوں پہ' آنکھیں رس برسائیں — جوبن کی شان نرالی' ہونٹ چپے مسکائیں
ہم سید چپا مارے' جگ میں بے آرام — حق پہ جان کو واریں' تیغ کے بہرام

چو کھنبہ دوہے

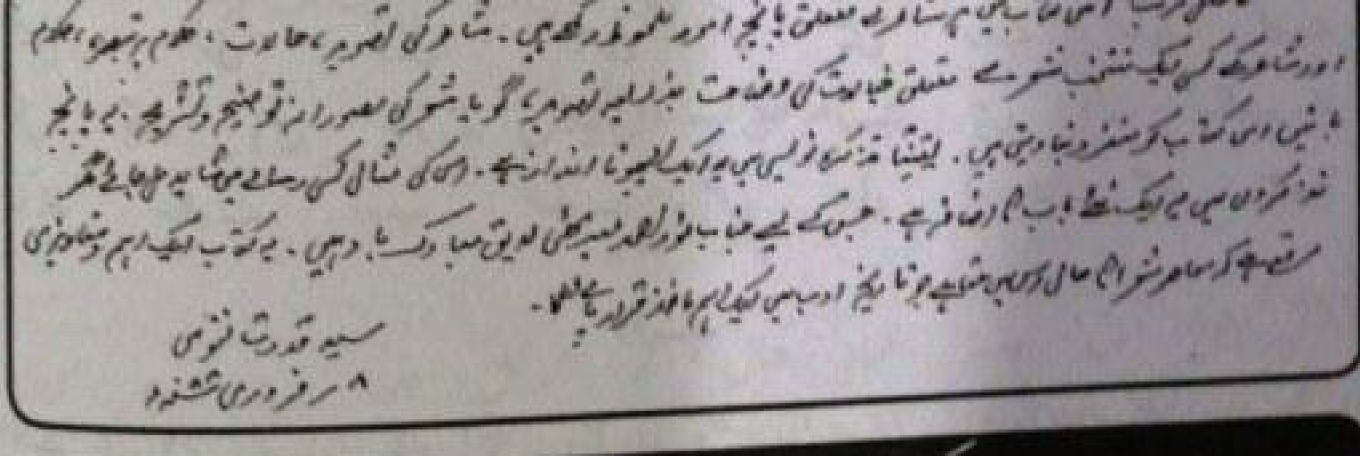
ہم سید چپا مارے' ہیں ست کے پجارے
تن من دھن ست پہ واریں' جگ میں ہیں دکھیارے
کھانڈوں سرور کھیارے

جب وہ چنچل تان اڑائے' من جھولے لہرائے
اک ہلچل سی مچ جائے' تڑپن سی لگ جائے دیپک آگ لگائے
بے کل' کل نہ پائے

لجباری اوٹ سے جھانکے' میں دیکھوں چھپ جائے
پردے میں چھپ گھپ جائے' میں تڑپوں وہ تڑپائے
دیکھے اور مسکائے

فارسی کلام

از دانش افرنگی' احساسِ زیاں خیزد — یک بہرِ سکون دل' صد مرگ جہاں خیزد
یک ذرہ بصد قوت تخریبی و تعمیری — از شوق ہمہ گیری' تخریبِ نہاں خیزد
تعمیر و ترقی را تعلیم کی شیوہ — آں شیوہ کہ افسونش' تخریب فشاں خیزد



عکسِ تحریر: سید قدرت نقوی

ہر عشوہ' بے باکش' غارت گرِ تسکینم　　از ناز پُر افسونش' تارِ رگ جاں خیزد
آں شوخ نگار من' باناز و ادا قدرت　　باشد بکنار آید' گر بختِ جواں خیزد

نظم : موت کا قافلہ

دھڑکنیں ہیں مہکتے دلوں میں
نرگسی آنکھوں سے سیلاب امنڈے
بکھرے گیسوؤں میں غمگین چہرے
منہ اندھیرے
بے بسی بے کسی کے سہارے
لڑکھڑاتے چلے جا رہے ہیں
موت ہے منتظر کب سے ان کی

کرار، پروفیسر کرار حسین

ممتاز دانشور پروفیسر کرار حسین ماہر تعلیم بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ آپ ہماری علمی' ادبی' تدریسی اور معاشرتی زندگی کا ایک روایتی تہذیبی سرمایہ ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۱۱ء میں کوٹہ' راجپوتانہ میں ہوئی۔ آبائی وطن ذیابائی ضلع بلند شہر ہے۔ ننھیال کا تعلق ہاپوڑ ضلع میرٹھ سے ہے۔ آپ کے والد مہربان علی محکمہ جنگی میں ناظر تھے۔ پروفیسر موصوف نے ابتدائی تعلیم کے بعد سینٹ جانس کالج آگرہ سے گریجویشن کیا اور میرٹھ کالج سے انگریزی اور اردو میں ایم۔ اے کی اسناد حاصل کیں۔ لاء کی سند بھی اسی کالج سے حاصل کی۔ میرٹھ کالج میں ہی ۱۹۳۳ء میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی ہجرت کی اور اسلامیہ کالج' جامعہ ملیہ ملیر وغیرہ میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور اپنا عہدِ تدریس مکمل کرنے کے بعد اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی کے ڈائریکٹر ہوئے۔

پروفیسر کرار حسین پیدا ہی علم و ادب کے فروغ کے لئے ہوئے۔ آپ نے علمی شعبہ میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ دین و مذہب اور فلسفہ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ میرٹھ کالج میں درس و تدریس کے دوران آپ نے انگریزی ادب سے متعلق نصابی کتب تحریر کیں۔ آپ کی کئی اور تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں۔ امریکہ' فرانس' برطانیہ' جاپان اور ایران وغیرہ میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی سرکاری سطح پر نمائندگی کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔

آپ کی شادی ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ چار صاحبزادے جوہر حسین' حیدر کرار' تاج حیدر' اور شبیہہ حیدر ہیں۔ چار صاحبزادیاں شائستہ زیدی' صالحہ حسن' صادقہ صلاح الدین اور طاہرہ عابد ہیں۔ تاج حیدر پاکستان کی سینیٹ کے ممبر ہیں اور شائستہ زیدی جامعہ کراچی میں پڑھاتی ہیں اور شاعرہ بھی ہیں۔

پروفیسر کرار حسین مشرقی تہذیب کا نمونہ ہیں۔ خوش اخلاقی' ملنساری اور انکساری آپ کے مزاج کا حصہ ہیں۔ تکبرِ علمی کا شائبہ بھی آپ کی طبیعت میں نہیں ہے۔ اندازِ خطابت بہت سادہ ہوتا ہے مگر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ بہت آسانی سے چھوٹے چھوٹے جملوں میں کہہ جاتے ہیں۔ آپ کے لاتعداد شاگرد مختلف شعبوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی ہمہ گیریت کا ایک بڑا حلقہ معترف ہے۔

موصوف نے تقریباً تمام اصناف میں شعر کہے ہیں لیکن بحیثیت شاعر زیادہ منظرِ عام پر نہیں آئے۔ آپ کا عطا کردہ کلام پیش کر رہا ہوں۔

نعت

رازداں کہتا ہے خود کو وہ جو خود ہی راز ہے
یہ بھی اس کی رازداری کا بلیغ انداز ہے
وہ ہی اول وہ ہی آخر وہ ہی رہبر وہ ہی راہ

اس بن اس ارض و سما میں اور کیا اعجاز ہے

لے کے آیا ہے صبوحی ساقیِ بزمِ الست
دیکھ لو رندو! وہی قد ہے وہی انداز ہے
معرفت کی حدِّ آخر ماعرفاک کا مقام
من رآہ فی معرفت کا نقطہ آغاز ہے
اے خطیبِ من رانی تجھ پہ یہ آنکھیں نثار
اب وہ آنکھیں دے کہ جن سے یہ خطابِ ناز ہے

اک توجہ خاص پائی جس نے جب دیکھا تجھے
گویا تیری اک نظر ہر قلب کی غماز ہے
ایک منزل پر درِ توبہ بھی ہوجاتا ہے بند
وہ درِ رحمت ہے تیرا جو ہمیشہ باز ہے
نام تیرا علم و قدرت کے خزانے کا امیں
اور زباں میری جو ظلم و جہل کی غماز ہے
اس تجلی کی جبل برداشت لاسکتے نہیں
اسمِ احمدؐ قلبِ اللہُ احد کا راز ہے
نام تیرا لوں زباں سے اور قائم رہ سکوں
یا محمدؐ یہ بھی رحمت کا تری اعجاز ہے

سلام

مولا! ترے کرم پہ دل و جاں نثار ہے
مُجھ پہ اک گلشنِ جاں کی بہار ہے
پلکوں سے جھاڑ لوں خس و خاشاک دشت کے
سنتا ہوں اس طرف گذرِ شہریار ہے
ویران دل کے دشت ہیں ویراں ہے کربلا
گیتی میں ظلم و حرص و حسد کا فشار ہے
ذرے ہیں شہوتوں کے بگولوں میں منتشر
اے ابرِ نوبہار ترا انتظار ہے

کعبہ سے چل پڑا ہے مدینہ کا کارواں
وہ کارواں جو غیرتِ حق کی پکار ہے
عزمِ حسینؓ ہے جرسِ کاروانِ دیں
اس کارواں کی دستِ خدا میں مہار ہے

ہوتی ہیں طے رضا و مشیت کی وادیاں
اللہ کیسا جبر ہے، کیا اختیار ہے

اٹھتے ہیں ہر قدم پہ قیامت کے زلزلے
قطب زمیں کی طرح قدم استوار ہے

کس شان سے محاسبہ کرنے چلا ہے صبر
دنیائے ظلم منتظر و بے اقتدار ہے

نفسانیت کی ختم ہوئیں چیرہ دستیاں
چہرے پہ دینِ حق کے غضب کا نکھار ہے

یہ دشتِ کربلا ہے کہ دامانِ فاطمہؑ
خونِ شہید باغِ جناں کا سنگھار ہے

مرثیہ

کربلا، کربلا

(جزو اوّل کے چند بند)

(۱)

کربلا! کربلا! ارضِ کرب و بلا، مہرِ صدق و صفا کے سپہرِ بریں
رازِ ہائے فنا و بقا کی امیں، خاتمِ موت پر زندگی کا نگیں
با ادب! با ادب! میرے دل کی تڑپ دیکھ، پھر دیکھ اے میری چشمِ یقیں
حق آیات بکھری ہوئی ہیں یہاں، عرشِ اعظم کے تارے ہیں ذرے نہیں
مہبطِ انبیاء، قبلۂ اولیاء، سجدہ گاہِ ملائک ہے یہ سرزمیں

(۲)

مل گئے آ کے باہم ازل اور ابد، وقت اک لمحۂ جاوداں ہو گیا
رازِ قرآنِ ہستی میں جو تھا نہاں، نقطہ آنکھوں میں عیاں ہو گیا
ساری دنیا کی امیدیں مٹ گئیں، ایک دل کا یقیں کامراں ہو گیا
اللہ! اللہ! اک گوشۂ بے نشاں، شرق اور غرب سے لامکاں ہو گیا
حرفِ حق امرِ کن کی چمک بن گیا، پیکرِ آدمیت کی جاں ہو گیا

(۳)

جیسے سرسبز نعمان کے بن سے خود بخود دشتِ ظلمت میں لگ جائے آگ
جاگے ماحول سب جلوۂ نور میں، پیچ و بل کھا کے اندھیائیں ظلمت کے ناگ
بادلوں پر بجے بادوباراں کا رقص، آسماں پر گرجتے ہوں گھنگھور راگ
بجلیوں کے دلوں سے نگاہوں سے لاگ، کون ہے بڑھ کے تھامے جو طوفاں کی باگ
اے قیامت! مبارک سلامت تجھے، موت کا جشن اور زندگی کا سہاگ

(۴)

مرحبا تجھ کو انسانیت کے شہید، مرحبا! مرحبا! شاہِ یزداں شکار
تیرے گھوڑے کی ٹاپوں میں ہے انقلاب، تیری آنکھوں میں آباد جانِ بہار

منزلیں سینکڑوں لے کے آغوش میں، اٹھ رہا ہے تیرے کارواں کا غبار
عزمِ مختار ہے کارواں کا جرس، دستِ جبار میں کارواں کی مہار

وادیٔ صبر و تسلیم کے شہسوار، اللہ! اللہ یہ جبر، یہ اختیار

حضرت میاں کریم الدین شاہؒ

تحصیل و ضلع میرٹھ کا قصبہ انبہولی مسلم تہذیب و تمدن کا ایک روایتی قصبہ ہے۔ اسے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ بہت سے بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ یہاں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان بزرگ ہستیوں میں پٹھان خاندان کے ساتوں بھائیوں کا ذکر اہم ہے جو سب کے سب صاحب کشف و کرامت ولی اللہ تھے۔ یہ بزرگ پیر فتح علی خانؒ، پیر گھاسی خانؒ، پیر شاہ عنایت خانؒ، پیر کالے خانؒ، پیر بھورے خانؒ، بڑے والے پیر اور پیر امجد علی خانؒ کے ناموں سے مشہور و معروف ہیں۔ دیگر بزرگوں میں شیخ ولی محمدؒ، شاہ لطف اللہ حقؒ، یوسف شاہ عرف شاہ ولایتؒ، شیخ عنایت اللہ شاہؒ کے علاوہ حضرت میاں کریم الدین شاہؒ بہت نمایاں ہیں۔

شیخ المشائخ حضرت مولوی حافظ میاں کریم الدین شاہؒ کا نسبی تعلق شیخ قلندر بخش مرحوم کے بھائی شیخ بشارت علی مرحوم کے خاندان سے ہے۔ دستیاب تفصیل کے مطابق کریم الدین شاہ بن پیر علی بن بشارت علی بن نیاز علی بن برکت اللہ بن مراد علی خاں داماد شیخ لعل مرحوم مورث اعلیٰ انبہولی ہے۔ میاں کریم الدین شاہ کے ایک بھائی نظام الدین تھے۔ شاہ صاحب نے تمام عمر شادی نہیں کی۔

حضرت میاں کریم الدین شاہ کا روحانی تعلق سلسلہ عالیہ قادریہ سے تھا۔ آپ نے مذہبی تعلیم رامپور میں حاصل کی جہاں آپ کو دستار فضیلت اور شرف بیعت حضرت حاجی میاں محمد عاشق صاحبؒ سے حاصل ہوا۔ آپ کو حضرت بوعلی قلندر پانی پتی، حضرت شاہ پیر میرٹھی، حضرت شیخ عنایت اللہ اور حضرت میاں روشن علی سے بھی فیض حاصل ہوا۔ آپ نے کچھ عرصہ بمبئی میں قیام کیا اور پھر تقریباً چوبیس سال مکہ مکرمہ میں رہے۔ اس کے بعد عالم مجذوبیت میں اپنے وطن انبہولی واپس آ گئے۔ آپ کے معتقدین انبہولی اور اس کے قرب و جوار کے علاوہ عرب میں بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ میاں صاحب نے اپنے مریدین میں سے صوفی امام الدینؒ (م: ۱۹۵۳ء)، حضرت محمد قاسم اور حاجی محمد ابراہیم کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔

مجذوبیت کا عالم طاری رہنے کی وجہ سے آپ کا مزاج متوازن نہ رہا تھا۔ ایک لوٹا ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ آپ حافظ اور مولوی ہونے کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ شجرہ سلسلہ عالیہ قادریہ مرتبہ منشی مقصود احمد میں آپ کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

مولوی حافظ کریم الدین شاہ   موضع انبہولی میں ہیں جلوہ نما
حج بیت اللہ سے روشن ضمیر   اللہ اللہ آپ ہیں کیسے فقیر
آپ کے گزرے وہاں چوبیس سال   فیض خالق سے ہوا حاصل کمال

آپ ہیں روشن دل و روشن نگاہ　　راہ پائیں آپ سے گم گشتہ راہ

آپ کا در ہے وہ مشہور انام　　فیض جس سے پا رہے ہیں خاص وعام

ہیں میاں عاشق محمد ان کے پیر　　جو ہوئے اس رہ میں ان کے دستگیر

ہاتھ میں ہاتھ ان کا ایسے پیر کے　　کل جہاں واقف ہے جن کے نام سے

انچولی میں شاہ صاحب کا وصال ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ تقریباً اسی (۸۰) سال کی عمر پائی۔ جلوس جنازہ میں شریک افراد کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ قصبہ انچولی کے تمام راستوں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ انچولی کے جنوب میں بخشی والے باغ کے قریب واقع قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔ قطعہ تاریخ وصال منشی قمرالدین قمر نے لکھا:

حسرتا حضرت کریم الدین شاہ

کر گئے دنیائے دوں سے انتقال

مست، مجذوب و قلندر، قادری

حال ان کا تھا عجب بے قیل وقال

جو کہا وہ ہو گیا، تھے واقعی

واصلِ ذاتِ خدائے ذوالجلال

جو گیا خدمت میں وہ پھولا پھلا

سینکڑوں ان کے کرم سے ہیں نہال

لکھ قمر اب یہی الہامِ غیب

شیخ کامل عصر تاریخ وصال

۱۳۹۱ھ

بہ شکریہ: شیخ رؤف الحسن

==========

نواب مبارک علی خاں

نواب مبارک علی خاں بن فرحت اندیش خاں ۱۸۰۳ء میں جب انگریز عملداری میرٹھ میں آئی، بیس دن کے تھے۔ آغازِ شعور سے ہی ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ تحصیلداری و سررشتہ داری و نیابت میر منشی گری نواب گورنر جنرل بہادر لارڈ اکلنڈ پر معزز و ممتاز رہے۔ بعد میں محکمہ پرمٹ میں ایسسٹینٹ ہوئے اور محکمہ مذکور میں ترقی پاتے رہے۔ اس محکمہ میں سترہ برس تک خدمات انجام دیں۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی وجہ سے خانہ نشینی اختیار کرلی۔ حکام کی تجویز پر گورنر مغربی و شمالی نے میرٹھ شہر کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا۔

نواب مبارک علی خاں اپنی خاندانی روایات کے امین تھے۔ رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ حج کی سعادت سے بھی مشرف ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ حکومتِ وقت میں ذمہ دارانہ عہدوں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اپنے ذاتی اخلاق و ایثار کے سبب بھی شہر میں نہایت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ انگریز حکام بھی دیانت داری اور فرض شناسی کے معترف تھے۔

نواب صاحب ایک حاذق حکیم بھی تھے۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ نے ایک کتاب اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے کمالات کے ذکر میں "کمالاتِ عزیزی" تحریر کی۔ زبیری کنبوی خاندان کے بارے آپ کی تصنیف "رسالہ مبارک" ہے۔ "رسالہ تحفۃ المسلمین" مذہبی تصنیف ہے۔ آپ کے خطوط کا مجموعہ "انشا مبارک" بھی مقبول ہوا۔ یہ چاروں کتب شائع ہو چکی ہیں اور نایاب ہیں۔

نواب مبارک علی خاں نے ۹ نومبر ۱۸۷۶ء کو رحلت فرمائی مولوی عبدالحکیم نے تاریخِ وفات کہی:

حکیم شفیق و خداقت ماب — فرشتہ منش حاجئ باخدائے
بشوقِ جناں رخت بست اے حکیم — ازیں دار فانی سپنجی سرائے
"ابوالعزم دانائے نیکو سرشت" — "مبارک علی خان بر داہ دائے"

۱۲۹۳ھ — ۱۲۹۳ھ

شیخ اشارت علی صدق کا قطعہ تاریخِ وفات ہے:

مبارک علی خاں رئیسِ قدیم — ہوئے قصرِ جنت میں مسند نشین
سرِ آسماں سے ندا آئی صدق — "مبارک ہو بزمِ بہشتِ بریں"

۱۲۹۳ھ

المشاہیر، خانوادۂ کنبوی

نواب محمد اسحٰق خاں

نواب محمد اسحٰق خاں اس سلسلۃ الذہب کی قبل بالا خر کڑی ہیں جس کی ابتدا سر سید سے ہوئی اور خاتمہ سر سید کے رشتے کے پوتے سید محمد علی پر "نواب محمد اسحٰق خاں ۱۸۶۰ء میں جہانگیر آباد ضلع میرٹھ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت سے قبل "باغیوں" سے سازباز رکھنے کے الزام میں شیفتہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے تھے۔ وہ پلول اور جہانگیر آباد کے جاگیردار بھی تھے۔ ان کے والد جناب مرتضیٰ خاں بخش کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ انہیں پلول ضلع گوڑ گاؤں کی جاگیر لارڈ لیک نے حسنِ خدمت کے انعام کے طور پر دی تھی اور جہانگیر آباد ضلع میرٹھ کی جاگیر انہوں نے ۱۸۴۲ء کے ایک نیلام میں خریدی تھی۔ ۱۸۵۷ء تک یہ دونوں جاگیریں مرتضیٰ خاں بخش کے اہلِ خاندان کے پاس رہیں مگر پہلی جنگِ آزادی میں شیفتہ کے عملی حصہ لینے کی پاداش میں ان کو نہ صرف جیل جانا پڑا بلکہ جاگیر سے بھی محروم ہوئے۔ جب حالات انگریزوں کے حق میں بہتر ہوئے تو شیفتہ کی جہانگیر آباد کی جاگیر بحال ہوئی۔ یہ جاگیر بعد میں نواب محمد اسحٰق خاں کے بڑے بھائی نواب محمد علی خاں اور پھر ان کے دوسرے بھائی کی نگرانی میں آئی۔ ۱۸۹۳ء میں ان کے انتقال کے بعد یہ جاگیر نواب محمد اسحٰق خاں کے تصرف میں آئی۔ اس سے ایک سال پہلے ہی انہیں نواب کا خطاب ملا تھا۔

نواب محمد اسحٰق خاں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ۱۸۸۳ء میں قانونی سول سروس سے کیا۔ ۱۸۸۸ء میں ان کا تقرر ایڈیشنل مجسٹریٹ اور کلکٹر کی حیثیت سے صوبہ شمالی مغربی اور اودھ میں ہوا۔ اسی درمیان چار برس نواب رامپور کے وزیر رہے۔ ۱۸۹۷ء میں نواب موصوف کو ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں قبل از وقت ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر کے وقار الملک کے جانشین کی حیثیت سے اے ایم او کالج اور ملت کی خدمت کا جذبہ لئے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ ۲۱ جولائی ۱۹۱۳ء کو ٹرسٹیوں کا اجلاس ہوا اور نواب محمد اسحاق خاں کو نیا سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر کے ۲۶ جنوری ۱۹۱۴ء کے جلسہ میں انہوں نے اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں اور اپنی ترجیحات کا اعلان کیا۔ اس زمانے میں آنریری سیکریٹری کا انتخاب تین سال کے لئے ہوتا تھا۔ نواب صاحب کی سہ سالہ مدت جب ختم ہونے لگی تو ان کو دوبارہ اس عہدے کے لئے منتخب کیا گیا۔ اسی دوران ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔ آپ کی تین جسمانی یادگاریں تھیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے نواب محمد اسمٰعیل خاں، دوسرے محمد ابراہیم خاں جو کلیر کالج CLARE COLLEGE کیمبرج میں تھے اور تیسرے غلام علاؤ الدین خاں جو نواب رامپور کے اے۔ ڈی۔ سی تھے۔

نواب محمد اسحٰق خاں کی ایک اہم علمی خدمت "کلیاتِ خسرو" کے عنوان سے خسرو ؒ کی مثنویوں کی ترتیب و تدوین اور ان کے ناقدانہ متن کی اشاعت ہے۔ عوام کو ان کی اس خواہش کا علم پہلی بار ۲۳

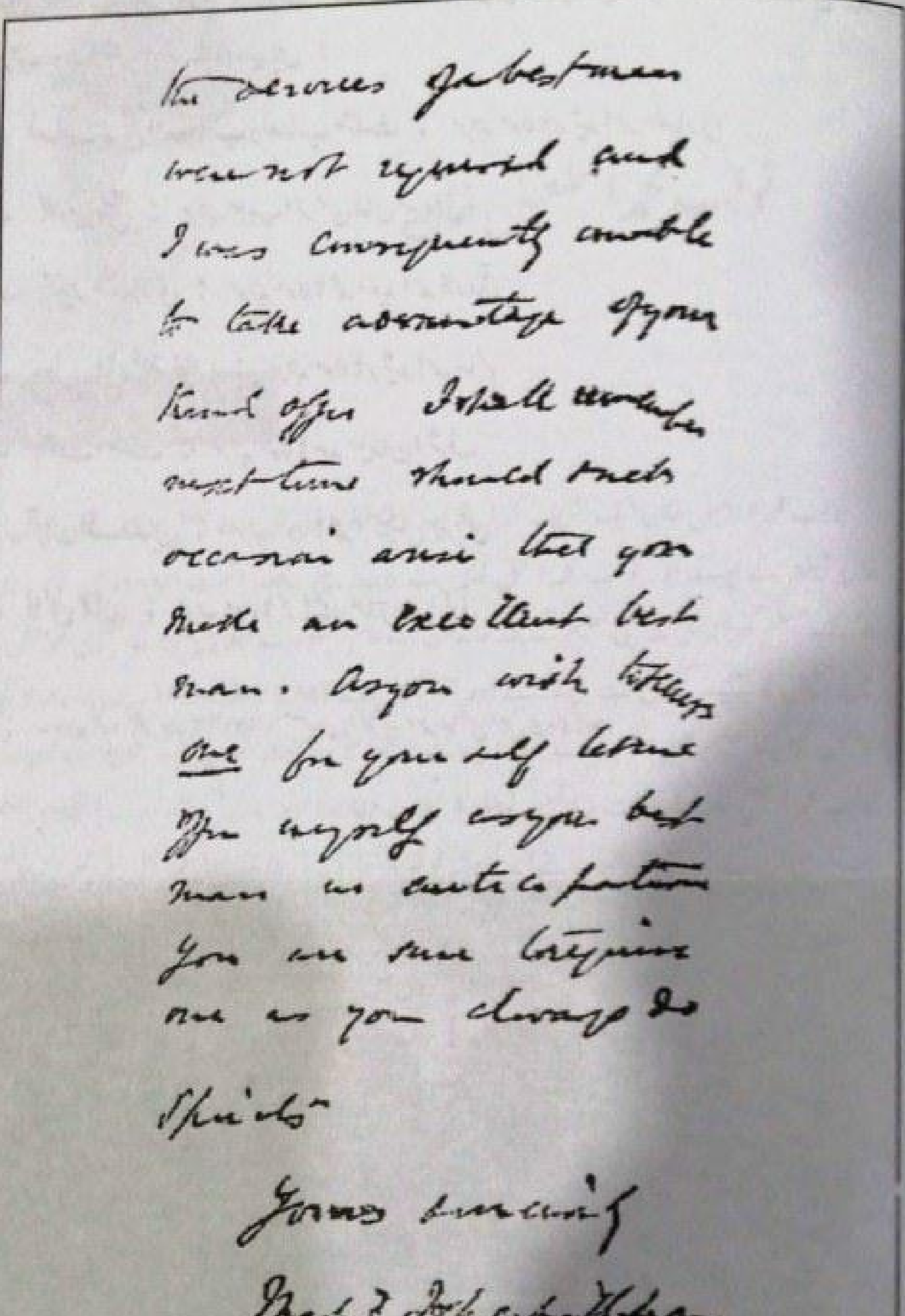
Bloomfield[illegible]
24. March 1902

My dear Islamullah!

I was so delighted to get your letter and find from it that you were well and happy. You congratulate me on my recent success. [illegible] fortune there was no necessity [illegible] it - It was a very quiet affair, [illegible] very distressing - -

the services of a best man were not required and I was consequently unable to take advantage of your kind offer. I shall remember [illegible] should such occasion arise that you made an excellent best man. As you wish [illegible] one for yourself believe [illegible] myself as your best man in a similar future. You are sure to forgive me as you always do

عکس تحریر: نواب محمد اسحٰق خاں، خط بنام نواب اسلام اللہ خاں


the services of a best man
were not required and
I was consequently unable
to take advantage of your
kind offer. I shall remember
next time should such
occasion arise that you
make an excellent best
man. As you wish to keep
one for yourself let me
offer myself as your best
man on such a fortunate
You are sure to enjoy
one as you always do
spirits.

Yours sincerely
Muhd. I. Ishaq Khan

عکس تحریر: نواب محمد اسحٰق خاں، بنام نواب اسلام اللہ خاں

جون ۱۳۲۵ء کے علی الصبح انتقال ... ہوا۔ ان کی زندگی میں خسرو کے دو مجموعے علی گڑھ سے
مرتب ہو کر منظر عام آ چکے ہیں :

۱۔ نصاب بدیع العجائب و نصاب مثلث : مرتبہ مولانا رشید احمد انصاری

۲۔ مجنوں لیلیٰ : مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی

۳۔ آئینہ سکندری : مرتبہ مولانا محمد سعید احمد فاروقی

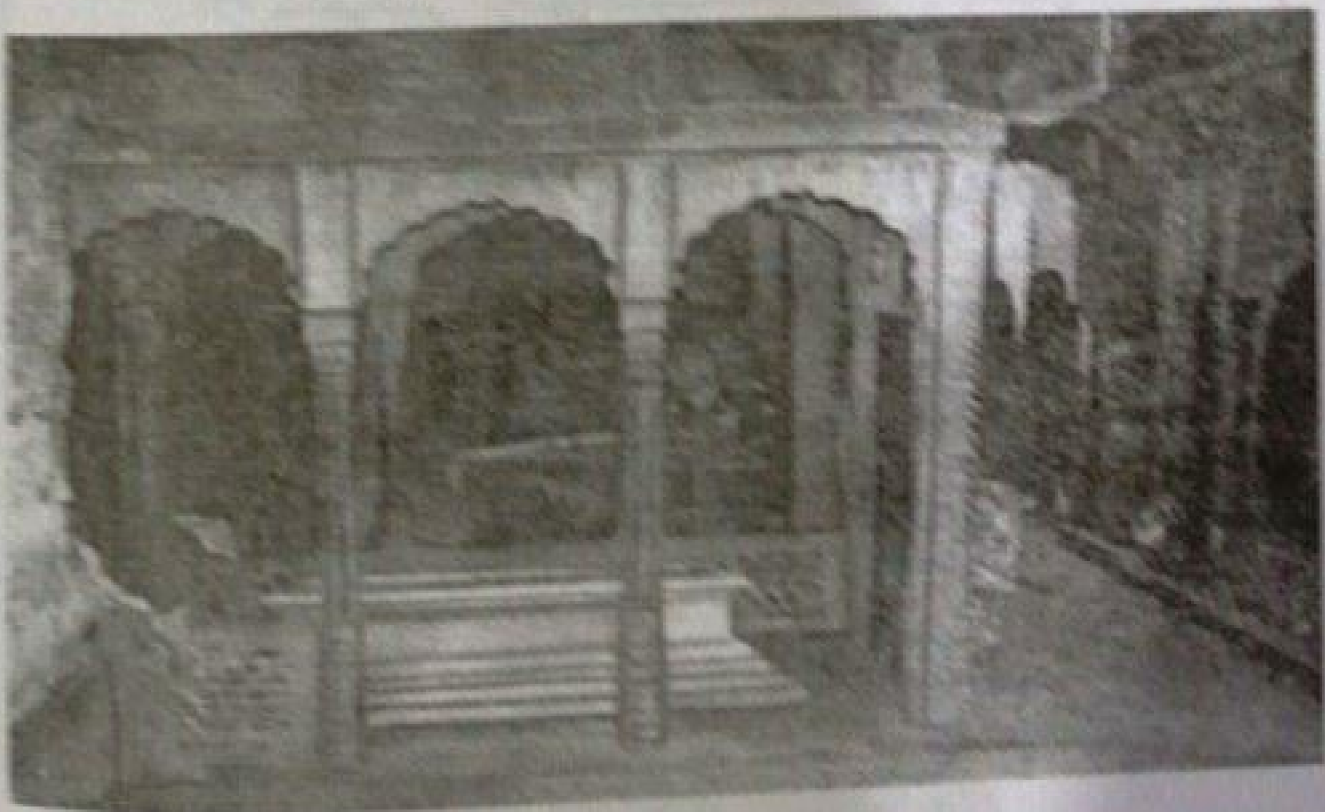
۴۔ دول رانی خضر خاں : مرتبہ مولانا رشید احمد سالم

۵۔ ہشت بہشت : مرتبہ مولانا سید سلیمان اشرف

۶۔ قران السعدین : مرتبہ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

۷۔ لالئ عمان : مرتبہ مولانا محمد امین عباسی چریا کوٹی

ماخذ : [illegible]



آرام گاہ۔ نواب محمد اسحٰق خان



نواب محمد اسمٰعیل خاں

نواب محمد اسمٰعیل خاں

نواب محمد اسمٰعیل خاں ایک شریف گھرانے اور اعلیٰ نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پوتے اور نواب محمد اسحٰق خاں کے بڑے بیٹے تھے۔ اگست ۱۸۸۴ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ مسلم گھرانے کی روایتی تعلیم کے بعد خاندان کے عام دستور کے مطابق ان کے تعلیمی مراحل بہ عافیت تکمیل کو پہنچے۔ کیمبرج سے بی۔ اے اور انرٹمپل INNER TEMPLE سے بار ایٹ لا کی اسناد حاصل کیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے میرٹھ میں وکالت شروع کی۔ لیکن جب ان کے والد نواب محمد اسحٰق خاں کی وفات پر انھیں نوابی کا خطاب عطا ہوا اور موروثی جائداد کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری ان کے سر آئی تو انھوں نے اپنے پیشہ کو خیرباد کہا تاکہ اپنے خاندانی فرائض پر توجہ دے سکیں۔

نواب محمد اسمٰعیل خاں اخلاق کے بلند اور قدیم شرافت کا نمونہ تھے۔ سنجیدگی، نیک مزاجی، مہمان نوازی، وضعداری، کشادہ دلی اور ملت کی بہی خواہی ان کے اوصاف حمیدہ کے خاص اجزا تھے۔ ہر حال میں اپنی ان خوبیوں کو نباہتے تھے۔ دیانت داری ان کے مزاج کا جوہر تھا۔ اصولوں پر سودے بازی نہیں کرتے تھے۔ اس کی کئی مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ملکی و ملی مسائل سے دلچسپی کی وجہ سے سیاست میں بھی اہم کردار ادا کرتے رہے۔ سیاست میں دلچسپی کا عملی مظاہرہ سب سے پہلے اس وقت سامنے آیا جب انھوں نے ۱۹۱۷ء میں بال گنگادھر تلک کی ہوم رول لیگ تحریک میں سرگرمی دکھائی۔ پھر میرٹھ میں عوام کے تعاون سے رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاجی سرگرمیوں کو تیز کیا۔ اس ایکٹ کے ذریعے شہری حقوق کو محدود کیا گیا تھا اور حکومت کسی بھی شخص کو وجہ بتائے بغیر پولیس حراست میں رکھ سکتی تھی یا مقدمہ چلائے بغیر قید میں ڈال سکتی تھی۔

نواب محمد اسمٰعیل خاں متحرک رہے۔ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۶ء میں دوبار مرکزی قانون ساز کونسل کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئے۔ میرٹھ کانگریس کے اہم رکن کی حیثیت سے کانگریس کی تحریکوں اور تعلیمی امور میں سرگرم حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے سوامی شردھانند کی شدھی تحریک کے خلاف مسلمانوں کو منظم

کرنے کے لئے حاجی سید محمد حسین کے اشتراک سے اتی شدھی تحریک شروع کی۔ تحریکِ خلافت میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ آپ صوبائی خلافت کمیٹی کے ممتاز رکن تھے۔ نواب صاحب کے اندر جو دینی غیرت و حمیت کارفرما تھی اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کی جو فکر موجزن تھی اس کا ثبوت ان کی بابت حکومت برطانیہ کے اس تاثر سے فراہم ہوتا ہے جو ۱۹۲۲ء کے قریب ظاہر کیا گیا۔ یہ جملہ دیکھئے :

CONCERNED WITH MUSLIM INTRESTS THAN WITH NATIONAL POLITICS". KEEN MUSLIM AND FOR MORE "A

نواب موصوف کا یا" ملی مسائل اور مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ میں گہری دلچسپی لینے کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک اپنے آپ کو کانگریس سے وابستہ نہ رکھ سکے اور مسلم لیگ سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں انہوں نے شرکت کی۔ بیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی (۱۹۲۹ء) میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ یہ مسلم لیگ کا اہم اجلاس تھا۔ اپنی مسلسل بہتر کارکردگی کی وجہ سے وہ نہ صرف مسلم لیگ کے ایک سرکردہ رہنما بن گئے بلکہ عام سیاسی زندگی میں مسلمانوں کی ایک نمایاں شخصیت ٹھہرے۔ انہوں نے کل ہند مسلم کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ نومبر ۱۹۳۰ء (لکھنؤ) کی صدارت کی۔ مسلم لیگ کے اکیسویں سالانہ اجلاس الہ آباد میں جو ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں ہوا" اس کے مندوبین میں شامل تھے۔ اسی اجلاس میں مسلم لیگ کے تنظیمی استحکام کے لئے اس کے آئین میں ترمیم و تبدیلی کی ضرورت ظاہر کی گئی۔ اس مقصد کے لئے اجلاس کے آخر میں ایک سہ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے سب سے اہم رکن نواب محمد اسمٰعیل خاں تھے۔ مسلمان جماعتوں میں اتحاد و اتفاق کے لئے اگست ۱۹۳۲ء میں الہ آباد میں "اتحاد کانفرنس" کا انعقاد عمل آیا۔ اس کانفرنس میں بھی انہوں نے شرکت کی۔ ۱۹۳۶ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبائی انتخابات عمل میں آئے تو نواب صاحب یو۔ پی اسمبلی کے لئے امیدوار نامزد ہوئے اور کامیاب ہو کر یو۔ پی قانون ساز اسمبلی کے باقاعدہ ممبر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کا ۳۱واں سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر ایک ایکشن کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد پاکستان کے حصول کے لئے مسلمانوں کو پوری طرح تیار کرنا تھا۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں اس کمیٹی کے چیئرمین منتخب کئے گئے پھر ۱۹۴۵ء میں شملہ کیبنٹ مشن کانفرنس میں مسلم لیگ کی نمائندگی کی۔

آزادی کے بعد ۱۹۵۰ء میں پارلیمانی الیکشن ہوئے۔ جن میں نواب صاحب نے حصہ لیا اور ۱۹۵۷ء تک وہ پارلیمنٹ کے معزز ممبر رہے۔ نواب صاحب کی سیاسی زندگی کا حاصل یہ رہا کہ جس جماعت میں بھی رہے یا جس منصب پر بھی فائز ہوئے، مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہے اور ملی مفاد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ وہ اگرچہ مسلم لیگ کے اہم رہنما تھے مگر تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت نہیں کی اور بھارت میں رہ

Mr. Mohd. Ali Jinnah has been for some time and is one of the most attractive figures in the contemporary political life of the country. His sagacity, penetrating intellect, rapid grasp of the most intricate problems and luminous insight coupled with calmness of temper and complete personal disinterestedness have enabled him to rise to that unique and prominent position among the Mussalmans of India, which no other Muslim leader in recent years however great his services and, however high his personal qualities has held among his fellow Muslims. He enjoys the confidence and devotion of his people to an unrivalled extent and degree. His popularity is a sure indication of the fact that he is in the highest form faithful to the actualized ideals of the Millat. He has an innate horror of political insincerities and doubtful policies and is ever ready to expose them. For the past few years by organizing the Mussalmans politically under the banner of Muslim League, he has succeeded in infusing into them a spirit of self reliance, self confidence and self respect, and has thus saved them from the doom which threatens every nation split up in small factions of warring political creeds and ideologies. In this process of organization it was perhaps inevitable and unavoidable for resentment and bitterness to crop up, but once the process is completed I have no doubt his opponents who criticize him so harshly will be thankful to him between, that by organizing the sizable part of the population of this country and making it stronger and more virile he has contributed to a speedier attainment of the common goal of independence.

I wish him from the bottom of my heart a long life and all happiness and joy.

— [illegible]
[illegible]

تحریر: نواب محمد اسمٰعیل خاں

LEGISLATIVE ASSEMBLY

Tour Petit
Matheran
23/5/35

My dear Ismail Khan

I was extremely sorry to hear that you were not well. But I did not think there was any thing serious the matter with you. However I read in the news that you had to go through an operation & are laid up so naturally I was much upset and am very anxious to know the progress you are making. I sincerely pray that you would soon be alright. Please do drop me a line as I am really anxious.

With my best wishes & kindest regards

Yours v. truly
M. A. Jinnah

نواب محمد اسمٰعیل خاں کے نام قائداعظم کا خط

Mustafa Castle
Meerut
9-6-45

My dear Mr Jinnah

Very many thanks for your kind letter & good wishes for my speedy recovery. I am glad to say I am feeling well & much better now. The rest has done me a lot of good. I am also happy to know that you are recuperating fast & regaining your strength. I expect you will stay in Matheran till the middle

Yours sincerely

Ismail Khan

عکس تحریر: نواب محمد اسماعیل خان کا خط قائد اعظم کے نام

CHARLEVILLE HOTEL

TELEGRAMS:
"CHARLVIL", MUSSOORIE.
TELEPHONE: 11

MUSSOORIE. 16. 6. 1937

My dear Nawab Sahib,

Thank you very much for your kind letter. I am very sorry to learn that the wound has not yet completely healed up. I do hope you will soon be able to go about. I do not know what it is that Sir Sikandar wishes to place before the Working Committee. I got a telegram from Mr. Jinnah asking me to call a meeting of the Committee on 2nd of July and saying that Sir Sikandar wishes to place certain important matters before the Committee.

I was delighted to see in the papers today that Ikram Ahmad Khan has been taken in the I.C.S. Please accept my very sincere congratulations and convey the same to your son. I wish him every success in life!

With kindest regards and best wishes for a complete & speedy recovery

Yours sincerely

Liaquat Ali Khan

نواب محمد اسمٰعیل خاں کے نام نوابزادہ لیاقت علی خاں کا خط

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL, M.L.C.
BARRISTER-AT-LAW

LAHORE ______ 19

4th Jan. 30

My most honourable Sahib,

Thank you so much for your letter which I received last night on my return from Montgomery where I had to attend court. I regret very much to say that it is not possible for me to come to Meerut. I have been away from Lahore since the 27th Dec & have not taken a moment's rest. Moreover the whole matter will have now to go to British Parliament on the 6th. There is not much use in holding a meeting of the working committee. Hartal was a most satisfying.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

نواب محمد اسمٰعیل خاں کے نام علامہ اقبال کا خط

17, YORK ROAD,
NEW DELHI.

20. 5. 48

My dear Nawab Sahab,

I have now agreed to address a public meeting under Congress Committee auspices in Aligarh provided I have the time. This can only be if I address meeting after lunch. Because of this I am prepared to delay my return to Delhi by half an hour so as to reach Delhi by 7 p.m. on the 24th. I am asking the Secretary of the D.C.C. to see you about this so that you can give him a suitable time.

Yours sincerely
Jawaharlal Nehru

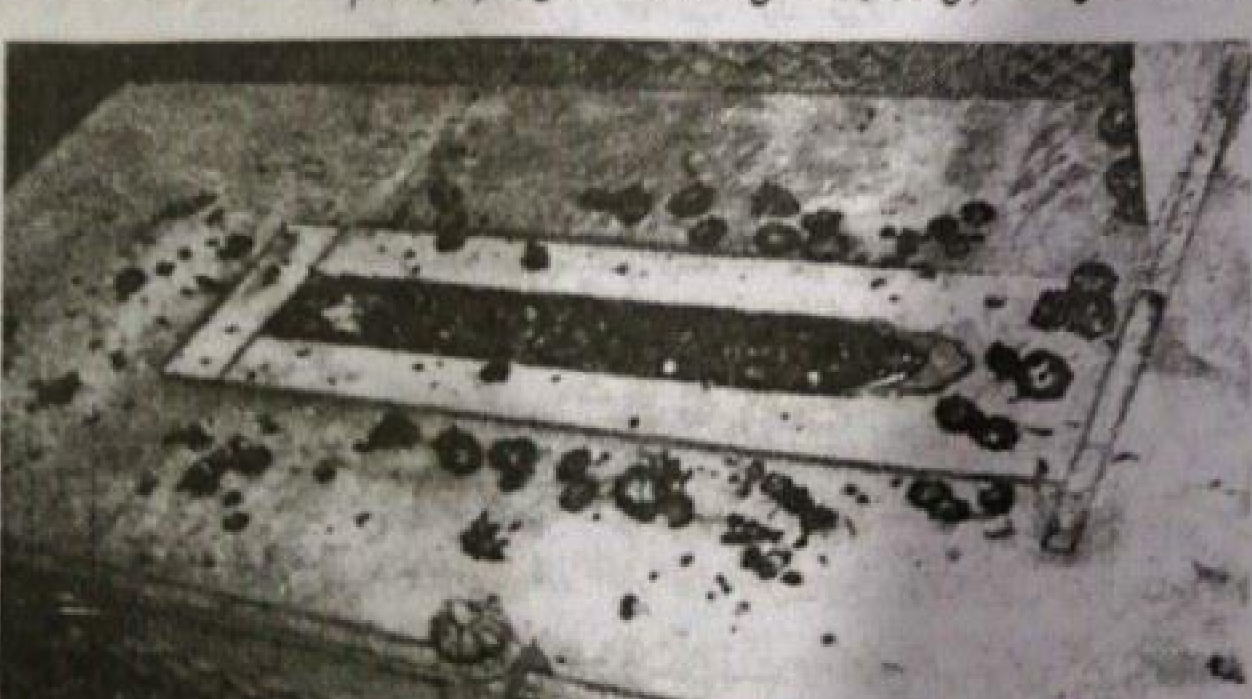
عکس تحریر: نواب محمد اسمٰعیل خاں کے نام پنڈت جواہر لال نہرو کا خط

کر وہاں کے مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک رہے۔

نواب محمد اسمٰعیل خاں کی قومی و ملی مسائل سے دلچسپی کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستگی برقرار رکھی اور اس کی تعمیر و ترقی کے لئے عظیم خدمات انجام دیں۔ اے۔ ایم۔ او کالج نے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی اور اس کے قوانین و ضوابط نئے سرے سے مرتب کئے گئے۔ نئے دستور کے تحت زیرزار کا عہدہ وجود میں آیا۔ نواب موصوف نواب سید محمد علی، ڈاکٹر شیخ عبداللہ اور خان بہادر سید زین الدین کے بعد اس عہدہ پر تقریباً چار سال (۱۹۳۱ء۔ ۱۹۳۵ء) رہے۔ انھوں نے وسائل آمدنی میں اضافہ کی تدبیر کے ساتھ ان کے صحیح مصرف پر خاص توجہ رکھی۔ اسٹاف و ملازمین کے لئے بعض نہایت مفید اسکیمیں جاری کیں جن سے علمی و تعلیمی روایات کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ اسی دور میں انھیں عارضی طور پر وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ اس حیثیت سے انھوں نے یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء سے ۱۸ اپریل ۱۹۳۵ء تک یونیورسٹی کی خدمات انجام دیں۔ اس کے تقریباً بارہ سال بعد باقاعدہ وائس چانسلر مقرر کئے گئے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اپنے عہدے کا چارج لیا۔ ان کی یونیورسٹی آمد کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے انھیں مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے اپنی ذاتی کتابوں کا عظیم ذخیرہ یونیورسٹی لائبریری کو بطور عطیہ پیش کر دیا تھا۔ بعض وجوہات کی بنا پر وہ ۲۹ نومبر ۱۹۴۸ء کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ شاید حالات کسی مسلم لیگی رہنما کے اس عہدے پر کام کرنے کے لئے سازگار نہ تھے۔

نواب محمد اسمٰعیل خاں نے اپنے وطن میرٹھ میں ۲۸ جون ۱۹۵۸ء کو آخری سانسیں لیں اور جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔ آپ کی تدفین بستی نظام الدین کے آبائی قبرستان میں ہوئی جو دہلی میں واقع ہے۔

ماخذ: سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ، جلد ۲۳، ص ۳۰۹ تا ۳۱۱۔ مضمون ڈاکٹر ظفرالاسلام



آرام گاہ۔ نواب محمد اسمٰعیل خان



خان بہادر مولوی بشیر الدین

خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین

صاحبِ بصیرت مسلم رہنما، ممتاز صحافی، اخبار "البشیر" کے مدیر خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین اپنی بے لوث قومی و ملی خدمات کے حوالے سے اپنی زندگی میں بھی محترم رہے اور آج بھی ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ اٹاوہ کے اسلامیہ انٹر کالج کے بانی کی حیثیت سے ان کی یادگار خدمت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ وہ سر سید ثانی کہلائے۔

مولوی محمد بشیر الدین صاحب ۲ اپریل ۱۸۵۸ء کو بدھ کے روز خیر نگر، میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی قمر الدین کے دوست میر جمعیت علی نے قطعہ تاریخِ ولادت کہا جس سے تاریخ پیدائش ۱۲۷۴ھ برآمد ہوتی ہے:

حاجی قمر الدین صاحب را خدا
کرد عطا از فضل نورِ سعید
گفت تاریخِ ولادت عارفے
عارف باللہ فرزندِ رشید

حاجی قمر الدین صاحب ایک درویش صفت انسان تھے۔ ان کی اہلیہ نواب خیر اندیش خاں میرٹھی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ مولوی بشیر صاحب شیوخ قریشی خاندان سے تھے، جس کا سلسلہ نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپی زاد بھائی اور مشہور صحابی حضرت زبیرؓ سے ملتا ہے۔ مولوی صاحب کا سلسلہ نسب پندرہ واسطوں سے حضرت شیخ عبد اللطیفؒ تک پہنچتا ہے جو سلطان محمود غزنوی کے زمانے کے مشائخ اور مجاہدین میں سے تھے اور اسی زمانے میں ہندوستان آ کر ملتان میں آباد ہوئے تھے۔ ۱۵۳۱ء میں مولوی صاحب کے ایک بزرگ خواجہ حسن ملتانی اپنے بھائی خواجہ امین کے ہمراہ ملتان سے مارہرہ تشریف

لائے۔ انہیں شیر شاہ سوری نے مارہرہ کا چودھری اور قانون گو مقرر کیا۔ مولوی صاحب کے پردادا حکیم الدین صاحب بزرگ کامل اور اہل معرفت تھے۔ دادا نظام الدین کلکتہ میں کسی عہدے پر متعین تھے انہوں نے مارہرہ سے ترک سکونت کرکے بانس بریلی میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ والد میرٹھ میں رہے۔

مولوی محمد بشیر الدین صاحب نے قرآن شریف اور فارسی کی ابتدائی کتب ایک متقی بزرگ حافظ اشرف علی صاحب سے پڑھیں۔ اس وقت میرٹھ میں ایک گورنمنٹ اسکول قائم ہو گیا تھا جہاں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی۔ حاجی قمر الدین صاحب عام مزاج کے خلاف انگریزی تعلیم کے حامی تھے۔ انہوں نے مولوی بشیر الدین صاحب کو اسکول میں داخل کرایا مگر خاندان کے کسی فرد نے نام خارج کرا دیا۔ والد پھر داخل کرا دیتے اور عزیز خارج۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور اس عرصہ میں مولوی صاحب نے کسی نہ کسی طرح تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۵ء میں اپنے چچا زاد بھائی قطب الدین کے یہاں بریلی چلے گئے۔ جہاں آٹھویں جماعت پڑھی۔ ۱۸۷۷ء میں بوجہ عسرت سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ مولوی صاحب میرٹھ واپس آکر قومی مدرسہ مسجد خیر نگر میں پڑھانے لگے۔ یہ تدریسی خدمت ۱۸۸۳ء تک جاری رہی۔

بچپن ہی سے مولوی صاحب کو اخبار بینی اور مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ طوطی ہند میرٹھ، [illegible] گزٹ میرٹھ اور وکٹوریہ گزٹ سیالکوٹ میں ان کے مضامین چھپتے رہے۔ مغربی طرز معاشرت کے بیحد خلاف رہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے سرسید احمد خان کے خلاف [illegible] میں ایک مضمون لکھا۔

مولوی صاحب پر مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا۔ مسلک کے اعتبار سے سنی تھے لیکن ان کے حلقہ احباب میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ شامل تھے۔ ان کی شخصیت و کردار پر گنج مراد آباد ضلع اناؤ کے مشہور بزرگ مولانا فضل الرحمن صاحب کا بھی اثر تھا۔ مولوی بشیر الدین ان کی خدمت میں ۱۸۸۶ء میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کی۔ مولانا فضل الرحمن صاحب نے فرمایا کہ تمہارا مخصوص وظیفہ یہی خدمت قوم سب سے بہتر وظیفہ ہے۔ مسلمانوں کی خدمت سے بڑھ کر کوئی وظیفہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد شریعت کی پابندی اور قومی خدمت ان کی زندگی کا لازمی حصہ رہیں جس پر وہ آخری سانس تک قائم رہے۔ ان کی طبیعت میں نہ رجعت پسندی تھی اور نہ بے معنی جدیدیت۔ وہ صرف مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے خلاف تھے۔ تعلیم نسواں کے نہ صرف حامی تھے بلکہ اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ اگر تعلیم نسواں کا معقول انتظام نہیں کیا گیا تو آئندہ زمانے میں مسلمانوں کو برے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میرٹھ کے زبیری خاندان کے ایک معروف بزرگ حاجی ممتاز علی خاں نے [illegible] میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ ان کا شمار مشاہیر حکام اور رؤسا میں ہوتا تھا۔ ان کے بیٹے حافظ روح اللہ صاحب [illegible] سے ایک ہفت وار "نجم الاخبار" نکالتے تھے۔ اس میں سرسید کی مخالفت میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ سرسید کے خلاف مولوی بشیر الدین صاحب کے مضامین پڑھ کر حافظ روح اللہ خاں نے ان کو جون ۱۸۸۳ء میں [illegible] بلا کر اپنے اخبار کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ مولوی صاحب اس اخبار میں ۱۸۸۸ء تک سرسید کے خلاف پرجوش مضامین لکھتے رہے۔ اخبار کی مقبولیت و اشاعت بھی کافی بڑھی۔ ۱۸۸۸ء میں سرسید احمد خاں سے مولوی

محمد بشیر الدین صاحب کی ملاقات ہوئی، جس کے بعد وہ سر سید احمد خاں کے زبردست حامی بن گئے۔ کچھ عرصہ تو اپنی تبدیلیِ فکر کے اظہار سے گریزاں رہے مگر ۱۸۹۵ء میں جب "تہذیب الاخلاق" دوبارہ جاری ہوا تو مولوی صاحب اپنے قلبی محسوسات مخفی نہ رکھ سکے اور چند مضامین لکھے۔ حافظ روح اللہ خاں صاحب کو یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے ۱۸۹۷ء میں "نجم الاخبار" بند کردیا مگر پریس مولوی صاحب سے واپس نہیں لیا۔

۱۸۹۸ء میں مولوی بشیر الدین صاحب نے اپنا ذاتی اخبار "البشیر" جاری کیا جو ۱۹۵۴ء تک یعنی چھپن سال بڑی کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ مولوی صاحب بے باک، حق گو اور ایمان دار صحافی تھے۔ ان کا انداز ناقدانہ اور ناصحانہ تھا۔ ان کی صحافتی زندگی میں بھی مذہبی رنگ اور قومی خدمت کے بہترین جذبات کی عکاسی رہی۔ زبان سادہ اور عام استعمال کرتے تھے۔ مشہور صحافی مولانا جالب دہلوی ان کے مقام و مرتبہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"اردو صحافت میں تین ستون ہیں۔ ایک مولوی بشیر الدین، دوسرے مولانا ظفر علی خاں اور تیسرا یہ خاکسار، لیکن جو بات مولوی بشیر الدین کو حاصل ہے وہ کسی کو میسر نہیں کہ انہوں نے اس فن میں پاپڑ بیلے ہیں، وہ ہم میں سے کسی کے حصے میں نہیں"۔

مولوی بشیر الدین صاحب مسلمانوں کی زبوں حالی پر دل گرفتہ رہتے تھے۔ انہوں نے اٹاوہ آنے کے بعد مسلمانوں کو صنعت و حرفت کی طرف راغب کیا اور معین صنعتِ ہند ۱۸۸۶ء میں قائم کی۔ یہ ان کی دور اندیشی ہی کہی جائے گی کہ انہوں نے اور ان کے خاندان کے افراد نے ۱۸۸۶ء میں ہی دیسی کپڑے کا استعمال شروع کردیا تھا جبکہ مہاتما گاندھی کی سودیشی تحریک اس کے چونتیس سال بعد شروع ہوئی۔ انہوں نے ایک تجارتی انجمن "کمپنی افزائش نسل مویشان" قائم کی۔ ۱۸۸۸ء میں ان کی کوششوں سے ہی انجمن اسلامیہ وجود میں آئی تاکہ معاشرے کی اصلاح اور بہتری کا عمل شروع کیا جاسکے۔

مولوی صاحب نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی توانائیاں وقف رکھیں۔ تعلیمی، سماجی، صحافتی، سیاسی یعنی ہر سطح پر کوئی موقع ایسا نظر نہیں آتا جب وہ متحرک نہ رہے ہوں۔ انہوں نے اٹاوہ میں ایک مدرسہ ۱۸۸۸ء میں قائم کیا، جس کی رسم افتتاح ۱۲ دسمبر ۱۸۸۸ء کو ادا کی گئی۔ ۱۸۹۵ء میں ہائی اسکول کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور اگلے ہی سال محکمہ سررشتۂ تعلیم نے اسے تسلیم کرلیا۔ ۱۹۰۳ء میں اس کا محکمہ تعلیم سے الحاق ہوا اور ۱۹۰۴ء میں پہلی بار اس اسکول کے طالب علم انٹرنس کے امتحان میں شریک ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اسکول کا دستور العمل تیار کیا اور بورڈ آف ٹرسٹیز کی تشکیل کی۔ مسلم بچوں کی جدید تعلیم و تربیت کے لئے علی گڑھ کالج کے بعد اٹاوہ ہائی اسکول وہ دوسری درس گاہ تھی جس میں شروع ہی سے طلباء کے لئے بورڈنگ ہاؤسز کا انتظام کیا گیا تھا اور جس کے تعلیمی معیار کی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی تھی۔ ۱۹۴۴ء میں اسلامیہ ہائی اسکول کو انٹرمیڈیٹ کالج کا درجہ حاصل ہوگیا اور

اسلامیہ ہائی اسکول کا نام کانپور کے ایک تاجر حافظ محمد صدیق صاحب کی مالی امانت کی شرط پوری کرتے ہوئے حافظ محمد صدیق اسلامیہ انٹر کالج رکھ دیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں مولوی صاحب کا قائم کردہ یہ تعلیمی ادارہ تعلیمی افق پر نمایاں تھا کہ مولوی صاحب ضعیفی کے سبب منیجر شپ سے مستعفی ہو گئے۔ اس ادارے کو یہ فخر حاصل ہے کہ معروف رہنما ذاکر حسین اس کالج کے طالب علم رہے تھے۔

مولوی صاحب اپنے نظریات پر ہمیشہ قائم رہے۔ انہوں نے اپنی سو سالہ زندگی میں قومی تحریک کے تمام نشیب و فراز دیکھے اور ان کا تجزیہ کیا۔ بنیادی طور پر وہ برطانوی حکومت اور مغربی تہذیب کے مخالف' ہندو مسلم اتحاد کے حامی اور ملک و قوم کی آزادی کے خواہاں تھے۔ ۱۹۲۹ء میں وہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے گروہ سے وابستہ ہو گئے تھے جو کانگریس کا حامی تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ وہ ہمیشہ ابن الوقت لوگوں سے متنفر رہے۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ یہ لوگ لیڈر نہیں گیدڑ ہیں۔ ان میں کریکٹر' قوت اور جرات نہیں' یہ قوم فروش بھی ہیں اور خود فروش بھی۔

مولوی صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ جسٹس محمود' محسن الملک' وقار الملک' ڈاکٹر سر ضیاء الدین' صاحبزادہ آفتاب احمد خاں' ڈاکٹر ذاکر حسین' حبیب الرحمٰن شیروانی' میر ولایت حسین اور خان بہادر حبیب اللہ سے بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ مسٹر ماریسن' مسٹر نیول' مسٹر جیمس' مسٹر اگرونڈر اور دیگر نمایاں انگریز افسروں سے بھی مراسم تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی' ڈپٹی نذیر احمد' مولانا شبلی نعمانی' مولانا عبد الحلیم شرر' بابائے اردو مولوی عبد الحق' سر عبد القادر' مولانا محمد علی جوہر' نواب مزمل خاں اور محسن کاکوروی سے بھی خصوصی تعلقات تھے۔

مولوی صاحب کی بے مثال خدمات کا اعتراف نہ صرف ان کے ہمعصروں نے کیا بلکہ حکومتِ برطانیہ نے بھی کیا۔ ۱۹۲۶ء میں برطانوی حکومت نے انہیں "خان بہادر" کے خطاب سے نوازا۔ آزادی کے بعد ان کی قومی خدمات کے اعتراف میں ۲۷ فروری ۱۹۵۰ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لا کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۵۵ء میں مولانا ابو الکلام آزاد نے حکومتِ ہند کی جانب سے ماہوار وظیفہ مقرر کرایا جو آخری دم تک ملتا رہا۔

سر سید احمد خاں کے دور کے آخری قومی رہنما مولوی محمد بشیر الدین ۱۱ اور ۱۲ جون ۱۹۵۶ء کی درمیانی شب خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ۱۲ جون ۱۹۵۶ء کی دوپہر بعد نمازِ ظہر ان کے جسمِ خاکی کو کالج کے احاطہ میں مسجد کے قریب سپردِ خاک کیا گیا۔ پروفیسر حامد حسین قادری نے قطعۂ تاریخِ وفات سنِ ہجری میں کہا:

از اٹاوہ شد بشیر الدین بہ گلزارِ ارم
آن علم انداز قوم و آن علم افروزِ قوم
از لبِ ہاتف بقولِ حالی آمد ماہ و سال
زیستن در فکر قوم و مردن اندر سوز و قوم

مولوی بشیر الدین صاحب کے انتقال پر بر صغیر کے کم و بیش تمام اہم اخبارات و رسائل نے تعزیتی بیانات شائع کیے اور ان کی بیش بہا قومی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ البشیر کے بیانات سے اقتباسات دیکھئے:

پروفیسر آل احمد سرور: کتنے ہی نوجوانوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کی، کتنوں میں قومی زندگی میں اپنا بھر حصہ لینے کا ولولہ پیدا کیا اور کتنوں کو خاموش تعمیری خدمت کے لئے تیار کردیا۔ مرحوم کی مثال ہمارے سامنے ایک روشن مینار کی طرح ہے۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی: مولوی بشیر الدین ان کارکنوں میں "ممتاز ترین ہستی تھے۔ مرحوم صداقت" دیانت، سادگی اور خلوص و غیرت کے پتلے تھے۔ لوگ انہیں سرسید ثانی کہتے تھے اور جہاں تک دین کے پکے پن اور اعمال کا تعلق ہے" بے شک وہ سرسید ہی کی طرح کے تھے۔

محمد عثمان فارقلیط: مولوی صاحب ہزاروں مضمونوں کا نچوڑ تھے۔ سب سے زیادہ قوم کی خدمت کی مگر سب سے زیادہ گمنام رہے۔ کیا اخلاص تھا کیسی بے غرضی تھی کہ تلاش کرنے سے بھی نظر نہیں آتی۔ سچ پوچھو تو وہ دوسرے سرسید تھے مگر نام و نمود اور شہرت کو پاس تک نہ پھٹکنے دیتے تھے۔

حیات اللہ انصاری: مولوی بشیر الدین نے جس بے غرضی سے کالج کے لئے کام کیا اس کی مثال ڈھونڈے سے



سرورق: حیات البشیر مرتبہ مجیب اشرف

میں بہت کم ہے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی اس خدمت کا سہارا لے کر ایک بڑے لیڈر بن سکتے تھے لیکن انہوں نے اس بات کو گوارا نہیں کیا۔ ان کا یہ کارنامہ موجودہ نسل کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

مولوی صاحب کی اہلیہ ۱۹۱۹ء میں انتقال کر چکی تھیں۔ اولاد میں دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں لیکن ان سب کا انتقال ان کی زندگی میں ہی ہوگیا۔ چھوٹے بیٹے بشیر پاشا ۱۹۲۴ء اور بڑے بیٹے بشیر احمد ۱۹۴۲ء میں رخصت ہوئے۔ چار پوتے نصیر الدین، مقبول الزماں، امتیاز الدین زبیری اور بصیر الدین زبیری ہیں۔ چھ نواسے اور پانچ نواسیاں ہیں۔ سب سے بڑے نواسے ڈاکٹر قیوم پاشا تھے جن کی شادی ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔

ڈاکٹر مجیب اشرف صاحب (۱) نے "حیات البشیر" کے نام سے ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی جو ۱۹۹۷ء میں اسلامیہ ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اٹاوہ کے تعاون سے منظر عام پر آئی ہے۔

حیات البشیر

بہ شکریہ جلیس زبیری

حاشیہ

(۱) ڈاکٹر مجیب اشرف بن مولوی عبد الحکیم ۱۰ جولائی ۱۹۴۱ء کو قصبہ گنور ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ میں زیرِ تعلیم رہے۔ ۱۹۵۴ء میں میٹرک کرنے کے بعد دو سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے۔ ۱۹۶۱ء میں جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۶۵ء میں جامعہ اسلامیہ سے فرسٹ پوزیشن میں شعبہ تاریخ سے ایم۔اے میں کامیابی حاصل کی۔ دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۸ء میں جامعہ کے شعبہ تاریخ میں اسسٹنٹ لیکچرر، ۱۹۷۰ء میں لیکچرر، ۱۹۸۳ء میں ریڈر اور ۱۹۹۱ء میں پروفیسر ہوئے۔

ان کی تصانیف مسلم ایٹی چیوڈس ٹوواردس برٹش رول اینڈ ویسٹرن کلچر ان انڈیا: ۱۹۸۲ء، قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات: ۱۹۸۶ء، جدید ہند کے سیکولر معمار: ۱۹۸۹ء بھی شائع ہو چکی ہیں۔

مسرت حسین زبیری

جان الٰہی صاحب مارہرہ کے مشہور زبیری خاندان کے فرد تھے۔ اس برادری کا میرٹھ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ نواب خیر اندیش خان، نواب مبارک علی خان، نواب احمد اللہ خاں، نواب وقار الملک، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، خان بہادر اسلام نبی خان اور نواب سر محمد یامین خان کے علاوہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ سب میرٹھ سے وابستگی رکھتے تھے۔ جان الٰہی صاحب کے چاروں بیٹوں نے اپنے اپنے شعبوں میں معتبر مقام حاصل کیا۔ ڈاکٹر ابنِ حسن زبیری جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر رہے، دوسرے بیٹے ابن حسین زبیری تھے، تیسرے فرزند ڈاکٹر عترت حسین زبیری راجشاہی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر اور حکومتِ پاکستان کے مشیر تعلیم رہے، سب سے چھوٹے صاحبزادے مسرت حسین زبیری تھے۔

مسرت حسین زبیری ان اکابرین میں شامل ہیں، جنہوں نے متعدد حوالوں سے قوم و ملک کی بے لوث خدمت کی اور اپنے افکار و عمل سے گہرے نقوش چھوڑے۔ وہ ایک کامیاب منصوبہ ساز شخصیت کے حامل تھے، سیاست کے پیچ و خم سے واقف تھے۔ انہوں نے سرکاری ملازمت میں رہ کر بھی اپنا کردار ادا کیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی متحرک زندگی گزاری۔ ان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ تقسیم ہند کے وقت وہ واحد آئی سی ایس تھے جو سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔

زبیری صاحب ۱۳ دسمبر ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے خاندانی روایات کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تاریخ اور سیاسیات میں ایم اے تھے۔ انہوں نے سینٹ جان کالج آگرہ اور سینٹ کیتھرائن کالج کیمبرگ میں تعلیمی مراحل مکمل کئے تھے۔ پھر آئی سی ایس کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز ۱۹۳۷ء میں حکومتِ پنجاب اور حکومتِ ہند کے ممبر آف آئی سی ایس سے شروع کیا۔ انڈین سول سروس میں وہ پہلے مسلمان تھے جو اعلیٰ عہدے پر مقرر ہوئے۔ اور گیارہ سال تک اس عہدے پر رہنے والے وہ پہلے مسلمان نوجوان تھے۔ وہ ذاتی طور پر ہندوستانی سیاست سے متعارف تھے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کے ہنگامہ خیز دور میں انہوں نے دہلی میں رہتے ہوئے تمام سیاسی نشیب و فراز دیکھے۔

تقسیمِ ہند کے بعد وہ پاکستان کے سینئر سی ایس پی ہوئے جو پاکستان میں آئی سی ایس کی جگہ بنائی گئی۔ انہوں نے ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہتے ہوئے نمایاں کام کئے۔ حکومت پاکستان کے سیکریٹری مواصلات کی حیثیت سے انہوں نے ملک کو موثر مواصلاتی نظام دیا۔ سول ایوی ایشن کے شعبہ کو قائم کیا۔ ملک کے دونوں حصوں میں جنگی کورٹس اور شپنگ کورٹ کو تبدیل کیا اور بین الاقوامی معاملات عصری ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے طے کئے۔ کونسل آف ایڈمنسٹریشن کے سیکریٹری کی حیثیت سے زبیری صاحب نے مغربی پاکستان کو ون یونٹ بنانے کی رپورٹ تیار کی۔ یہی رپورٹ ون یونٹ کی بنیاد بنی

اور اس کے نافذ العمل ہونے کے بعد وہ صدر محمد ایوب خان کے دور میں پشاور ڈویژن کے پہلے کمشنر مقرر ہوئے۔ انہوں نے پشاور میں "گندھارا آرٹ کونسل" قائم کی اور کئی یادگار تصاویر کونسل کو بطور عطیہ دیں۔ انہوں نے خصوصی طور پر آزاد قبائلی علاقہ کے غیور پٹھانوں کے لئے جو قوائد بنائے اور لائحہ عمل تیار کیا اس پر آج تک عمل ہو رہا ہے۔

مسرت حسین زبیری صاحب صدر ایوب خان کے عہد میں صنعت پانی بجلی اطلاعات اور قدرتی وسائل کے شعبوں سے متعلق رہے اور ان وزارتوں میں دوررس اقدامات کئے۔ حکومت پاکستان کے سیکریٹری مواصلات کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد [illegible] میں پاکستان "ایران اور ترکی کے درمیان ہونے والے علاقائی تعاون برائے ترقی کے ادارے آر سی ڈی کے سیکریٹری جنرل مقرر ہوئے۔ انہوں نے اس ادارے کی تشکیل میں بھی قابلِ ذکر حصہ لیا تھا۔ آر سی ڈی کے پلیٹ فارم سے زبیری صاحب نے اس ادارے کو موثر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس ادارے نے علاقائی معاملات طے کرنے میں فعال کردار ادا کیا۔ مسرت حسین زبیری صاحب نے بین الاقوامی امن اور معاشی ہم آہنگی کے لئے بھرپور توانائی صرف کی اس کے لئے انہوں نے عالمی سطح پر موثر رابطے کئے جنہیں پوری دنیا میں قدر و منزلت حاصل ہوئی۔

زبیری صاحب کی صلاحیتوں اور کوششوں کا بڑے پیمانے پر اعتراف کیا گیا۔ جرمنی کی حکومت نے اپنا سب سے بڑا ایوارڈ KNIGHT COMMANDER S CROSS پیش کیا۔ حکومتِ ایران نے اپنے اہم ایوارڈ "نشانِ ہمایوں" درجہ اول اور حکومتِ برطانیہ نے O.B.E کے اعزاز سے نوازا۔ حکومتِ پاکستان نے اپنے بڑے اعزازات ہلالِ قائد اعظم، ستارۂ پاکستان اور ستارۂ قائد اعظم سے نواز کر ان کی انتھک محنت اور قومی خدمات کا اعتراف کیا۔

مسرت حسین زبیری نے [illegible] میں یادگار خدمات انجام دے کر جہانِ رنگ و بو سے رخصت ہوئے۔ ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ ان کی خود نوشت

VOYAGE THROUGH HISTORY

کے نام سے [illegible] میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد [illegible] صفحات اور دوسری جلد [illegible] صفحات پر مشتمل ہے۔



نواب وقار الملک

نواب وقار الملک

مولوی حاجی مشتاق حسین خان بہادر

نواب وقار الملک مولوی حاجی مشتاق حسین ممتاز دانشور تھے۔ ۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو موضع سراواں ضلع میرٹھ میں آپ کی ولادت ہوئی، جہاں آپ کے والد فضل حسین صاحب ملازم تھے۔ آپ کا تاریخی نام چراغ احمد ہے۔ نسب کے لحاظ سے آپ کمبوہ تھے۔ آپ کا جدی سلسلہ دیوان عبدالمومن تک پہنچتا ہے جو سنبھل ضلع مراد آباد کے رئیس تھے اور عہدِ شاہجہانی میں دیوانِ تن کے ممتاز منصب پر فائز تھے۔ آپ کی والدہ بتول النساء بیگم امروہہ کے ایک قابل طبیب حکیم محمد حسن کی پوتی تھیں۔

نواب وقار الملک چھ ماہ کی عمر میں اپنے والد کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئے اور آپ کی والدہ اپنے والد مولوی امجد علی صاحب کے ہاں اپنے بچے کے ساتھ چلی گئیں۔ آپ کی تعلیم کا آغاز مکتب کی تعلیم کے ساتھ ہوا اور چھ برس کی عمر میں قرآن پاک پڑھ لیا۔ عربی اور فارسی میں دسترس حاصل کی اور پھر انجینئرنگ کالج میں داخل ہوئے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ اپنے چچا امام الدین صاحب کے ہاں چلے گئے۔ وہ اس وقت مراد آباد میں تحصیلدار تھے۔ آپ نے انہی کے پاس کلکٹری کا کام سیکھنا شروع کیا اور اسی عرصہ میں ان کی مجھلی بیٹی سے آپ کا عقد ہوا۔

حاجی مشتاق حسین صاحب نے نائب مدرس کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور ترقی کرتے کرتے تحصیلدار بن گئے۔ اسی دوران شدید قحط پڑا۔ حکومت نے قحط زدہ لوگوں کی مدد کے لئے باقاعدہ ایک ادارہ آپ کے انتظام و انصرام میں قائم کیا۔ انہی انتظامات کے دوران امروہہ میں سرسید احمد خاں سے متعارف ہوئے اور باہمی تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ سر سالار جنگ اعظم دولت آصفیہ حیدر آباد کی درخواست پر سرسید احمد خاں نے آپ کو ۱۸۷۵ء میں حیدر آباد روانہ کر دیا۔ آپ کی دیانت داری محنت اور کام کی لگن سے ارباب اختیار اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ کو معتمدی ریونیو دولت آصفیہ کے منصب جلیلہ پر فائز کر دیا گیا۔ آپ نے کسی دباؤ میں آئے بغیر انصاف کی بنیاد پر خدمات انجام دیں۔

نواب وقار الملک نے قوم و ملک کی بہتری کے لئے شب و روز کام کیا۔ آپ علی گڑھ سائینٹفک سوسائٹی کے معاون مقرر ہوئے۔ مسلمانوں میں تعلیم کا شعور پیدا کرنے کے لئے قائم کی گئی کمیٹی کے لئے بھی کام کیا اور اس موضوع پر لکھتے رہے۔ آپ کو سرسید احمد خاں نے اس کمیٹی کا رکن نامزد کیا جو انگریزی تعلیم کے لئے قائم کی گئی تھی۔ آپ نے اپنے رفقاء کے ساتھ یو۔پی کے مختلف شہروں کا مفصل دورہ کیا تاکہ ایم۔اے۔او کالج کے لئے موزوں جگہ کا انتخاب کیا جاسکے۔ آپ نے علی گڑھ کو اس کالج کے قیام کے لئے منتخب کیا جسے سرسید احمد خان نے بھی پسند کیا۔ کمیٹی اشاعتِ تعلیم کے لئے آپ نے بہت زیادہ کام کیا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک اور انتظامی کمیٹی کی تجویز پر بورڈنگ ہاؤس کا انتظام وقار الملک کے سپرد ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں آپ کو سرسید احمد خاں کی یادگار کی تعمیر کا سیکریٹری بنایا گیا۔ اس کام کو اپنی نگرانی میں پوری توجہ کے ساتھ مکمل کرایا۔ نواب وقار الملک کی ہمہ گیر تعلیمی، سماجی اور دینی خدمات کے پیش نظر سرسید احمد خاں کی تحریک سے کالج میں "مشتاق منزل" کے نام سے ایک یادگار تعمیر کرائی گئی جو اسی نام سے مشہور ہے۔

۱۹۰۷ء میں نواب محسن الملک کی وفات کے بعد آپ کو متفقہ رائے سے علی گڑھ کالج کا اعزازی سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ آپ نے کالج کے انتظامات بطریقِ احسن انجام دئے۔ اس حیثیت سے آپ نے طلبہ کے لئے قرض حسنہ کی سہولت، قیام سنڈیکیٹ، ٹرسٹیوں کی تعداد میں اضافہ، کالج میں یونانی مطب کے قیام، عمارات کی تعمیر و تکمیل، حکومت سے مالی امداد کے حصول، مذہبی تعلیم کی ترویج اور عام مالی امداد کے حصول کے لئے دن رات کام کیا۔

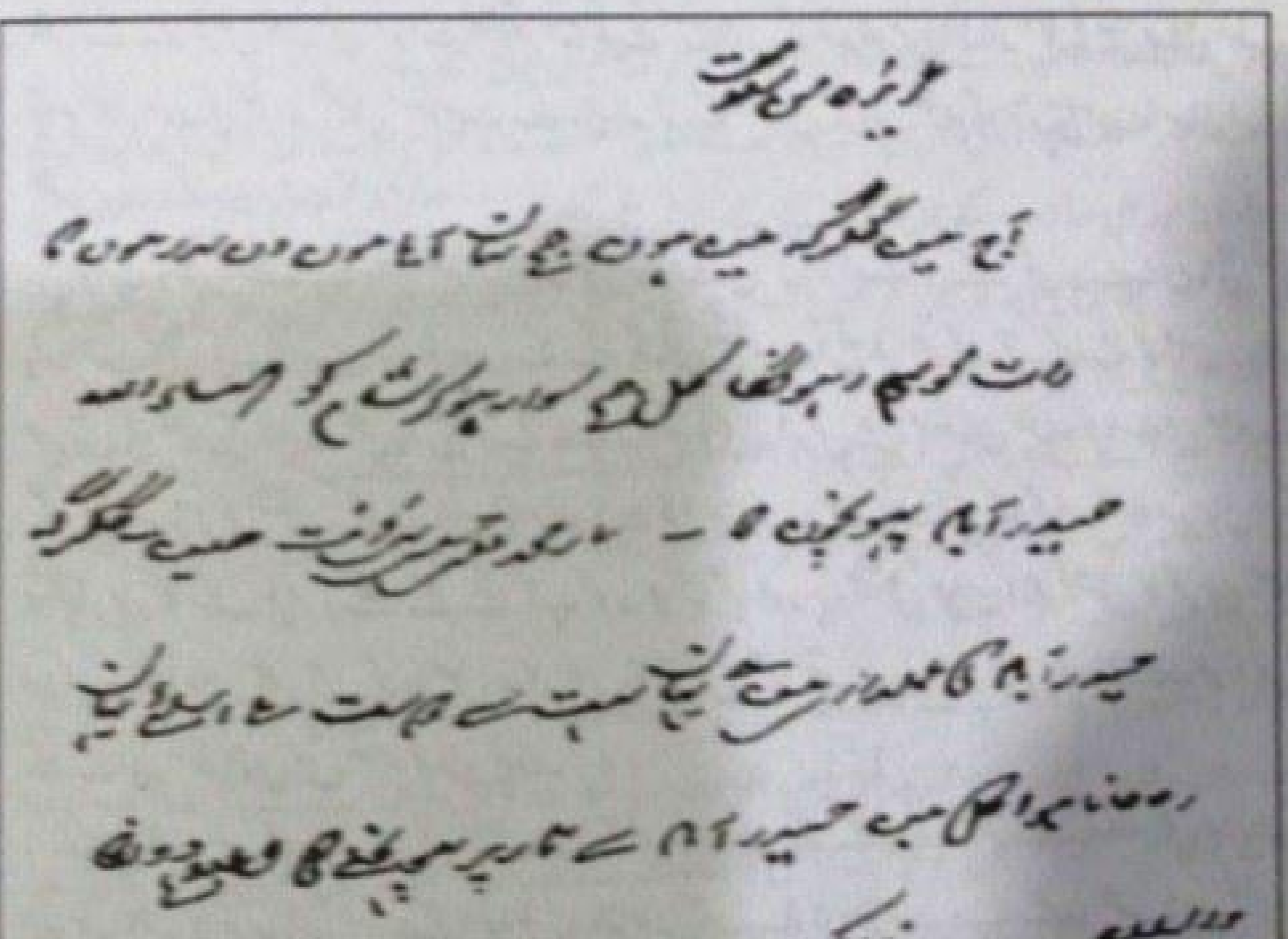
نواب وقار الملک نے دار العلوم دیوبند کی معاونت کی، ندوۃ العماء کے رکن رہے۔ دیہاتی تعلیم پر یادداشت پیش کی۔ امیروں اور غریبوں کے لئے یکساں تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے لئے کوشاں رہے اور عورتوں کی تعلیم کی اہمیت بھی واضح کرتے رہے۔ انگریزی مدارس میں مسلمان طلباء کو اسلامی تعلیم دلانے کے لئے سرتوڑ کوششیں کیں۔ ان تمام خدمات کا اعتراف وسیع پیمانے پر کیا گیا۔ اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیار پور کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے آپ کو مدعو کیا گیا اور پروفیشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی کی صدارت کا اعزاز بھی آپ کو حاصل ہوا۔ اس کانفرنس کے نتیجہ میں برصغیر میں ایم۔اے۔او کالجز قائم کئے گئے اور مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ ملا۔

سیاسی شعبہ میں بھی نواب وقار الملک نے مسلم مفادات کے لئے بڑے کام کئے۔ ۱۹۰۱ء میں پولیٹیکل ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ اس کے اغراض و مقاصد آپ نے ہی ترتیب دئے تھے۔ شملہ ڈیپوٹیشن میں مسلمانوں کی نمائیندگی کا اعزاز بھی آپ کو حاصل ہوا۔ اس وفد میں سر آغا خاں جیسی شخصیات شامل تھیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے حل کے لئے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت پورے ملک

میں محسوس کی جا رہی تھی تاکہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے اور مسلمانوں کی آواز ایوانِ اقتدار تک پہنچے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں مسلم اکابرین کا ایک اہم اجلاس ہوا۔ نواب وقار الملک نے اس اجلاس کی صدارت کی اور آپ کی زیرِ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ نواب وقار الملک کو مسلم لیگ کا پہلا آنریری سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اس کا دستور العمل جاری کرنے کا شرف بھی آپ کو حاصل ہوا۔ آپ نے مسلم لیگ کو برصغیر کی واحد نمائندہ جماعت بنانے کے لئے شب و روز کام کیا۔ آپ عالمِ اسلام کی حالت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ترکوں کی اخلاقی و مالی مدد کے لئے آپ نے مضامین لکھے اور ممکنہ خطرات سے امتِ مسلمہ کو آگاہ کیا۔ آپ نے قومی، ملی، تعلیمی اور سیاسی موضوعات پر بھی مختلف مضامین لکھے۔ زورِ بیان اور شیریں زبانی آپ کی تحریر کی خصوصیات تھیں۔ وسعتِ معلومات، خوش طبعی اور لطیفہ سنجی کے علاوہ آپ کی تحریر میں فارسی ادب کے حوالہ جات بھی بکثرت ملتے ہیں۔

نواب وقار الملک کی صحت علی گڑھ کالج کی خدمت کے دوران ہی روبہ زوال تھی۔ [illegible]ء میں کالج سے مستعفی ہو کر امروہہ چلے گئے۔ آخری وقت میں بھی امتِ مسلمہ کے حالات سے فکر مند تھے۔ حساس طبیعت کی وجہ سے سینہ سوز و گداز سے لبریز تھا۔ شدید روح فرسا خانگی مصائب نے اور زیادہ دل شکستہ کر


والسلام
خاکسار
مشتاق حسین

عکسِ تحریر: نواب وقار الملک

دیا تھا۔ پے در پے مرض کے حملے شروع ہو گئے۔ چند مرتبہ فالج کا اثر ہوا اور جسمانی طاقت روز بروز گھٹنے لگی۔ ۱۹۱۶ء میں فالج کا حملہ منصوری میں ہوا اور طاقت نے جواب دے دیا۔ ساعت موعود آپہنچی۔ ۲۷ اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب کو بخار اتر گیا لیکن بخار اترتے ہی شمعِ حیات گل ہو گئی۔ پورے ملک میں رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا۔ تعزیتی مضامین لکھے گئے اور قراردادیں منظور ہوئیں۔ علی گڑھ سے ایک وفد امروہہ بھیجا گیا تاکہ آپ کے خاندان سے رابطہ کر کے آپ کی عظیم قومی خدمات کے پیش نظر آپ کو علی گڑھ میں دفن کرنے کی اجازت لی جائے مگر وفد پہنچنے سے پہلے تجہیز و تکفین ہو چکی تھی۔ یہ جوہرِ قابل فکر و عمل کے چراغ روشن کرتا رہا ہے جن کی روشنی میں آج بھی راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ عزیز نے تاریخِ وفات کہی۔

دل سے نکلا دھواں پڑھتے ہی تاریخ عزیز
"ہے جہاں میں آج شمعِ بزمِ سرسید خموش"

"وقارِ حیات" میں آپ کی زندگی اور خدمات کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔

محمد صلاح الدین

بیباک و ممتاز صحافی، صاحبِ طرز ادیب اور مفکر محمد صلاح الدین کی شخصیت محنت، دیانت اور حق گوئی کی ترجمان رہی۔ آپ نے اظہارِ افکار پر کسی بھی مصلحت سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی خوف موقف تبدیل کرنے پر مجبور کرسکا۔

آپ ۵ جنوری ۱۹۳۵ء کو میرٹھ میں جناب محمد شہاب الدین کے گھر پیدا ہوئے۔ میرٹھ، پہلی بھیت اور احمد آباد میں ابتدائی تعلیمی مراحل طے کئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں افرادِ خاندان کے ساتھ ہجرت کرکے کراچی آئے۔ یہاں موٹر مکینک، ڈینٹر، ویلڈر، ٹرنر اور سینیٹری فٹر کا کام کیا۔ سائیکل کی دوکان اور گھڑی سازی کی۔ اس طرح گھر چلانے میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ۱۹۵۵ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۵۸ء میں محمد صلاح الدین صاحب نے بیک وقت تین امتحانات دیئے۔ سی۔ٹی میں اول پوزیشن حاصل کی، انٹر اور ادیب عالم کے امتحانات سیکنڈ ڈویژن میں پاس کئے۔ ۱۹۶۰ء میں بی۔اے اور ۱۹۶۴ء میں بی۔ایڈ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔اے کیا۔

محمد صلاح الدین صاحب نے ۱۹۵۷ء میں گورنمنٹ سیکنڈری اسکول کیماڑی، کراچی سے تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت معلم کام کیا مگر صحافت میں دلچسپی کی وجہ سے ۱۹۶۴ء میں ہی روزنامہ "حریت" کراچی سے وابستہ ہوگئے تھے اور ۱۹۷۰ء کے اوائل تک یہاں سب ایڈیٹر سے نائٹ شفٹ انچارج تک کی ذمہ داریاں پوری کیں۔ اسی دورانیے میں پانچ ماہ کے ایک مختصر وقفے کے لئے روزنامہ جنگ کراچی میں بحیثیت سب ایڈیٹر کام کیا۔ ۱۹۷۰ء میں بحیثیت نیوز ایڈیٹر روزنامہ "جسارت" ملتان میں تقرر ہوا۔ وہاں سے اسی منصب پر کراچی تبادلہ ہوا اور ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ آپ ۱۹۸۳ء کے اواخر تک یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ کے اداریے پڑھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں قید و بند کی صعوبتیں بے مثال جرأت اور حوصلے سے برداشت کیں۔ جرمِ اظہار کی جسارت میں سات مرتبہ جیل بھجوائے گئے۔ مجموعی طور پر سوا دو سال جیل میں گزارے۔ "جسارت" کے پالیسی سازوں سے بعض اصولی اختلافات کی بنیاد پر علیحدگی کے بعد ۲۳ مارچ ۱۹۸۴ء سے ہفت روزہ "تکبیر" کراچی سے جاری کیا اور زندگی کے آخری لمحات تک صدائے تکبیر بلند کرتے رہے۔ ۴ دسمبر ۱۹۹۴ء کی شام دفتر تکبیر کے باہر نامعلوم قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر شہادت کے منصب پر فائز ہوگئے۔ آپ کی تدفین پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس کراچی کے قبرستان میں ہوئی۔

آپ نے جسارت کی جبری بندش کے دوران فریضہ حج ادا کیا اور واپسی پر اسلام میں بنیادی حقوق کے موضوع پر یادگار تحقیقی کام کیا۔ "بنیادی حقوق" محمد صلاح الدین کی ایک اہم تصنیف ہے جو عرق ریزی

جگر سوزی اور محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کتاب کو ادارہ ترجمان القرآن لاہور نے پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں چھپا۔ اس کتاب کا پیش لفظ مفکرِ اسلام مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے تحریر کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں "جناب محمد صلاح الدین صاحب نے اپنی اس کتاب میں بنیادی حقوق کے مسئلے پر اسلامی نقطہ نظر سے اس قدر جامع، مفصل اور محققانہ بحث کی ہے کہ غالباً" اس سے پہلے کسی نے ایسی بحث نہیں کی۔" محمد صلاح الدین صاحب کی دوسری تصانیف انقلابِ ایران: کیا کھویا کیا پایا، کلمہ طیبہ (اردو، انگریزی)، جمہوریت: فریب اور حقیقت، عورت کی سربراہی، پاکستان ماضی حال مستقبل، خاندانی منصوبہ بندی یا اقدامِ خود کشی، پیپلز پارٹی: مقاصد اور حکمت عملی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے سفرناموں، مختلف شخصیات پر آپ کی تحریروں، تعلیم کے موضوع پر آپ کے مضامین اور دیگر مسائل پر آپ کے فکری کام کو مربوط کتابوں کی شکل میں مدون کرنے کا کام جاری ہے۔

محمد عثمان فارقلیط

پلکھوہ ضلع میرٹھ کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ محمد عثمان فارقلیط کے دادا مولوی نصراللہ فارسی کے اچھے عالم تھے۔ والد محمد احمد پیشے کے لحاظ سے ٹھیکیدار تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے دلی میں ایک مکان خرید کر وہاں رہائش اختیار کرلی تھی۔ یہ مکان کوچہ استاد داغ (چاندنی چوک) میں تھا۔ اسی مکان میں محمد عثمان فارقلیط کی ولادت مئی ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ عربی اور دینی تعلیم حاجی علی جان والوں کے مدرسے واقع نئی سڑک' دلی میں پائی۔ اس کے بعد دلی کے مختلف علماء سے منطق' معانی وبیان' دینیات اور حدیث کی تکمیل کی اور بہت جلد عربی' فارسی اور اردو میں عالمانہ استعداد حاصل کرلی۔ وہ ۱۹۲۲ء میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔

اسلام سے متعلق ان کا علم کامل تھا۔ ہندو دھرم اور عیسائیت کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ انہوں نے مناظروں میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مختلف شہروں کے علاوہ برما اور ملایا تک کا سفر کیا اور ہر جگہ کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ ان کے وسعتِ علم' حسنِ بیان اور حاضر جوابی کا ایک زمانہ معترف تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے انگریزی' ہندی' سندھی اور کچھ سنسکرت بھی سیکھ لی تھی۔ مولانا احمد سعید دہلوی (م ۱۹۵۹ء) کی خواہش پر "الجمعیتہ" دہلی میں بحیثیت مترجم اور نائب مدیر شمولیت اختیار کی۔ بعد میں صحافت ہی ان کا پیشہ بن کر رہ گیا۔ محمد عثمان فارقلیط ایک اصول پسند بے خوف صحافی کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے مدیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ انہوں نے "مدینہ" بجنور اور "فاران" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ "مدینہ" کے ایک کاتب منشی عبدالرحیم نقلِ مکانی کرکے ۱۹۳۶ء میں لاہور آگئے تھے۔ وہاں انہوں نے "زمزم" نکالا اور اس کی ادارت کے لئے فارقلیط صاحب کو آمادہ کرلیا۔ دو سال بعد انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۴۷ء میں دلی واپس چلے گئے۔ اسی سال دسمبر میں جمعیتہ العلماء ہند نے روزنامہ "الجمعیتہ" جاری کیا اور فارقلیط صاحب نے اس کی ادارت سنبھالی اس وقت جمعیتہ العلماء ہند کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ (۱۹۰۱ - ۱۹۶۲ء) تھے۔

برصغیر کے لئے یہ ایک نازک دور تھا۔ اس حساس وقت میں محمد عثمان فارقلیط نے تاریخی کردار ادا کیا۔ وہ ایک طرف مسلمانوں کو ثابت قدم رہنے اور دور اندیشی سے کام لینے کا مشورہ دے رہے تھے تو دوسری طرف صاحبانِ اقتدار پر بے خوفی اور جرات کے ساتھ کڑی تنقید کرتے رہے۔ اس میں قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گزرنا پڑا لیکن اپنی راہ سے دست کش نہ ہوئے۔ ربع صدی تک یہ خدمت جاری رکھی۔ اپنی مسلسل بیماری کی وجہ سے ۱۹۷۳ء میں مستعفی ہو گئے۔ جون ۱۹۷۶ء کے شروع میں فالج کا حملہ ہوا اور ۱۲ جون ۱۹۷۶ء کو فجر سے کچھ پہلے دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ جامع مسجد دلی میں نمازِ جنازہ ہوئی اور میت ان کے وطن پلکھوہ گئی۔ وہاں بھی نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور عصر کے قریب سپردِ خاک کئے گئے۔

''اُردو صحافت'' کے مصنف انور علی دہلوی نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے ''محمد عثمان فارقلیط اپنے وقت کے اہم ترین ایڈیٹروں میں شامل تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی نے صحافت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا، وہ اس کے پیرو رہے۔ ان کے آزاد قلم نے کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کیا۔ ان کے قلم کی جو جولانیاں آزادی سے قبل دیکھنے میں آتی تھیں، آزادی کے بعد بھی اسی طرح دیکھنے میں آئیں۔ وہ جس طرح برطانیہ کے ظلم و استبداد کے خلاف سینہ سپر رہے اسی طرح آزادی کے بعد بھی انہوں نے اپنی حکومت کی خرابیوں کو جرأت اور بیباکی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حق اور سچائی کا معیار کبھی نہیں بدلتا اور لینے اور دینے کے پیمانے کبھی دو نہیں ہوتے۔ مولانا کا قلم ہر قسم کی فرقہ پرستی کے لیے شمشیر برہنہ تھا۔ انہوں نے اپنے خونِ جگر کو اپنے قلم کی سیاہی بنا کر ایک مردہ قوم کو زندہ کرنے اور ایک پریشان حال طبقہ کو نئی زندگی دینے کیلئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔''

محمد عثمان فارقلیط کی کتاب ''از بلا'' بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کے رنگون سے انگریزی اور کلکتہ سے بنگالی ترجمے شائع ہوئے۔ ایک مختصر کتاب ''رہنمائے عقل'' ادارہ زمزم' لاہور نے شائع کی تھی۔ مرحوم کل ہند مدیران اردو کانفرنس کے اجلاس دوم منعقدہ لکھنؤ (۱۹۷۳ء) کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے جو خطبہ دیا بقول مالک رام ''وہ بھی خاصے کی چیز ہے''۔

ماخذ : تذکرہ معاصرین' جلد چہارم' ص ۶۹ تا ۷۳ اردو صحافت، ص ۱۳۲۔۱۳۳

حکیم محمد مقرب حسین خاں

حکیم محمد مقرب حسین خاں میرٹھ کے سربر آوردہ خاندان کے لائق و فائق فرد تھے۔ آپ کے والد ناصر الدولہ محمد اشفاق حسین خاں ایک قابل انسان تھے۔ سلطنتِ اودھ کے آخری دور میں ان کو خطاب سے نواز کر دربار گورنری میں سفیر بنا دیا گیا تھا۔ سلطنت لکھنؤ کی تباہی کے بعد آپ کو مہاراجہ ریاست چرکھاری نے اپنے یہاں دیوان حکومت بنا دیا تھا۔

حکیم محمد مقرب حسین خاں کو مروجہ علوم کی اعلیٰ تعلیم دی گئی تھی۔ آپ نے طبابت کے شعبہ کو پسند فرمایا اور اپنے وقت کے مشہور طبیب حکیم بلدیو سہائے میرٹھی سے فیضِ طبابت حاصل کیا۔ حکیم بلدیو سہائے میرٹھی بہادر شاہ ظفر کے وزیر حکیم احسن اللہ خاں کے شاگرد تھے جو فنِ طبابت میں شہرہ رکھتے تھے۔ موصوف اپنے شاگرد حکیم مقرب حسین خاں پر ناز کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے مطب کے جملہ امور حکیم مقرب حسین خاں کے سپرد کر دیے تھے۔ طب کے ساتھ ساتھ حکیم مقرب حسین خاں کو تعلیم کے شعبہ سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ میرٹھ کالج کے قیام کے بعد ۱۸۹۶ء سے ۱۹۱۰ء تک یعنی تازیست میرٹھ کالج کے بورڈ آف مینجمنٹ کے ممبر رہے اور چند سال منتظمہ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ ایک عرصے تک میونسپل بورڈ میرٹھ کے رکن کی حیثیت سے بھی شہر کے مسائل کے حل کے لئے جدوجہد کی۔

حکیم محمد مقرب حسین خاں اپنی نشست گاہ ہی میں مطب کرتے تھے۔ وہیں طب کے طلباء بھی زیرِ تعلیم رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا۔ سید حبیب الرحمٰن شاہ مؤلف حیاتِ بشیر نے لکھا ہے کہ آپ نے بوستانِ خیالی کی دو ضخیم جلدوں کا ایسی سلیس اردو میں ترجمہ کیا، جس سے ادب و محاورات پر آپ کی دسترس مسلمہ ثابت ہوتی ہے۔ آپ میرٹھ کی ادبی فضا پہ چھا گئے تھے۔ آپ نے میرٹھ سے اخبار عالم ۱۸۶۱ء اور پولس نیوز ۱۸۹۲ء میں جاری کیا۔ اخبار عالم سے منشی عبدالحکیم، وجاہت علی خاں اور پولس نیوز سے شیخ حبیب احمد وابستہ رہے۔ آپ کا مطبع بھی مشہور تھا۔ عوام و خواص میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ حکیم صاحب، آپ کے والد اور دیگر بزرگ افرادِ خاندان نے حضرت میاں راج شاہ قلندریؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔

حکیم محمد مقرب حسین خاں نے ۱۹۱۰ء میں انتقال فرمایا اور درگاہ حضرت شاہ گنج میرٹھیؒ کے جوار میں اپنے خاندانی احاطہ میں سپردِ خاک ہوئے۔

کچھ مسیحا تھے کے مردوں کو جلا کر چل دیے

نواب سر محمد یامین خاں

ممتاز قانون داں اور مشہور سیاسی رہنما نواب سر محمد یامین خاں سی۔ آئی۔ ای 'بیرسٹرایٹ لا' میرٹھ و مارہرہ کے معروف رئیس حاجی حافظ محمد سلیمان خاں کے فرزند تھے۔ آپ کی ولادت ۲۰ ستمبر ۱۸۸۶ء کو آبائی کوٹھی "جنت نشاں" میرٹھ میں ہوئی۔ یہ مشہور کوٹھی خان بہادر نواب احمد اللہ خاں رئیس اعظم میرٹھ کی ملکیت تھی۔ نواب احمد اللہ خاں اسی کوٹھی میں سکونت رکھتے تھے۔ وہ اپنے نواسے نواب محمد یامین خاں سے بڑی محبت کرتے تھے۔

نواب سر محمد یامین خاں نے قرآن 'اردو' فارسی اور عربی کی تعلیم میرٹھ میں حاصل کی' پھر انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ میرٹھ کالج اور علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۱۱ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کرکے اسی سال لنکنلس ان (LINCOLNS INN) میں بیرسٹری کے لئے داخل ہوئے۔ ۱۹۱۳ء کے وسط تک امتحانات مکمل کرلئے اور جون ۱۹۱۳ء میں بیرسٹر ہو گئے۔ لندن میں دوران قیام وہاں برطانوی پارلیمنٹ کے جلسوں کو جاکر دیکھتے رہے اور رائل ایشاٹک سوسائٹی کی ممبرشپ حاصل کی۔

نواب صاحب بچپن میں پتنگ بہت عمدگی سے اڑاتے تھے۔ گلی ڈنڈا' گیڑیاں' گلی وگلی' بچی پھرانا اور لٹو گھمانا شوق میں داخل تھے۔ کرکٹ کھیلتے تھے۔ انگریزی اسکول کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ آتش بازی بھی پسند تھی۔ بیڑیں اور لال بھی بہت پال رکھے تھے اور بقول آپ کے "میرے لال سب کے لالوں کو ہرا دیتے تھے" دوڑ میں بھی ہمیشہ آگے ہی نظر آتے تھے۔ میرٹھ کالج میں دوران تعلیم ہاکی اور ٹینس کھیلی۔ ۷-۱۹۰۶ء میں کالج کی ہاکی ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں بھی ہاکی اور کرکٹ کھیلی۔ لندن میں ٹینس پسندیدہ کھیل رہا اور جزیرہ ISLE OF WHITE میں منعقدہ ٹینس ٹورنامنٹ میں پہلا انعام حاصل کیا۔

بیرسٹر ہونے کے بعد لندن سے میرٹھ واپس آکر نواب یامین خاں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ یکم دسمبر ۱۹۱۳ء سے میرٹھ ہائیکورٹ میں وکالت شروع کی اور جلد ہی مشہور ہوگئے۔ اسی زمانے سے سیاسی وسماجی شعبوں میں بھی سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۱۶ء میں پہلی مرتبہ میونسپل الیکشن جداگانہ بنیاد پر ہوئے۔ ان انتخابات میں نواب صاحب نے حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ میونسپل بورڈ کی کئی کمیٹیوں کے چئیرمین منتخب ہوئے۔ اپنی بہتر کارکردگی کی وجہ سے ۱۹۲۱ء میں میرٹھ میونسپل بورڈ کے وائس چئیرمین چنے گئے۔ ۱۸ جون ۱۹۲۸ء کو نواب سیف اللہ خاں کے انتقال کے بعد نواب یامین خاں کو چئیرمین منتخب کیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں پھر متفقہ طور پر اسی عہدے کے لئے منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری مصروفیات کے پیش نظر چئیرمین شپ سے مستعفی ہو گئے اور پھر ۱۹۳۳ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت نے پہلے بورڈ کی رکنیت سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی۔

نواب سر محمد یامین خاں نے ہمیشہ مسلم مفاد کو پیشِ نظر رکھا۔ تحریکِ خلافت میں بھی حصہ لیا۔ ۱۹۲۰ء میں میرٹھ سے سینٹرل اسمبلی کے لیے بلا مقابلہ منتخب ہوئے اور کونسل آف اسٹیٹ کے انتخابات منعقدہ ۱۹۲۵ء میں واضح اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں آگرہ کمشنری سے اسمبلی کے رکن چنے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں ڈیموکریٹک پارٹی بعد ازاں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور زندگی کے آخری لحات تک یہ وابستگی برقرار رکھی۔ آپ مسلم لیگ کی مختلف کمیٹیوں کے سرگرم رکن رہے۔ جن میں ریڈیو' ریلوے اور درگاہ کمیٹی اجمیر شریف قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں "سر" کا خطاب ملا۔ اس موقع کثیر تعداد میں مبارک باد کے پیغامات موصول ہوئے۔ متعدد شعراء نے تاریخی قطعات کہے۔ باشندگانِ میرٹھ نے ٹاؤن ہال میرٹھ میں نواب صاحب کے اعزاز میں ایک یادگار عصرانہ دیا جس میں بیرونِ میرٹھ سے بھی عمائدین نے شرکت کی۔ میرٹھ کے ایک مشہور شاعر اظہار رامپوری نے اس تقریب میں قطعۂ تہنیت پیش کیا:

سرافرازی کی جا ہے "سر" ہوئے یامین خاں صاحب
بحمد اللہ کہ اس سہرے کے قابل بھی یہی سر ہے
ملے گا مرتبہ جس کو اسے کچھ فخر بھی ہو گا
مگر یہ ذات وہ ہے مرتبہ کو ناز جس پر ہے
خطاب آ کر ملا اسمِ گرامی سے تو بول اٹھا
میں قابل ہوں اسی گھر کے ' میرے قابل یہی گھر ہے
جسے کہتے ہیں عزت ایک لونڈی ہے وہ اسی گھر کی
جسے اقبال کہتے ہیں وہ اک ادنیٰ سا چکر ہے
جزاک اللہ اے اظہار کیا مدحت سرائی کی
ترے ہر شعر میں اک لذتِ قندِ مکرر ہے

نواب محمد یامین خاں نے مسلم کاز کے لیے ہر پلیٹ فارم سے کام کیا۔ ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے اور ڈپٹی پریسیڈنٹ رہے۔

نواب صاحب نے مسلم لیگ میں فعال کردار ادا کیا۔ اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرتے تھے۔ کئی مرتبہ قائداظم سے بھی اختلاف کیا۔ ۱۹۵۱ء میں عارضی طور پر پاکستان آئے اور پھر میرٹھ جا کر اپنی ریاست کو تقسیم کیا اور ۱۹۵۳ء میں پاکستان ہجرت کی۔

نواب صاحب کتب بینی سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے "گاڈ سول اینڈ یونیورس ان سائنس اینڈ اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ۱۹۵۴ء میں "کرائسٹ اینڈ میری ان دی قرآن" اور "اسلامی تعلیم" مکمل کیں۔ "اسلامی تعلیم" سات جلدوں میں ہے۔ "اورنگ زیب اور شیواجی" بھی آپ کی تصنیف ہے۔ نواب صاحب کی خودنوشت "نامۂ اعمال" آئینہ ادب' لاہور نے ۱۹۷۰ء میں

شائع کی ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے اور سولہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ "نامہ اعمال" کے مطالعے سے تحریک پاکستان کے بہت سے پہلوؤں سے آگاہی ہوتی ہے۔

نواب محمد یامین خاں کی شادی ام سلمہ بیگم سے ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی، جن سے چار بچے ہوئے مگر سب ایامِ طفولیت میں ہی انتقال کر گئے۔ محترمہ ام سلمہ بیگم آخری بچے کی پیدائش کے بعد میرٹھ میں ہی ۱۵ مارچ ۱۹۲۳ء کو نمونیہ ہو جانے سے انتقال کر گئیں۔

نواب سر محمد یامین خاں ایک با اثر شخصیت تھے۔ مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اظہار رائے کی آزادی کے قائل تھے۔ اپنا موقف دلائل کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ آپ کے تجزیے سیاسی شعور اور دور اندیشی کے عکاس ہیں۔ آپ نے خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی قوم کی خدمت کی۔

آپ ۲۷ مارچ ۱۹۶۶ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ آپ کی وفات پر ہر سطح پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور آپ کی قومی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ ناظم آباد کراچی میں آپ کے بھائی نواب محمد یامین خاں کی رہائش گاہ کا نام بھی "جنت نشاں" ہے۔ نواب یاسین خاں بھی انتقال کر چکے ہیں۔

نامہ اعمال، انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا

حضرت نجف علی شاہؒ

حضرت نجف علی شاہ میرٹھ میں ایک ممتاز بزرگ تھے۔ آپ حضرت مولانا نیاز احمد بریلوی کے خلیفہ اول تھے۔ شاہ صاحب کا وطن رام پور تھا۔

حضرت نجف علی شاہ کو بلا کسی واسطہ کے براہ راست حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے اجازت حاصل تھی۔ آپ کو سلسلہ غوثیہ میں حضرت شاہ دولہ گجراتی کے توسل سے باریابی حاصل ہوئی تھی۔ اس لئے موصوف نے ادباً شجرہ قادریہ میں اپنے اور حضرت غوث پاک کے درمیان حضرت شاہ دولہ کا نامِ نامی لانا باعث عزت خیال کیا۔

حضرت نجف علی شاہ بارہ سال حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کی خدمت میں رہے، پھر میرٹھ آ کر صدر بازار میں مقیم ہوئے۔ حضرت بریلوی کے انتقال کی خبر سن کر شیخ معین الدین رئیس میرٹھ کو اپنے ہمراہ لے کر بریلی تشریف لے گئے اور حضرت شاہ نیاز احمد کے بڑے فرزند مولانا نظام الدین جانشین وسجادہ نشین درگاہ نیازیہ سے شیخ صاحب کا تعارف کرایا۔

حضرت نجف علی شاہ نے شیخ معین الدین کے علاوہ منشی احسان اللہ مخبرؔ اور ان کے چھوٹے بھائی آفتاب الدین کو بیعت فرمایا۔ بعد میں شیخ معین الدین صاحب کو مجاز کیا۔

آپ کا انتقال ۱۵ محرم ۱۲۸۱ھ کو ہوا۔ شیخ معین الدین نے اپنی خرید کردہ آراضی جہاں حضرت شاہ صاحب مراقبہ میں رہا کرتے تھے وہیں حضرت کو مدفون کیا اور ایک عالی شان درگاہ اور مقبرہ محبوب الٰہی حضرت سلطان نظام الدین اولیاء کی درگاہ عالیہ کے نمونے کا تعمیر کرایا۔ شیخ معین الدین ہر سال بڑے تزک واہتمام کے ساتھ حضرت نجف علی شاہ کے عرس کا اہتمام کرتے تھے۔

حیاتِ بشیر

خان بہادر حاجی حافظ شیخ وحید الدین

آپ حافظ شیخ عبدالکریم صاحب کے دوسرے فرزند تھے۔ ۱۸۶۳ء میں اپنی جدی کوٹھی واقع لال کرتی میں پیدا ہوئے۔ شیخ وحید الدین صاحب نے اپنی خاندانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے نام پیدا کیا۔

شیخ وحید الدین صاحب کو عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم جید اساتذہ سے دلائی گئی تھی۔ طبیعت کا رجحان شروع ہی سے دین کی طرف مائل تھا۔ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ حضرت مولانا عبدالسمیع بیدلؒ سے آپ کو اکتساب علم و فیض حاصل ہوا۔ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے دوسرے خلیفہ حضرت مولانا شاہ محب الدینؒ جب اگست ۱۸۹۰ء میں میرٹھ تشریف لائے تو آپ نے ان سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ اوائل عمری میں کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ کلامِ ربانی کی تلاوت کرنا اور سننا آپ کے معمولات میں سے تھا۔

آپ نے ابتدا میں ضلع اسکول نزد قیصر گنج میرٹھ میں داخلہ لے کر انگریزی تعلیم حاصل کی اور اپنی انگریزی استعداد کو ٹیوٹر کے ذریعہ اس حد تک بڑھا لیا تھا کہ آپ انگریز افسران سے انہیں کی زبان میں روانی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد ریاست کے تمام معاملات آپ ہی کے سپرد ہوئے۔

خان بہادر موصوف کا محبوب مشغلہ زراعت تھا مگر تعلیمی اداروں سے گہری دلچسپی قائم رکھی۔ آپ کے والد محترم نے اپنے زمانہ حیات میں اس وقت کے آئین میں نامزد کرنے کے اختیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۹۰۴ء میں اپنی جگہ آپ کو میرٹھ کالج کے بورڈ آف مینجمنٹ کی ممبری کے لئے نامزد کر دیا تھا۔ آپ تاحیات مجلس منتظمہ کے رکن رہے۔ فیض عام انٹر کالج کے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۸ء تک منیجر رہے اور ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۹ء تک اس ادارے کی ایسوسی ایشن اور بورڈ آف ٹرسٹیز کے صدر کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیں۔ آپ نے میرٹھ کالج اور فیض عام انٹر کالج کی جس انہماک سے سرپرستی فرمائی ہے، وہ اب تاریخ کا حصہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ اسی طرح خان بہادر محمد اسلم سیفی کے والد اور معروف ادبی شخصیت مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی یاد میں قائم کردہ "اسمٰعیل نیشنل گرلز ڈگری کالج کی معاونت فرمائی اور آخر عمر تک اس کی مجلس منتظمہ کے رکن رہے۔ آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مجلس منتظمہ کے چند سال ممبر رہے اور یونیورسٹی کے میرس ہال کی تعمیرات میں مالی مدد فرمائی۔

زراعت سے خصوصی دلچسپی ہونے کی وجہ سے اس محکمہ سے متعلق تمام اہم اداروں سے وابستگی قائم رکھی۔ ایک عرصہ تک گرام سدھار کمیٹی کے چیئرمین رہے۔ آپ نے خود اپنا زراعتی فارم ہاپوڑ روڈ پر قائم کیا تھا۔ کھیلوں کی بھی اہمیت مانتے تھے۔ جم خانہ گراؤنڈ میرٹھ میں ۱۹۳۰ء میں "عبدالکریم کرکٹ پویلین" تعمیر کرایا۔ مقامی کوآپریٹیو سوسائٹی اور کوآپریٹیو بینک کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی اپنی

صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور ان اداروں کی خود سے وابستہ توقعات کو پورا کیا۔

شیخ وحید الدین صاحب کم سخن، مستقل مزاج، نیک و صالح اور با مروت انسان تھے۔ ہر شخص بلا امتیاز عزت کرتا تھا۔ مردم شناسی میں آپ کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ میرٹھ میں منعقد ہونے والی ہر تقریب میں شرکت فرماتے تھے۔ اپنی انہیں ذاتی خصوصیات کی بناء پر جو بھی آپ سے ملتا تھا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

خان بہادر موصوف نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ بعمر ۸۷ سال ۱۳ اگست ۱۹۶۸ء مطابق شوال المکرم ۱۸ ۱۳۸۸ھ سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ آپ کی تدفین قبرستان حضرت مخدوم شاہ ولایت صاحبؒ میں اپنے خاندانی احاطہ میں آپ کے برادر اصغر بھیا شیخ بشیر الدین مرحوم کے متصل ہوئی۔

آپ کی اولاد میں چار فرزند اور چار دختران تھیں۔ صاحبزادگان میں خان صاحب حاجی شیخ فرید الدین، خان صاحب حاجی شیخ رشید الدین، خان صاحب شیخ مجید الدین صابری اور خان صاحب حافظ شیخ رفیع الدین المتخلص بہ خادم تھے۔ ان سب بھائیوں نے بھی قومی و ملکی خدمات انجام دیں۔ یہ چاروں بھی انتقال کر چکے ہیں۔

ذخیرہ کتب: ۔ محمد احمد ترازی

کتابیات

۱۔اردو ادب کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر انور سدید	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	انور پرنٹرز و پبلشرز لاہور	۱۹۹۱ء
۲۔اردو صحافت	انور علی دہلوی	بک ٹاک، لاہور	رومی پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۱ء
۳۔اکابر علما دیو بند	حافظ محمد اکبر شاہ بخاری	ادارہ اسلامیات، لاہور	——	——
۴۔اک محشر خیال	افتخار احمد عدنی	پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور	نرالی دنیا پرنٹرز، لاہور	۱۹۸۷ء
۵۔المشاہیر	حکیم فیض احمد مارہروی	——	——	۱۹۹۸ء
۶۔انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا	سید قاسم محمود	شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی	رحمت سنز پرنٹرز، کراچی	۱۹۹۸ء
۷۔بابائے اردو مولوی عبدالحق: حیات اور علمی خدمات	شہاب الدین ثاقب	انجمن ترقی اردو، کراچی	انجمن پریس، کراچی	۱۹۸۵ء
۸۔بنیادی حقوق	محمد صلاح الدین	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	وفاق پرنٹنگ پریس لاہور	۱۹۷۸ء
۹۔بیس مردان حق	عبدالرشید ارشد	مکتبہ رشیدیہ، لاہور	زاہد بشیر پرنٹرز لاہور	۱۹۹۶ء
۱۰۔پروفیسر محمد حسن عسکری: ایک جائزہ	پروفیسر ایس۔ جی۔ عباس	غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی	گیلانی پرنٹرز کراچی	۲۰۰۰ء
۱۱۔تاریخ دارالعلوم دیو بند، جلد دوم	سید محبوب رضوی	دارالعلوم دیو بند	جید پریس، دہلی	۱۹۷۸ء
۱۲۔تاریخِ رفتگاں، حصہ دوم	صابر براری	ادارہ فکر نو، کراچی	نیو مجاز پریس، کراچی	۱۹۹۸ء
۱۳۔تذکرۃ الخلیل	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	مشہور آفسٹ پریس کراچی	پائنیر آرٹس لمیٹڈ کراچی	۱۹۷۱ء
۱۴۔تذکرہ اکابر اہلسنت	محمد عبدالحکیم شرف قادری	بشیر برادرز پبلشرز، لاہور	معظم پرنٹرز، لاہور	۱۹۷۶ء

۱۵۔ تذکرہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری	خلیل احمد رانا	ادارہ معارف نعمانیہ، لاہور	ـــــــ	۱۹۹۳ء
۱۶۔ تذکرہ شاعراتِ اردو	محمد جمیل احمد	قومی کتب خانہ، بریلی	بریلی الیکٹرک پریس بریلی	۱۹۳۳ء
۱۷۔ تذکرہ معاصرین، جلد چہارم	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	لبرٹی آرٹ پریس نئی دہلی	۱۹۹۴ء
۱۸۔ تصوراتِ گلرنگ	خورشید خاور امروہوی	بزم تزئین ادب، کراچی	ـــــــ	۱۹۹۷ء
۱۹۔ چراغ اور کنول	اختر حمید خاں	کتابیات، لاہور	مطبع عالیہ، لاہور	۱۹۶۷ء
۲۰۔ چراغوں کا دھواں	انتظار حسین	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۹ء
۲۱۔ چند ہم عصر طبع سوم	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	ناظر پریس، کراچی	۱۹۵۰ء
۲۲۔ حجازِ مقدس کے اردو شاعر	امداد صابری	مکتبہ شاہراہ دہلی	یوسف پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۷۰ء
۲۳۔ حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی	ڈاکٹر راحت ابرار	ـــــــ	بھارت آفسٹ پریس دہلی	۱۹۹۹ء
۲۴۔ حیاتِ اعلیٰ حضرت، جلد اول	مولانا ظفر الدین بہاری	بشیر برادرز پبلشرز، لاہور	معظم پرنٹرز، لاہور	۱۹۷۶ء
۲۵۔ حیات المبشیر	ڈاکٹر مجیب اشرف	اسلامیہ ایجوکیشنل سوسائٹی، ماناوہ	لبرٹی آرٹ پریس دہلی	۱۹۹۷ء
۲۶۔ حیاتِ بشیر	سید حبیب الرحمٰن شاہ	بھیا بشیر الدین میموریل سوسائٹی، میرٹھ	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۷۵ء
۲۷۔ خاندان زبیری کنبوی	مولوی حسین احمد زبیری	ـــــــ	مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ	۱۹۵۰ء
۲۸۔ خسرو کا ذہنی سفر	ظ۔ انصاری	انجمن ترقی اردو نئی دہلی	سمرآفسٹ پرنٹرز نئی دہلی	۱۹۷۸ء

۲۹۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ	ڈاکٹر گوہر نوشاہی	نقوش، لاہور	نقوش پریس، لاہور	۱۹۹۳ء
۳۰۔ سر سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی	خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی	——	——
۳۱۔ سفر امریکہ کی ڈائری، دوسرا ایڈیشن	اختر حمید خاں	سٹی پریس بک شاپ، کراچی	سٹی پریس، کراچی	۲۰۰۰ء
۳۲۔ سیرت بدر عالم	حافظ محمد اکبر شاہ بخاری	ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی کراچی	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۸۵ء
۳۳۔ طرزِ دلبری	خواجہ محمد نواز بٹ حسنی اشرفی	——	ثانی پروسیس، کراچی	۱۹۹۷ء
۳۴۔ غالب شناسی کے کرشمے	افتخار احمد عدنی	پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور	ایچ۔ وائی۔ پرنٹرز لاہور	۱۹۹۵ء
۳۵۔ کانٹوں کی زباں	ظ۔ انصاری	بزم غالب، کامٹی	شکتی پرنٹنگ پریس کمہان	۱۹۷۷ء
۳۶۔ کومیلا سے اورنگی تک	اختر حمید خاں	سٹی پریس بک شاپ، کراچی	فضلی سنز، کراچی	۱۹۹۸ء
۳۷۔ گنگا جمنی میدان، دوسرا ایڈیشن	اختر حامد خاں	سٹی پریس بک شاپ، کراچی	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۹۹ء
۳۸۔ مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	اردو کتاب گھر، دہلی	کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۵۳ء
۳۹۔ مشاہیر علماء دیوبند، جلد اول	حافظ قاری فیوض الرحمٰن	مکتبہ عزیزیہ، لاہور	العالمین پریس، لاہور	۱۹۷۶ء
۴۰۔ مشاہیر مشرق	نظامی بدایونی	تخلیقات، لاہور	اجالا پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۹ء
۴۱۔ مشرق	سلیم احمد	اردو مرکز لندن	فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی	۱۹۸۹ء
۴۲۔ مقالات محمد حسن عسکری	تدوین: شیما مجید	علم و عرفان پبلشرز، لاہور	رحمانیہ پرنٹرز، لاہور	۲۰۰۱ء

۴۳۔ میراشرمانس	کرشن چندر شرما	کرشنا دیوی شیتل پرشادیمن ٹرسٹ میرٹھ	پربھات پریس میرٹھ	
۴۴۔ نامہ اعمال	نواب محمد یامین خاں	آئینہ ادب، لاہور	اشرف پریس، لاہور	۱۹۷۰ء
۴۵۔ نئے خاکے	اختر حامد خاں	سٹی پریس بک شاپ، کراچی	ایجوکیشنل پریس، کراچی	۱۹۹۹ء
۴۶۔ نقوشِ رفتگاں	مفتی محمد تقی عثمانی	ادارۃ المعارف، کراچی	احمد پرنٹنگ کارپوریشن، کراچی	۱۹۹۸ء
۴۷۔ یادِ رفتگاں	ماہر القادری	البدر پبلی کیشنز، لاہور	میٹرو پرنٹرز، لاہور	۱۹۸۴ء
۴۸۔ یادِ رفتگاں	صابر براری	ادارۂ فکرِ نو، کراچی	ایجوکیشنل پریس، کراچی	۱۹۸۶ء
۴۹۔ یادِ رفتگاں، جلد دوم	صابر براری	ادارۂ فکرِ نو، کراچی	نیو مجاز پریس، کراچی	۱۹۹۸ء
۵۰۔ یادگارِ سلف، چوتھا ایڈیشن	محمد عبید اللہ خاں	سردار فاطمہ خانم، بلند شہر	لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی	۱۹۹۹ء

رسائل و اخبارات

۱۔ البلاغ، کراچی: صفر ۱۳۹۷ھ

۲۔ آجکل، دہلی: ۱۵ دسمبر ۱۹۴۵ء

۳۔ بنیات، کراچی: جمادی الثانیہ ۱۳۹۲ھ

۴۔ ترجمان اہلسنت، کراچی، اگست ستمبر ۱۹۷۲ء

۵۔ جسارت، کراچی: ۲۵ جون ۱۹۷۴ء

۶۔ جنگ، کراچی: ۱۵ جون ۱۹۷۴ء

۷۔ دی منارٹ، کراچی: نومبر ۱۹۶۴ء

۸۔ دی منارٹ، کراچی: جولائی ۱۹۷۴ء

۹۔ شبابِ اردو: مارچ ۱۹۲۲ء

۱۰۔ ضیائے حرم، بھیرہ: نومبر ۱۹۷۱ء

۱۱۔ فاران، کراچی: دسمبر ۱۹۶۵ء

۱۲۔ فکر و نظر، علی گڑھ، نامورانِ علی گڑھ، حصہ اوّل

۱۳۔ فکر و نظر، علی گڑھ، نامورانِ علی گڑھ، حصہ دوم

۱۴۔ فکر و نظر، علی گڑھ، جلد ۲۳: اگست ستمبر ۱۹۷۲ء

۱۵۔ فن اور شخصیت، کوائف نمبر

۱۶۔ مجلّہ عثمانیہ: اپریل تا جون ۱۹۹۶ء

۱۷۔ معارف، اعظم گڑھ: ستمبر ۱۹۶۷ء

۱۸۔ مکالمہ، کراچی: نومبر ۱۹۹۹ء

بَہر زماں بَہر زباں

چند آراء سے مختصر اقتباسات

اس تذکرے کو مرتب کرنے میں نور احمد میرٹھی نے سینکڑوں ماخذ کو کھنگالا اور سینکڑوں افراد سے خط و کتابت کر کے غیر مسلم نعت گو شعراء کے مستند حالاتِ زندگی جمع کیے اور حوالوں کے ساتھ انہیں اس تذکرے کی زینت بنایا۔ غیر مسلم نعت گو شعراء کے تعلق سے ایسا تذکرہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ اس تذکرے کی ترتیب میں ایک سلیقہ ہے اور بیان میں اظہار کی ایسی صفائی ہے جس سے پڑھنے والا لطف اندوز ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

مجھے یقین ہے کہ نور احمد میرٹھی کی یہ محنتِ شاقہ جو اوّل سے آخر تک محسنِ انسانیت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت اور محبت سے سرشار نظر آتی ہے علمی، ادبی، سماجی اور مذہبی دنیا میں قبولیتِ عام کا مرتبہ حاصل کرے گی اور مختلف قوموں کے افراد کے درمیان دوستی، قربت اور مروت کی فضا پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جموں

آپ نے موضوع کا حق ہی ادا نہیں کیا بلکہ کام کرنے والوں کے لئے ایک مثال قائم کر دی کہ کام کس طرح کرنا چاہئے۔ آپ نے جس محنت اور تلاش و تحقیق سے مختلف معروف و غیر معروف، نادر و کمیاب ماخذ و مصادر سے استفادہ کر کے اولاً شعراء کا اور پھر ان کے حالات و کلام کا سراغ لگایا ہے، اس کی صحیح داد وہی دے سکتے ہیں جنہیں اس قسم کے کاموں کا تجربہ ہے۔ آپ نے فرصت کے محدود اوقات میں جس اعلیٰ معیار کا علمی کام انجام دیا ہے، اس پر حیرت ہوتی ہے۔ شعراء کے حالات میں جامعیت کے ساتھ اختصار کو اس طرح ملحوظ رکھا ہے کہ کوئی ضروری بات لکھنے سے رہ نہیں گئی۔

مشفق خواجہ

"بَہر زماں بَہر زباں صلی اللہ علیہ وسلم" موجیں مارتی ہوئی پہنچی اور ذوقِ نعت گوئی کو سیراب کر گئی۔

کالی داس گپتا رضا، ممبئی

غیر مسلم نعت گو شعراء کا عالمی تذکرہ ایک بڑا وسیع و عریض موضوع ہے۔ اس کتاب کے سرسری مطالعہ سے ہی آپ کی بے پناہ محنت، جستجو اور ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے، جس کی داد نہ دینا بڑی ستم ظریفی ہوگی۔ اتنا مبسوط اور مفصل تحقیقی تذکرہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی۔ کرناٹک

نور احمد میرٹھی کی گرانقدر تالیف "بہر زماں بہر زباں صلی اللہ علیہ وسلم" غیر مسلم شعرا کا جو تذکرہ ہے وہ موصوف کی علمی اور ادبی تحقیق کا قیمتی سرمایہ ہے۔ مولف کے قلم سے مقدمے کے طور پر غیر مسلموں کی نعتیہ شاعری کی تاریخ اور اس کا تجزیہ ہے جو نہایت وقیع اور مفید تحقیقی کام ہے۔ اس میں موضوع کے کئی گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور معلومات کا ایک خزانہ جمع کیا گیا ہے۔ یہ وقیع تحقیقی کام کے علاوہ ایک اہم تخلیقی کارنامہ بھی ہے۔ یہ بات کسی اہلِ قلم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جو کام محترم و مکرم جناب نور احمد میرٹھی نے انجام دیا ہے اس کے لئے نعت سے شغف اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دلی وابستگی کے علاوہ وسعت مطالعہ، گہری علمی قابلیت، خداداد ذہانت و ذکاوت، عزم و استقلال، صبر و تحمل بھی درکار ہیں۔ بحمد اللہ موصوف ان تمام صعوبتوں اور مشکل مراحل سے کامیاب گزر گئے۔ ان کا یہ تحقیقی کارنامہ ان کی اعلیٰ علمی قابلیت، بلند تحقیقی مزاج، دینی تڑپ، نعت سے گہری دلچسپی، درک و بصیرت اور اولوالعزمی کا ثبوت ہے جو معنوی اور صوری حسن و جمال سے آراستہ و پیراستہ ہو کر منظر عام پر آیا ہے جسے دیکھ کر ایمان میں تازگی پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق ناگپور

ڈاکٹریٹ مقالات اور تذکروں میں چند غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کا ادبی و فنی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے لیکن عربی، فارسی، اردو، ہندی، سندھی، مراٹھی، پنجابی، انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی وغیرہ تیرہ زبانوں کے ۳۳۰ ہندو، سکھ، عیسائی اور حضور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے غیر مسلم شعرا و شاعرات کا جو مفصل تذکرہ جناب نور احمد میرٹھی نے "بہر زماں بہر زباں" میں پیش فرمایا ہے وہ غیر مسلم شعرا کی نعت نگاری پر اب تک کئے گئے کاموں کا صرف احاطہ ہی نہیں ہے بلکہ ان میں ایک بہت بڑا اور گرانقدر اضافہ ہے۔ ایسا مبسوط اور وقیع تذکرہ پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔ جناب نور احمد میرٹھی نے تنِ تنہا وہ اہم اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لئے ایک ادارے کی ضرورت تھی۔

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی بریلی

"بہر زماں بہر زباں صلی اللہ علیہ وسلم" زبردست تلاش، کوششوں، کاوشوں اور محنتوں کا ثمرہ ہے۔ کتاب کے آخر میں اشخاص، مقامات اور کتب کا اشاریہ بھی سائنٹفک انداز سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سے محققین اور ضرورت مندوں کے لئے راہ آسان ہو گئی ہے۔ نور احمد میرٹھی کے مقدمہ میں نعت گوئی کی مختصر تاریخ کے علاوہ غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی سے دلچسپی کی وجوہات اور اس کی تسلسل سے تاریخ بھی بیان کی گئی ہے نیز اس سلسلے میں اب تک جو کتابیں منصہ شہود پر آئی ہیں ان پر بھی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے اس موضوع پر بہت سے پوشیدہ گوشے اجاگر ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر شرف الدین ساحل ناگپور

کتاب کیا ہے؟؟!!!! نام میں جدت، گٹ اپ عمدہ، محنت کڑی، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں کہی گئی نعتوں کا احاطہ جو نہایت دشوار گزار اور محنت طلب کام ہے۔ کم و بیش ساڑھے تین سو غیر مسلم شعراء کا نعتیہ کلام اس ایک کتاب میں جمع ہو گیا ہے، جس پر معیاری یونیورسٹی سے بآسانی پی ایچ ڈی کی ڈگری مل سکتی تھی۔ لیکن آپ نے یہ نہایت وقیع کام صلہ کی تمنا کے بغیر کیا ہے۔

ڈاکٹر یحییٰ نشیط، کالگاؤں

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک حیرت آفریں اعجاز ہے، جس کا ظہور آپ سے ہوا۔ اس اعجاز نے ایک خلاء کو، ایک ضرورت کو پر اور مکمل کیا ہے۔ اس موضوع پر اس کامل و جامع تذکرہ کے بعد کسی اور کتاب کے مطالعہ کی ضرورت

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی، ملتان

نہیں ہے۔

آپ نے بہت بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ خدمت بھی ایک نہیں دو۔ شعراء کا تذکرہ بھی، ان کے نعتیہ منتخب کلام کا مجموعہ بھی۔ متذکرہ علمی و ادبی خدمت اور انتخابِ کلام تسکینِ ذوق کا سامان۔ شعراء کے تراجم میں مصادر و مراجع کے حوالوں نے اس کی تحقیقی اہمیت میں اضافہ کیا اور انتخابِ کلام میں آپ کے تنقیدی شعور نے اسے ادب کا شاہکار بنا دیا۔ آپ کے حسنِ ذوق کی کارفرمائی ترجمہ و انتخاب، دونوں میں بے مثل و لاجواب ہے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری

فاضل مرتب جناب نور احمد میرٹھی سے کوئی بیس پچیس سال پرانی شناسائی اور ان کی علمی کاوشوں سے آگہی کا شرف مجھ ناچیز کو بھی حاصل ہے۔ وہ خود نہایت عمدہ ادیب ہیں۔ لب و لہجہ میں انفرادیت ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ سخن شناس اور دنیائے علم و ادب خصوصاً قومی زبان اردو کی تحریک کے نہایت جاں نثار اور بے لوث کارکن بھی ہیں۔ ہم میں سے کسی کے لئے ان کی آواز ان کی شخصیت نئی نہیں، ہم ان کے آہنگِ نو اور طرزِ فکر سے بخوبی مانوس ہیں۔ یہ قیاس البتہ نہ تھا کہ ان کے نوشتۂ تقدیر میں یہ خاص نوعیت کا علمی تاریخی کارنامہ بھی شامل ہے جسے اہلِ سخن دیکھیں

اقبال احمد صدیقی

گے اور انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔

ہے۔ جانفشانی سے یہ کتاب ترتیب دی جو یقیناً تاریخ ساز

حیرت اور تعجب ہے کہ کس طرح آپ نے اتنی جانفشانی سے یہ کتاب ترتیب دی جو یقیناً تاریخ ساز ہے۔ کی نوعیت ہے۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ بغیر اس کے ذکرِ خیر کے نامکمل، نعتیہ ادب کی تاریخ کا اہم سنگِ میل، غیر مسلم نعت گو شعراء کا عالمی پیمانے پر اتنا وسیع جائزہ، ایک نادر توضیح و تاریخی دستاویز ہے۔ کن الفاظ میں اس گرانقدر

ڈاکٹر سید محمد طلحہ، رضوی برق، بہار

تالیف اور مؤلف کی تعریف کروں۔

نورِ سخن

چند آراء سے مختصر اقتباسات

''نورِ سخن'' نظر سے گذری۔ نور احمد میرٹھی کے تجربے ندرت اور کام کی لگن نے بڑا متاثر کیا۔

سید محمد تقی

''نورِ سخن'' نعتیہ ادب میں ایک یادگار اضافہ بھی ہے اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے معاون و مشعلِ راہ بھی!

انجم فوقی

''نورِ سخن'' کی اشاعت سے اس موضوع پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالرز کے لئے بڑی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد

''نورِ سخن'' صرف ادبی لحاظ سے قابلِ قدر نہیں' اس کی تاریخی حیثیت بھی بڑی اہمیت وافادیت کی حامل ہے۔

شاعر لکھنوی

نور احمد میرٹھی نے ایک منفرد دستاویز فراہم کرکے ادب پر بھی احسان کیا ہے۔ ان کی یہ کوشش قیمتی بھی ہے اور متبرک بھی۔

مظفر وارثی

نور احمد میرٹھی بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ چیدہ چیدہ عطر کشیدہ کے مصداق ان کی شبانہ روز کی عرق ریزی انہماک' کاوش' یک سوئی اور دل جمعی کا ثمر ''نورِ سخن'' کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ یہ ان کے تخیل کی فسوں کاری بھی ہے اور صورت گری کا انعام بھی۔

ڈاکٹر نظر کامرانی

''نورِ سخن'' یقیناً ادب کا ایک سرمایہ ہے بلکہ ایک شاہکار اور نور احمد صاحب کی ادب کے میدان میں ایک اور گرانقدر خدمت۔

ریٹائرڈ ایڈمرل (ا) ایم۔ آئی۔ ارشد

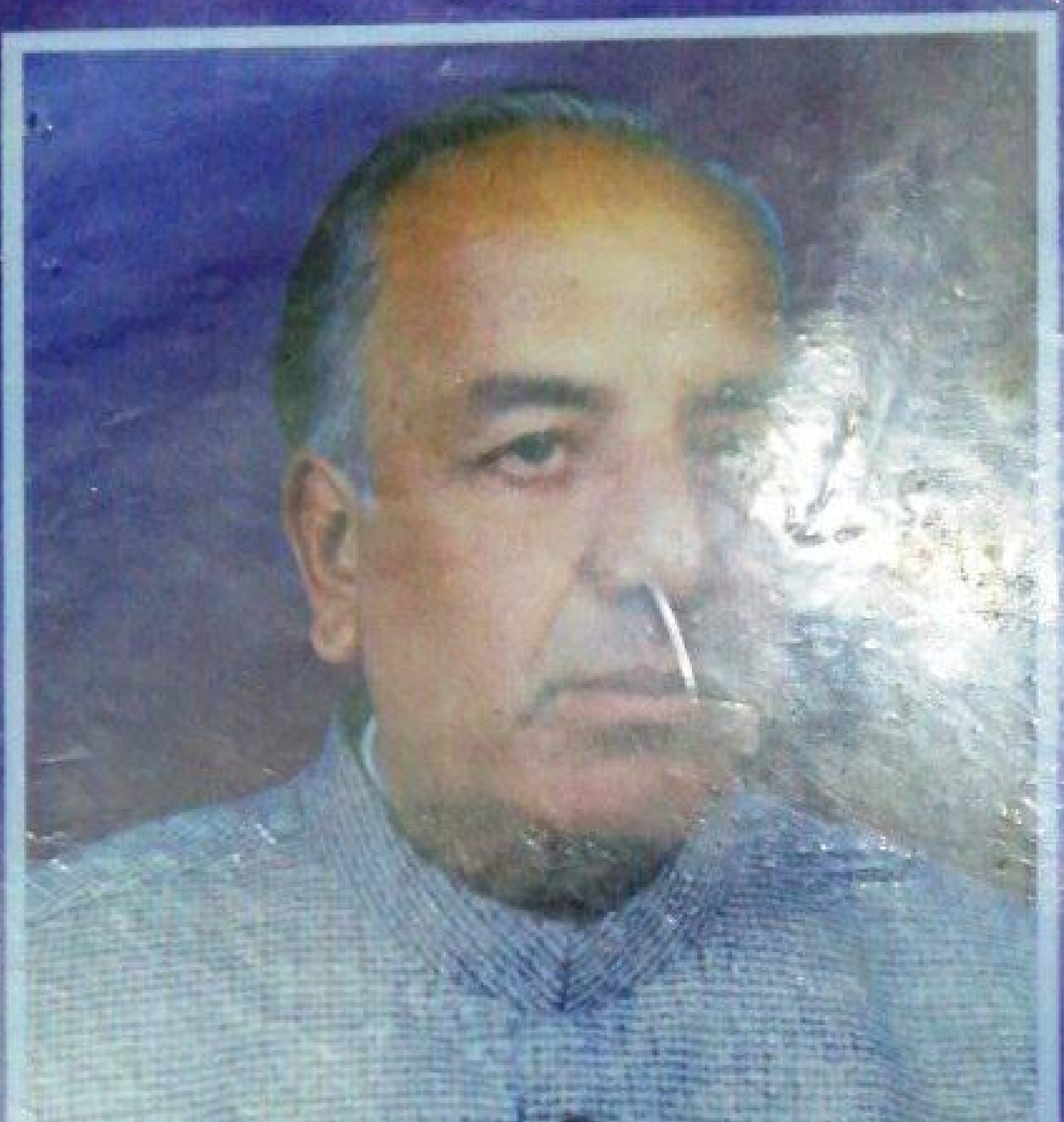
کتاب نہ صرف معنوی اعتبار سے نہایت عمدہ ہے بلکہ صوری اعتبار سے بھی حد درجہ حسین ودلکش۔

پروفیسر نظیر صدیقی

''نورِ سخن'' دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ نور احمد میرٹھی نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں ہندو اور سکھ شعراء کو حاضر ہونے کا موقع دیکر عالمِ انسانیت پر ایک احسان کیا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مشاہیرِ میرٹھ



نور احمد میرٹھی

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی